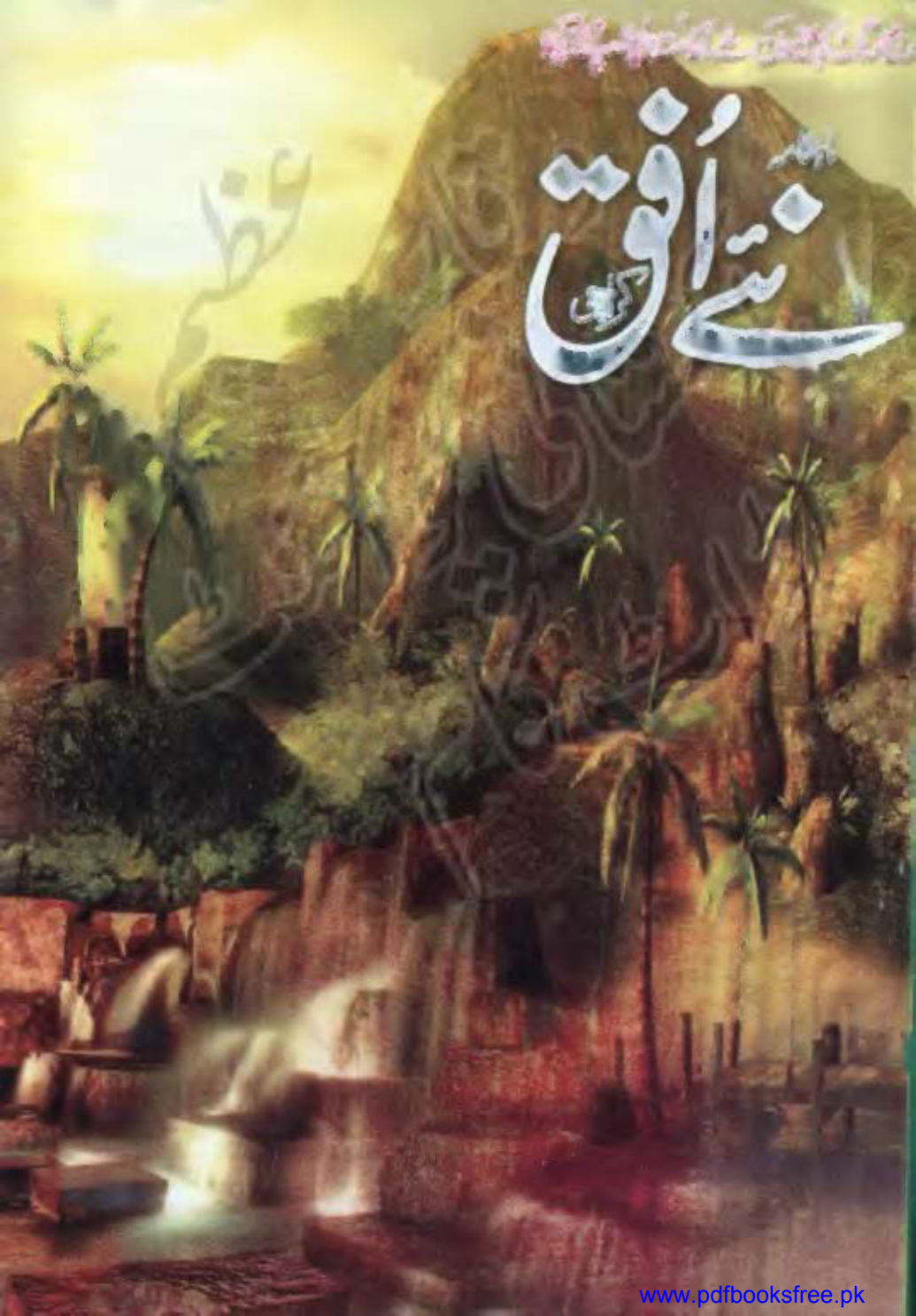


سنی افق



56	نیم عمر	قربانی کا بکرا
64	راحیلہ تاج	جوابی حملہ
68	اسرار احمد	چوٹ
22	ناول	بلاوا
224	خورشید بیگم زادہ	شہر آزار
72	ناز سلوٹوش	گروش
132	مستقل سلسلے	گڑگا کلبجاری
214	شہناز بانو	روحانی مسائل
217	اسعد حمید	خوشبو بخن
221	حافظ شیر احمد	ذوق آگہی
	عمر اسرار	
	عقلم احمد	

خلافت کا تاجدار حضرت اہل بیت علیہم السلام 874 کلاری 74200 فون نمبر 021-35620771/2
 ٹیکس 091-35620773 کیا وہ مطبوعات ختم ہو گئی ہیں؟ سبیل info@zeenachal.com.pk

8	استدانیہ	دستک
10	مشتاق احمد قریشی	گفتگو
20	عمران احمد	اقرا
108	طاہر قریشی	انتقام قدرت
114	اسحی کشانیان	انسانی فرض
125	خلیل جبار	خالی ہاتھ
176	صداقت حسین ساجد	گرہا
197	غیاث الدین	بدلہ
204	غلامی غزل	انجام
186	انجم فاروق ساحلی	ہمت نسواں
	ریاض بٹ	
	مغرب سے انتخاب	
	طاہر قریشی	

پبلشر مشتاق احمد مستدینی پرنٹر جمیل سن مطبوعات حسن پرنٹر گلبرگ بس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
 دفتر نمبر 76 مندرجہ نمبر و عسائندہ ہون روڈ کراچی

پاکستان شاید پہلا ملک ہے دنیا کے نقشے پر جو بڑی ویدہ دلیری سے خود اپنی ہی اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ عدلیہ کے احکامات کو نہیں مانتا۔ بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ یہاں تو آدے کا آدھا ہی نرالا ہے ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ حکمرانوں کے ہر چھوٹے بڑے نے ملے کر لیا ہے کہ کس مانی کرنی ہے اور خوب دل کھول کر کرنی ہے کر لے جو جس کا جی چاہے۔ پاکستان کی لڑکائیوں میں تو سب ہی باون گز کے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ عدلیہ کے احکامات کو تسلیم کیا جاتا اور ان پر عمل کیا جاتا۔ دنیا بھر کی جرائم کی تاریخ میں شاید ہی کوئی مجرم ہوگا جس نے اپنے خلاف کیے گئے فیصلے کو درست مانا ہو۔ ہر سزا یافتہ مجرم عدلیہ کو ہی مجرم قرار دیتا ہے کہ اس نے یعنی عدالت نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ عدالت چاہے چھوٹی ہو یا بڑی یا سب سے بڑی عدالت عدالت ہی ہوتی ہے۔ عدالت کی کرسی پر بیٹھنے والا قانون کی مضبوط ڈور سے بندھا ہوتا ہے۔ ثبوت شہادتیں اور بہت سے عوامل مل کر کسی بھی جج کو انصاف کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہاں ہمارے ملک میں ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں عدلیہ بھی کرپشن کا شکار ہے لیکن عدلیہ چاہے کیس کی بھی ہو بالکل ماور پدرا زاد نہیں ہوتی۔ ثبوت و شواہد سے بندھی ہوتی ہے اور کوئی عدالت حرف آخر نہیں ہوتی۔ کئے بعد دیگرے سزا یافتہ شخص یا مجرم رجوع کو کھلتا ہے یعنی اپیل کر سکتا ہے۔ ایسا کیس نہیں ہوتا کہ حکمران وقت پر اگر کہیں سے کوئی اچلی آٹھ اور ویدہ دلیری سے یہ کہے کہ کر لے جس نے جو کرتا ہے ہم عدلیہ کا حکم نہیں مانتے اگر غور کیا جائے تو خود وزیراعظم کا یہ رویہ تو بین عدالت کے ذمے میں آتا ہے شاید پہلے جس جرم کی انہیں سزا دی گئی جو اپنی انہوں نے سبے چوں چرا بھگت بھی لی وہ اتنا شدید عدالت کی تو بین کا جرم نہ ہو جتنا کہ اب وہ اور ان کے حواری بات کر رہے ہیں۔ انہوں نے اور ان کے حواریوں نے بالکل اسی طرح کی رٹ لگا رکھی ہے جیسے بھارت مسئلہ کشمیر کے بارے میں ”میں نہ مانوں“ کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ حکمران تو ایک رول ماڈل ہوتے ہیں اسے عوام کے لیے اپنے لو جو ان سیاسی کارکنوں کے لیے مستقبل کے معماروں کے لیے کیونکہ کسی بھی حکمران کا ہر عمل اس ملک کا اور کئی بھی تاریخ عالم کا حصہ بن جاتا ہے۔ فتوائی اور جیہا اقصائی کی بات اور ہے اور ملک و قوم کے رہنماؤں کی بات کچھ اور ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وطن عزیز صاحب اقتدار اور حزب اختلاف دونوں اطراف کے سیاست دان اور سیاسی جماعتیں صرف اقتدار کا کھیل کھیلتا جاتی ہیں۔ انہیں ملک و قوم کے مفادات سے کوئی غرض نہیں آج کا سیاست دان ذاتی مفاد کی سیاست کرنے والا ہے۔ اسے عوام اور عوامی مفادات سے کوئی غرض نہیں رہی۔ ہر کوئی اپنی باری لگانے سے آگے کے بارے میں سوچتا ہی نہیں یا سوچنا چاہتا ہی نہیں ہے۔

آخرا یہاں کون سا دایا خوف ہے کہ جس نے تمام سیاست دانوں کو حق سچ سے دور کر دیا ہے۔ اب نہ تو کسی سیاست دان کو وطن عزیز میں مہنگائی نظر آ رہی ہے نہ غربت نہ بڑھتی ہوئی امن و امان کی خراب سے خراب تر ہوئی صورت حال نظر آ رہی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حکمران بڑی جی داری سے جو چاہ رہے ہیں وہ گزر رہے ہیں۔

انہیں خوب معلوم ہے کہ ان کا رستہ روکنے والا کوئی ہے ہی نہیں سب زبانی جمع خرچ کر کے بک بک کر کے چپ ہو جانے والے اور اپنے خلاف جوابی کارروائیوں سے ڈر جانے والے لوگ ہیں۔ سیاست کے حمام میں اگر دیکھا جائے تو سب ہی برہنہ ہیں۔ سب ہی ایک تھال کے چنے سے نظر آتے ہیں۔ کوئی دودھ کا دھلا نہیں ہے اگر کوئی سیاست دان کسی کی پٹری اچھا لے تو اسے جواب میں اپنی پٹری اچھا لے جانے کا خوف ہی لگا رہتا ہے جیسا کہ ابھی حالیہ دنوں میں ہو رہا ہے۔ اگر نواز شریف اور شہباز شریف نے عدلیہ کے فیصلے کو حکمرانوں خصوصاً وزیراعظم کے تسلیم نہ کرنے پر اپنے جس رول کا زبانی کلامی اظہار کیا ہے اس کا جواب حکومت کی طرف سے ان پر مہران بینک اسکینڈل میں ملوث ہونے اور ثبوت فراہم کرنے کی خبر سے دیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا تا کہ عوام کی توجہ اصل مسئلے یعنی عدالت عظمیٰ کی حکم عدلی سے ہٹا دی جائے اور عوام جو پہلے ہی اپنے روزمرہ کے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں چند دن بعد از خود اصل بات کو بھول جائیں گے یا کوئی بڑا حادثہ یا واقعہ اس عدلیہ کی حکم عدلی پر مٹی ڈالنے کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ جیسا کہ کراچی میں عدالت کے فیصلے کے ساتھ ہی لیاری میں آپریشن شروع کر دیا گیا تاکہ کراچی جو خود ایک شہر نہیں بلکہ ملک کی حیثیت رکھتا ہے جو اپنی آبادی کے لحاظ سے مٹی پاکستان سمجھا جاتا ہے یہاں کے عوام کے ہی ابتدائی رد عمل کے جواب میں سارے ملک میں احتجاج یا کوئی سیاسی قہم جوئی ہوتی رہی ہے۔ اب حکمرانوں نے کراچی کا یہ امتیاز اور خصوصیت بھی ختم کر دی۔ کراچی کے عوام اور سیاست دانوں کو اب امن و امان کے مسائل سے دوچار رکھا جانے لگا ہے ہر روز کہیں نہ کہیں دس بیس کا قتل ہو جانا معمول بننا جا رہا ہے۔ لوگ خوف کا شکار ہو رہے ہیں مہنگائی کے طوفان کے ساتھ بجلی کی لوڈ شیڈنگ نے لوگوں کو حواس باختہ کر رکھا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حکمران کراچی کی سیاسی جماعتوں کو دواہمیت نہیں دے رہے جس کا وہ تقاضہ کرتی ہیں۔

وزیراعظم نے شاید یہ سمجھ لیا ہے کہ میری بقاء میری عزت میرا مفاد اسی میں ہے کہ میں اپنی کرسی سے جڑا رہوں نہیں ایسا نہ ہو کہ وزارت عظمیٰ جانے تو جائے عزت سعادت بھی جاتی رہے کیونکہ وہ اپنے ایک ہم جماعت وزیر بابر اعوان کا حشر دیکھ اور سمجھ رہے ہیں کہ کھل تک جو منہ چڑھا وزیر شخصیت تھا آج کس قدر ذلت و رسوائی کا شکار ہے۔ اسے میر جعفر و میر صادق سے تشبیہ دی جا رہی ہے۔ وہ شاید یہ بھی سمجھ رہے ہیں کہ جب تک کرسی نشین رہیں گے وہ محفوظ رہیں گے ورنہ وہ بھی ان کے صاحبزادگان کے خلاف بھی فوجداری مقدمات کا ایک لمبی قطار تیار کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ بچوں کا کہہ سارا آنکھوں پر پر تالہ وہیں گرے گا۔ عدلیہ کا احترام اپنی جگہ اس کا حکم نہ ماننا اپنی جگہ وزیراعظم صاحب نے سمجھ لیا ہے کہ جس طرح ایک سزا بھگت چکے ہیں ایسے ہی اور جرائم اور قانون عدلیہ کے خلاف درزی پر بھی دیکھا جائے گا زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا کچھ اور سزا دے دی جائے گی۔ صدر صاحب کا مزاج تو نہیں بگڑے گا۔ اللہ ہماری ہمارے وطن عزیز کی حفاظت فرمائے۔ ہمیں ایمان اور غیرت ایمانی سے سرفراز فرمائے۔ آمین



گفتگو

عمران احمد

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص بھی فرض نماز کا وقت آنے کے بعد اس کے لیے اپنی سرگرمیوں سے مشغول رہے وہ گناہگار ہے۔" (ترمذی)۔
 (کتابوں کی کتابی کاپی کا) یہ سارا امر جاری رہتا ہے۔

عزیزانِ مصترم سلامت بادشہ

سالِ ہجری کا دوسرا جبکہ سالِ عیسوی کا پہلا شمار و حاضر خدمت ہے۔ ایک قاری نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ یہ سال ہمیں کچھ دے کر نہیں گیا۔ بلکہ بہت کچھ لے کر جا رہا ہے۔ یعنی ہم نے کھو یا اپنی کھو یا ہے یا کچھ نہیں۔ یہ جملہ ہمیں تیر کی طرح لگے یوں لگتا ہے جیسے ہم اللہ کے ناشکرے ہو گئے ہیں۔ قومِ موسیٰ علیہ السلام کی طرح جن پر اللہ تعالیٰ نے من و سلویٰ اتارا پھر بھی وہ شکر گزار نہیں بنے۔ ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے پانچ رو یا سارے موسم ایک آزاؤ خط و دنیا کی زر فیض وادیاں معدنیات کی دولت عطا کی۔ اس کے باوجود مایوسی کی باتیں درست نہیں۔ یہ ہماری نااہلی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے فیضِ یاب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہماری تینیں صیہون کی طرح صاف نہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا وہ مومن نہیں جس کے ہاتھوں اس کا بڑی محفوظ نہیں۔ آج ہم خود اپنے پڑوسیوں سے رنگِ نسل زبان کی بنیاد پر نہ صرف نفرت کرتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور شکوہ کرتے ہیں کہ گزرتا ہوا سال ہم سے بہت کچھ چھین کر لے گیا۔ یاد رہیں حال کی بنیادیں ہم نے اپنی ہی خود کو گھٹی تھیں مستقبل بھی اپنی ہی بنیادوں پر استوار ہوگا۔ قرآن حکیم نے ہمیں ایک ضابطہ حیات دیا ہے مگر ہم حقوقِ انسانی اور حقوقِ نسواں کے نام پر اس ضابطہ حیات کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ نفرت بے راہ روی کا بیج پور کرنا اور خوشیوں کی فصل نہیں کاٹ سکتے۔ حکمرانوں سیاستدانوں کو برا بھلا کہنے سے قتل اپنا جائزہ نہیں ہم ہی نے تو ختب کیا تھا قرآن میں کیا خوب کہا گیا ہے جیسے عوام ہوں گے ان پر ان ہی جیسے حکمران مسلط کیے جائیں گے۔ یعنی جیسی درجہ ویسے فرشتے۔ اپنی اردو اچ کو بہتر کریں۔ اپنے نفس کی اصلاح کر سن اللہ تعالیٰ نور جسم و کریم ہے۔

شہناز بانو کراچی

محترم عمران بھائی السلام علیکم ورحمۃ اللہ تمام قارئین کے لیے بے غاہ دعاؤں کے بعد سب کی خیریت کی طلب گار ہوں۔ اللہ کرے آپ سب خیریت ہوں۔ میں بھی بفضلِ تعالیٰ کیمونبر کوچ کی ادائیگی کے بعد اپنے گھر واپس آ گئی ہوں۔ اللہ پاک سے انتخاب ہے کہ وہ میرا وہاں جانا تمام ارکانِ حج کی ادائیگی میری دعا میں اور میری توجہ قبول فرمائے اور میں اب ایک ایسی مومن عورت کی طرح زندگی گزاراں جیسا کہ اس کا حکم ہے اور اسے پسند ہے۔ میں بہت خوشی خوشی حرمِ شریف جانے کی تیاری میں مصروف بھی چھ اکتوبر کو حج پانچ بجے کی نماز تکھی کہ اللہ پاک نے مجھے میری زندگی کے ایک بہت بڑے سانچے سے دو چار کر دیا۔ میری والدہ محترمہ جو قرآن کی معلم تھیں 4 اکتوبر کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں۔ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں میں رات ہی ان سے الوداعی ملاقات کر کے آئی تھی۔ اسی سے حج پر جانے سے پہلے معافی بھی مانگی تھی اور امی نے مجھے سینے سے لگا کر ڈھیر ساری دعا میں دیں اور کہا کہ تو میری قابلِ فخر بیٹی ہے مگر گول چیز کھانسی تو کھانسی دیتی کہ میرا دل تجھ سے کتنا خوش ہے اور گلے دل وہ مسلسل کر کے ظلم کی نماز کے لیے کھڑی ہوئی تھیں اور بس پانچ منٹ نہیں لگے انہیں دنیا سے جانے میں۔ آؤ..... "میں اتنی شفیق ماں کو اب کہاں دیکھوں گی؟ اپنی پریشانیوں اور اپنی خوشیاں کس سے شیئر کروں گی کون ہے اب ایسا جو راتوں کو اٹھ اٹھ کر میری خوشیوں کے لیے دعا میں کرے گا۔ ماں ایسی ہستی ہے

جس کا اللہ تعالیٰ نے کوئی نعم البدل پیدا ہی نہیں کیا۔ ای کی وصیت پر میں نے ہی انہیں غسل دیا اور انہیں تیار کیا۔ دل و دماغ کی حالت بیان سے باہر ہے بعد نمازِ جہان کی توفیق ہوئی اور میں ہفتہ کی صبح پانچ بجے حرمِ شریف کے لیے روانہ ہو گئی یہ میری خوشی نصیبی تھی کہ اللہ نے مجھے اپنے گھر پر بلالیا اور ان کے لیے مجھ سے وہاں دعا کرائی۔ یہاں ان کی سوگ کی فاقہ تھی اور وہاں میں نے ان کے لیے عمرہ کر کے دعا کی۔ اللہ کے گھر جا کر مجھے بہت ڈھارس ملی۔ یہ وہ گھر ہے جو مجھے کم نہیں ہوگا۔ میں اپنی قادری بہنوں طاہرہ جمیلہ زہرا سیدہ اور نازش کی بہت شکر گزار ہوں جو انہیں نے اس کی کھڑی میں فون کر کے میرا دلکھ بٹایا۔ البتہ عمران بھائی سے ایک شکایت ہے کہ انہوں نے گفتگو کے کالم میں میری امی کے لیے ایک لائن بھی تعزیت کے لیے نہیں لکھی۔ کم از کم میں اتنا توفیق رکھتی تھی۔ ہمارا بارہ سال پرانا ساتھ ہے خیر انہوں نے مجھے اس قاتل بھی نہیں سمجھا ان کی مرضی۔ میرے ان تمام ساتھیوں کا بہت شکر یہ جنہوں نے مجھے حج کی مبارک یاد دی۔ جاوید صدیقی بھائی آپ یقیناً جانیں میں نے اپنے تمام قارئین کے لیے عرفات کے میدان میں دعائیں کی ہیں۔ خصوصاً جن کے نام لیے ان میں آپ عبداللہ شاہد ریاض بٹ اور دوسرے شامل ہیں۔ تمام لڑکیوں کے لیے بھی دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ان کے والدین کو ان کی مرضی سے سبکدوش کرے۔ عابدہ انعام نازش امین شاہین طاہرہ اور سحرانہ عمران بھائی اور ان کے والدین اور بیٹی کے لیے بھی دعا میں کیں۔ اس لیے کہ آپ سب مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں آپ سب سے اللہ پاک قبول فرمائیں۔ لوگوں کی نازش ہم نے تو تمہارا نام چھپایا تھا تم نے خود ہی بھانڈا پھونک دیا۔ کبھی اس میر پورڈے والی شرط بنانا اور پھر میری ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ جیسا کہ مدعاوارہ لگتا ہے عبداللہ شاہد نازش ہو گئے ہیں میں نے تو بالکل ٹھیک بات کی تھی۔ جو حق اور سچ تھی۔ کسی کی حمایت اور طرف داری نہیں کی تھی۔ ناراض ست ہو تمہاری بجائے تمہارے لیے ڈھیر ساری دعا میں کی ہیں اور جاوید بھائی آپ بھی ناراضی دور کریں اور عبداللہ شاہد کی جانب محبت اور خلوص بھرا دوستی کا ہاتھ بڑھادیں۔ اچھے دوستوں میں لڑائی جھگڑا اچھا نہیں لگتا۔ عبداللہ کا دل دکھا ہوا ہے۔ بہت بہت پیاری ضرورت ہے۔ یہ بچہ سیدہ خوش ہو گا تو کہ شامِ زہد سے..... تمہاری آواز بہت پیاری ہے لہذا تم خود بھی بہت پیاری ہو گی۔ مجاہد نازع علی بیجان کہ بہت دکھ ہوا کہ تم نے اپنی امی کو کھیا بھی نہیں۔ اللہ کی عین رضا تھی۔ اب تم اپنی ساس کو اپنی ماں سمجھنا اور ان کی عزت اور خدمت کرنا۔ گردش پسند کرنے کا شکر یہ۔ نئے افق کا مطالعہ شروع کیا ہے اس لیے بندے کے لیے محذرت۔ باقی باتیں آئندہ فی امان اللہ۔

جہو شہناز آپ کا شکوہ سچا ہے اس کے لیے ہم شرمندہ ہیں کہ ہم سے کوتاہی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو کروت کروت جنت نصیب فرمائے سب کریم آپ کا حج بھی قبول فرمائے اور جو بندے آپ خانہ کعبہ اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کر کے آئی ہیں انہیں پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

انجم خازوق ساطی لاہور

آداب امید ہے آپ اور ادارے کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ دسمبر کے سننے افق کا مکمل کئی خوشنما منظر سے بھر پور تھا۔ اقبال جرمِ شائع کرنے کا شکریہ۔ انتخاب کی اشاعت کا جلد پتا نہیں چل سکا تھا۔ کراچی کا پتہ شہر داس وقت واقعی اہولہاں ہے۔ ادارتی گفتگو میں موجودہ حالات کا اچھا جائزہ قلمبند کیا گیا ہے۔ بدستک میں بڑے فریض صاحب ہر بار لوگوں کا ضمیر جھجھوڑتے ہیں لیکن بے حس کے دھڑ پر دے چھائے ہوئے ہیں۔ لڑنا تبول جاوید احمد صدیقی صاحب (بادوق قاری) کا خط جامع اور بھرپور تھا۔ انتخاب کی طرف توجہ دلانے کا شکریہ۔ مجھ بخش صابر راگہ صاحب کی بزرگانہ شان سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو فقیر سمجھتے ہیں جبکہ ہم انہیں بادشاہ سمجھتے ہیں۔ وہ اخلاقی کی بادشاہت پر متمکن ہیں۔ ریاض بٹ صاحب بھی ہمارے بڑے پیارے قاری و ادبی راہنما ہیں۔ باقی شہناز بانو صابہ کوچ کی سعادت مبارک ہو۔ عمران صاحب بھی ان فضاؤں میں سانس لے چکے ہیں۔ ترجمہ کہاں بیان تبول ہی پر بحسب اور دلچسپ تھیں۔ باوا اور گردش اچھی چل رہی ہیں۔ میں دیوانہ دیوانہ خوشی اچھی تحریریں ہیں۔ مگر اپنی کا اختتام مگر اکتوبر اور ہفتی آؤ۔ وہاں لگنا کا پجاری زیر مطالعہ ہے۔

محمد اسلم جاوید فصل آباد

بڑی آرزو تھی ملاقات کی ہمیشہ مسکراتے ہوو چناب مشتاق احمد

قریشی صاحب اسلام ٹیکم آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں ضروری کام کے سلسلے میں شہر جانے کا اتفاق ہوا اور ایک اسٹال پر ماہنامہ نئے افق ماہ دسمبر 2012ء سال کے آخری پرچے سے ملاقات ہوگئی۔ جس کے لیے ہمیں بڑے چین کرنا پڑتے ہیں۔ سرورق پہلے سے زیادہ خوب صورت تھا جس کی ہفتی تحریک کی جانے کم ہے۔ ماہ دسمبر کا پرچہ پہلے کی نسبت بہتر تھا۔ ایک معیاری جلد ہے آپ جس خلوص اور محبت سے یاد کرتے ہیں اس کے لیے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔ یہ سال بھی آہستہ آہستہ ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا لیکن کریں جاتے ہوئے سال میں پایا کچھ نہیں خوبیا بہت کچھ ہے۔ ہر طرف اداس چہرے جن پر خوشیوں کی کوئی کرن روشنی نہ تھی۔ شدید معاشی بحران تھا کس کس بات کا رونا روئیں غریبوں کی زندگی ویسے بھی عذاب ہوئی ہے کوئی تماشائی زندگی میں پوری نہیں ہوتی۔ ہر طرف خواہشوں کا طوفان ہوتا ہے۔ زینت کا خزانہ کس کو جاکے سنا نہیں گئے جب تک آپ کو خط تحریر نہ کروں سکون نہیں ملتا۔ اس مہنگائی کے دور میں ایسا پرچہ نکالنا آپ کی کام ہے جو زندگی گزر رہی اس کا رونا کیسا مستقبل پر نظر ہونی چاہیے۔ مصروفیات میں سے وقت نکال کر یہ خیریں عبارت لکھ رہا ہوں۔ ہر ماہ کے آخر میں سنہ الفی کا ہمیں بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ تمام عنوان اپنی اپنی جگہ پر بہتر ہیں مثلاً اقرا وحید، گفتگو نا قابل فراموش واقعات، مترجم کہانیاں سلسلہ وار کہانیاں بزم سخن خوش بوخن ذوق آگئی روحانی مسائل وغیرہ اس دفعہ جن کہانوں سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں وہ وحشی، گردش برساتا، اقبال جرم گراہی ہیں۔ ان قلم کاروں کو میری طرف سے آداب عرض کہنا۔ شاعری بھی اپنی جگہ اچھی تھی۔ غزل شائع کرنے کا بے حد شکر ہے۔ گزرتے سال نے ہمیں وہ داغ دیے ہیں کہ ہم آپ کو دکھ نہیں سکتے جو دوست احباب مجھے شکوہ میں یاد رکھتے ہیں ان کا میں بے حد ممنون ہوں۔ مجاہد ناز عیسیٰ یاد کرنے کا بہت بہت شکر ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ نیا سال ہم سب کی اسگوں کا ترجمان ہو۔ خیر میں کوئی خالی ہوا ہو قدرت خواہ ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اجازت دیں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ نیک تمناؤں کے ساتھ۔ والسلام

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی۔۔۔۔۔ راہلینڈ دسمبر کے شمارے کا نائل بہت خوب تھا۔ ہر اچھا زندگی سے بھر پور نازل کا احساس ہوتا ہے۔ شکر ہے ماڈل عورتوں کے اخلاق بانٹ پوزوں سے جان چھوٹی۔ فہرست سے احساس برتری محسوس ہوا۔ دستک زبردست تھی اور اثر آؤ جان تھا۔ گفتگو میں جہد کی فضیلت پر بہترین حدیث دی گئی اور آپ کا مقصد حالات پر انتہائی زبردست تھا۔ خطوط میں: رسالوں ذمے کا کہانیوں داستانوں سے بھر پور تبصرہ اچھا شکر ہے کہ شہر آزاد مل کی اب پڑھنے کو مل گئی ہے تو پھر ہم بھی تنقید و تحریف کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ یہ زمانہ سعیدہ آپ کے خیالات سے سو فی صد متفق ہوں۔ اللہ کرے حالات سدھ جائیں۔ فقیر محمد صابر صاحب کا باریک بینی سے تبصرہ کیا خوب۔ ریاض بٹ خوب آئے اور ہمیں پڑھنے کو خوب چیز ملی۔ بٹ صاحب براہ کرم عمران جی سے میرا فون نمبر لے لیں۔ میں جناب ہر طرح حاضر ہوں۔ تبصرہ زبردست تھا۔ عمران جی نے تجوی کی حد کو ہی صرف چھ عدد تبصرے بانی چھ سات کہانیاں گئے۔ بہت سے مہربان اور ہمارے پیارے تبصرہ نگار کیوں رہ گئے۔ تبصرے ملے نہیں یا بٹ بھیجے گئے تھے؟ بدقسمتی کہانیوں میں صابر حسین کی پڑتال انتہائی اچھی تھی کہانی رہی۔ مدتوں کے بعد ایسی انٹ اچھوڑنے والی اسٹوری پڑی ہے۔ یعنی بدقسمتی کہانیوں میں بانی دو بھی بہتر نہیں۔ سچ کہانیوں میں گردش اور سنہرے جال ڈگر سے جٹ کر اور زبردست ثابت ہوئیں۔ نوشاد عادل کی اگلا تھو ہمارا سو فیصد تجسس لے بیٹھی۔ اتنی خوب صورت کہانیاں اور آخری اختتام انتہائی ڈگر سے بٹ کر تھا اور وکیل صاحب لے اڑے سب کچھ۔ "یعنی" ہو چوڑا اسی طرح میں دیوانہ اقبال جرم بھی شاندار ہیں۔ فاروق ساحلی شکر سے تنقید لکھتے ہیں ہر نقطہ وضاحت کے ساتھ تھا۔ ریاض بٹ جی کی میں تحریف کروں زبردست۔ وحشی ہمارے اپنے مہربان کی کبھی کہانی ہے صرف یہ تبصرہ ہے کہ حسب معمول کہانی کو خوب طویل دیا تھا۔ لطیف بلوچ کی بانی کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ لکھنے سے پہلے تمام ہوا تقریباً بھرتی کا تھا۔ واقعہ واقعی دلزدہ نہایت اگلی تھا۔ گراہی کچھ خاص پسند نہ کی لیکن تاریخی لحاظ سے اچھی تھی خان صاحب اور بھی کہانیاں اچھی لکھی ہیں۔ ذوق آگئی زبردست تحریروں سے بھر پور خوش بوخن میں بہترین انتخاب جناب عمر اسرار کا تھا۔ بہت

بہترین جناب۔ ذرا سی مصروفیت زیادہ تھی بہت تفصیل سے دیکھ کر گھر لکھتا رہوں گا۔ عمران جی میری تنقید براے تنقید نہیں بلکہ برائے اصلاح ہے اور اسلوب بیان کا مجھے سے اچھا بنانے کے لیے سب احباب محاسن کو سلام و آداب۔

عبدالحمید ساجد۔۔۔۔۔ منجی آباد قابل احترام عمران بھائی بزرگوار مشتاق احمد قریشی صاحب سلام باشد۔ آج کل کے حالات کے مطابق سب خیریت ہو چھنا ایک لازم امر بن گیا ہے۔ تو امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے اور پرے کی ترقی و کامیابی کے لیے دن دگنی رات چکی محنت کر رہے ہوں گے۔ سرورق کی تحریف اب لفظوں میں نہیں کی جاسکتی۔ کیا بدلاؤ آیا ہے۔ جیسے جیسے موسم تبدیل ہو رہا ہے ویسے ویسے حیرت انگیز اور دل کو بھانے والے آپ انتہائی جاذب نگاہ ثابت لگا رہے ہیں۔ اب کیا بتاؤں اس دنیا کے کھیلوں میں اتنے گھرے کے جیسے دستہ ہی بھٹک گئے ہیں۔ فرصت کے لیے بھی فرصت ڈالنا کاشف ہو گیا ہے۔ لیکن ہم نے پرچے کے مطالعہ کو بھی پس پشت نہیں ڈالا۔ الگ بات ہے کہ غیر حاضر رہے۔ اتنے دنوں بعد حاضر خدمت ہیں تو انتہائی خوش محسوس ہو رہی ہے۔ اکثر زندگی کے چند ترخروں نے خوشی بھی نہیں کھ کھری ہے۔ خوشی بھی کیسے ہو ہمارا کشن کراچی آج شعلوں میں جل رہا ہے۔ سرورق نے درائے خون اور بھی ہوئی ہے لیکن پھر بھی ہمارے جانے مانے رہتا رہا ہے۔ جلوہ میں جذباتی تقریروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر پا رہے ہیں۔ غلامانہ تحریروں کو انہیں سونے دو چاند کی چٹین نظر آتی ہیں تو وہ پھر کیوں اتار بیٹھیں انہیں۔ جن سے شاید وہ خود ہی الگ ہو نہیں چاہتے۔ شاید میں کچھ زیادہ کہہ گیا ہوں۔ نہیں مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا مجھے اس کا حق نہیں ہے۔ اس سے پہلے مجھے جو کچھ خود کو پیرا ہونہ ہوگا۔ آخر میں دوسروں کو تشدد کا نشانہ کیوں بناؤں۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو سامنے رکھ کر بات کروں۔ خدا مجھے صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین عطا فرمائے آمین۔ گفتگو جو ایک کشن سے تم نہیں ہمارے لیے جس میں بسنے والے ہر ایک گل کو میرا محبت بھر اسلام جن کی خوش بو ہر ماہ نئے افق کے ذریعے مجھے تک پہنچتی ہے۔ اس دفعہ گفتگو میں صدارت سنبھالے ہوئے ہیں۔ ایک نہایت ہی ہمدرد جذبوں سے سرشار کشمیری لڑکی جس کے دل میں ہر ایک کے لیے الگ مقام ہے۔ تمام لوگوں کے خطا انتہائی رح و شیریں تھے۔ ان لوگوں کو سلام جو شامل محفل نہ تھے۔ عبدالملک کیف شہد فہر اور مجاہد ناز بھائی جنہوں نے مجھے ہر جگہ یاد رکھا۔ آپ کی نظمیں بھی اچھی تھیں۔ اس دفعہ نبی ارشاد اور بھانہ سعیدہ کی نظمیں اچھی تھیں۔ اب کچھ الفاظ کہانیوں کی نظر ہو جائیں۔ آبی شہناز تو نوج پر چلی گئیں لیکن آپ کی گروش نے ہمارا ساتھ پورا اور داد ہے۔ اللہ آپ کو اس فریضے سے کامیابی سے سبکدوش فرمائے آمین۔ اس کے بعد جناب عزیزان کن اسے حمید کی "گنگا کا پجاری" بہت پسند آئی۔ کیا اسلوب نگارش ہے ان کا تو جواب نہیں۔ انتہائی مستثنیٰ خیز جس کا ہر ماہ انتظار رہتا ہے۔ "وحشی" میں جب انسان ایک دوسرے کے روپ میں آتا ہے تو ہمدردی کے جذبے خود ہی نسبت دباؤ کر دیتا ہے اور زندگی کی تمام حدیں پار کر جاتا ہے لیکن یہ آخر تک تک ہوگا؟ اقبال جرم ویرا آید وحشی اور بلاوا اچھی تحریریں ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد میرے شہر آرزو واول یعنی جن آباد اور ہمارے کوئی گستاخی ہوگئی جو اس طرح غائب ہوخدا کے لیے واپس آ جاؤ۔ سردار شاد امیر حزرہ چاند اچھی کیف اللہ دے عاید تو یہ اعلیٰ حضرت علی حاضر اللہ کے بند کہانیاں ہو۔ میں تو آگیا آپ بھی آ جاؤ۔ میری طرف سے تمام بزرگوار اچھا نیاں و بہنوں کو نئے سال کی مبارک۔

عصمت اقبال عین۔۔۔۔۔ منگیا قیم سلام کے بعد عرض ہے آپ بالکل خیریت سے ہوں گے۔ اس مرتبہ سال تاخیر سے ملا لیکن جب اس کا کفر نائل دیکھا تو جی خوش ہو گیا۔ دستک میں مختصر مشتاق احمد قریشی صاحب نے قدر دلی و سائل کے سلسلے میں ہمارے تحریکوں کی بدعتی اور بے حسی کی نشان دہی کی ہے۔ ایسے ملکی حالات جان کر دل پریشان ہوتا ہے آئے دن ہم دھماکے قتل و غارت اور نارگت ٹھنگ پون لگتا ہے کہ پاکستانی خاص طور پر کراچی کے لوگوں کے سروں پر منڈلا رہی ہے اور سیاست دان ہیں کہ ان تمام باتوں سے بے نیاز اقتدار کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں۔ نا جانے ہم لوگوں کو ہمارے گناہوں کی سزا کب تک ملے گی۔ اب تو صبر و برداشت کی ہمت بھی جواب دے چکی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ ہم پر کفر فرمائے اور ہمیں شکر سے کوئی ایسا انقلابی خود اور نصرت منڈلا دے گا آئے جو بیرونی طاقتوں سے ڈرنے

کی بجائے اپنے اندر خوف خدا اور قوم کا درد رکھتا ہو۔ اس مرتبہ سچی کہانیاں ساری اچھی تھیں لیکن اقبال جرمِ ذرا پر یاد و خوشی زیادہ پسند آئیں۔ گردشِ گداز کا پجاری و چپکسی سے پڑھتے ہوئے جب اچانک باقی آئندہ لکھا جاتا ہے کہ بالکل اچھا نہیں لگتا لیکن جبر کا گھونٹ چنا پڑتا ہے۔ شہناز باجی سلام اور ج کی مبارک بار قبول ہو۔ ذوق آگیا میں عفاں احمد صاحب نے اچھی طرح بیرون کا انتخاب کیا۔ خوش یونین میں عمر اسرار صاحب بھی عمدہ غزلوں کا گلدستہ لے کر آئے۔ سبھی غزلیں اور نظمیں اچھی تھیں لیکن شمر علی آغا مسیح جہاں قدردانا و ہم اختر اور واجد گیلوی کی غزلیں خوب تھیں لیکن بہترین غزل مجرم ریاض حسین قمر کی تھی جو موجودہ حالات پر لکھی گئی۔ نظمیں میں سید عبداللہ شاہزادہ و مجاہد ناز عباسی کی نظمیں پسند آئیں۔ مجاہد صاحب آپ نے لکھا کہ مجھے رسالے کے لیے نام لگانا چاہیے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا مصروفیت تو سچی کوہنی ہے۔ بے شک میں دیگر رسالوں میں بھی لکھتی ہوں لیکن میں نے ہمیشہ اولیت سے اتفاق کوئی دی ہے اس لیے کہ عمران بھائی نے جس طرح میری حوصلہ افزائی کی میری شاعری اور غلطی کو رسالے میں جگہ دی وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی اور نئی رسالے سے اپنا تعلق بھی ختم کر سکتی ہوں کیونکہ میری پہچان سے اتفاق سے ہوئی اور میری وجاہت کہ ہمارا پیرا رسالہ ایک طرح جگہ گار ہے۔ عمران بھائی جس تک مصروفیت کی بات ہے تو کوئی اتنی خاص بھی نہیں ہوتی یاں ضرور ہے میرے اندر وہ جنون ہمارے ہوئے ہیں ایک شاعری اور دوسرا مصوری زیادہ ناہم ان میں صرف ہونا چاہتا ہے اور پھر گھر کی ذمہ داریاں ہیں۔ بہر حال ان تمام باتوں کے باوجود کوشش کرتی رہوں گی کہ حاضری دیتی رہوں۔ روحانی علاج کا سلسلہ بہت سے لوگوں کے روحانی مسائل حل کر رہا ہے۔ جو اچھی اور سیکل والی بات ہے۔ اس مرتبہ گفتگو میں کم لوگوں نے شرکت کی۔ باقی اصحاب کی توقع یہ تھی کہ روٹین ہے لیکن عبداللہ شاہ بھائی آپ کو کیا ہوا؟ آپ کیوں غیر حاضر تھے۔ گفتگو کی محفل میں تمام لکھنے والوں کو میری طرف سے سلام اور شکر یہ جو میری شاعری پسند کرتے ہیں اور تحریف کرتے ہیں۔ اللہ حافظ

مجاہد ناز عباسی..... سنجر پور۔ محترم و مشتاق احمد قریشی صاحب اسلام علیکم! سدا خوش رہو پوچھوں گی طرح ہمیشہ مسکراتے رہو۔ اس بار شاعر نام پر مل گیا تھا۔ بالکل بہت شاندار تھا اور مزے کی بات ہے کہ ہمیشہ جو منظر میں رات کو خواہوں میں دکھتا ہوں وہی منظر آج نئے اشق کی زینت بن گیا ہے۔ بس ایک کی ہے اگر کئی سچے ادوی کے کنارے پر میری اور میری رانی کی تصویر ہوتی تو چہرہ داد۔ دستک میں شائق احمد قریشی صاحب نے بجا کہا ہے کہ ہم اس کی امداد کے بغیر کیسے جیتیں لیکن یہ بھی ہمارے اور ہماری قوم کے فضلے سے کیا فرق پڑے گا جب تک ہمارے مقرران یہ فیصلہ کریں گے جب تک ہمارے لیے اس فیصلے کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ گفتگو میں صدارتی کرسی سیدنا سلسلوش دشنے صاحب کے پاس تھی۔ نازش۔ جی کیسے مزاج ہیں آپ کے؟ بہت دکھ ہوا آپ کے کزن کے بارے میں سن کر کیا اتنے ظالم لوگ بھی ہیں۔ پھر جب آپ کا تبصرہ تجوذا مزید آگے بڑھا تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کی شادی ہونے والی ہے بہت بہت مبارک ہو۔ نائب صدر درد بخانہ سعیدہ تھیں ان کا تبصرہ بھی شاندار تھا۔ میری دعا ہے کہ دربخانہ سعیدہ ہمیشہ اسی طرح محفل کی زینت بنتی رہے۔ ریاض جی آپ کی شاعری بھی بہت اچھی ہوتی ہے۔ فقیر محمد بخش صابر لڑکا سدا خوش رہیں۔ لیکن مقبول جاوید صدیقی صاحب کا تبصرہ بھی بہت اچھا تھا۔ سر کا حال ہیں اور ہاں بھائی میں واقعی لٹنے گیا تھا (ہاہا)۔ سنی ارشد زین شاہزادہ محمد اسلم جاوید ریاض ہشت محمد فہد چوٹی عبدالملک کیف عبدالکیم ساجد سید عبداللہ شاہزادہ طاہرہ جی تارا عالیہ انعام الہی عصمت اقبال میں اور جن کے نام نہیں لکھ سکے۔ سب کو میری طرف سے پیار بھرا سلام قبول ہو اور آپ سب مجھے بتائیں کہ آپ غیر حاضر کیوں ہیں۔ شہناز باجی تو چلوں گے ان کے لیے وہ غیر حاضر تھیں۔ محمد ارشد قریشی آپ بھی کچھ یاد سے غیر حاضر ہیں پلیز واپس آ جائیں۔ احمد علی کیف صاحب کیسے مزاج ہیں آپ کے آپ کے امتحان کیسے رہے۔ بھائی دیکھو میں نے ابھی تک عبدالملک کیف کو نہیں بتایا کہ میں آپ کے پاس آج آیا ہوں۔ لیکن ابھی سے اتفاق کے ذریعے بتا رہا ہوں۔ عبدالملک بھائی مسوری میں آپ سے چوری احمد علی کے پاس گیا تھا اور ان اس کے پاس تھا۔ بہت اچھے اور نیک انسان ہیں۔ اس نے مجھے اور میں نے جو کتاب آپ کو دی تھی کہ احمد علی نے ڈاک سے بھیجی ہے وہ خود اچھے نے بھیجی تھی کہ کیف کو دینا۔ مسوری

میں آپ کے پاس نہیں آ سکا۔ کیونکہ میرے پاس اتنا رقم نہیں تھا۔ احمد نے مجھے پورے بھانڈے کا لکھارہ دکھایا بہت مزہ آیا مجھے۔ سب آتا ہوں کہانیوں کی طرف تو اقبال جرم (انجم فاروقی ساحلی) میں دیوانہ (محمد سلیم اختر) سہرا جال (طاہر نفیس) اور خوشی (سید عبداللہ شاہد) کی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ مغرب سے انتخاب میں طاہر رانا اور صابر حسین نے بہت اچھا لکھا۔ بلاوا (خوش بیدار زاہد) بھی اتنی مثال آپ تھا۔ مستقل سلسلے میں ہمیشہ کی طرح گردش بہت پسند آئی لیکن یہ یاد کر بیٹھیں بھی ہوئی (ہائی آئندہ ماہ) کیونکہ مجھے پورا ایک ماہ نہیں ہوتا۔ میری شروع سے یہ عادت ہے کہ جو بھی کام ہوتا فائٹ ہو۔ خیر جسے تیسے بہتر کرنا پڑے گا۔ خوش یونین میں شمر علی آغا عصمت اقبال سنی ارشد سید عبداللہ شاہزادہ محمد اسلم جاوید مسیح جمال مسکلی غزل ریاض حسین قمر عبدالملک کیف اور ریاض سعیدہ کی شاعری بہت سن کو بھائی۔ ذوق آگیا میں فرست حسین نجم نجم عظیم راہی ایم عمران سعید اور ریاض ہٹ نے بہت اچھا لکھا۔ آخر میں تمام نئے اشق کے شاعر شاعرانے اشق اشاف اور تمام نئے اشق کے قارئین کو میری طرف سے..... سر دیاں مبارک۔ (ہاہا)۔

ریاض حسین قمر..... منٹکا خیم۔ محترم و محترم جناب عمران احمد صاحب سلام منوں۔ امید ہے آپ مع اہل و عیال اور اپنے دختر کے ساتھیوں کے ساتھ خیریت سے ہوں گے۔ خدا آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔ بالکل میں آپ نے جو انفرادیت پیدا کر دی ہے وہ ماشاء اللہ برقرار ہے اور اس نے ہمارے محبوب رسالے کو مبدیہ انجمنوں میں ممتاز کر دیا ہے۔ اس بار بھی بالکل بہت خوب صورت ہے اور دوسری انفرادیت جو ہمارے رسالے میں وہ ہے کہ اس میں اشتہارات کی بھرمار نہیں ہوتی وہ نہ تو ہر انجمن میں اشتہارات سے محفلوں کے صفحے بھرے ہوتے ہیں۔ اس بار دستک میں لائق صد احترام جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے جو بات کہی سمجھا لی ہے خدا کرے وہ ہمارے بھائیوں اور ہماری قوم کی کچھ میں آ جائے اور ہم سہارے ڈھونڈنے سے باز آ جائیں اور جو تھیں رب ذوالجلال نے ہمیں عطا فرمائی ہیں ان سے بھر پور فائدہ اٹھانے کی توقع عطا فرمائے آئیں۔ آخر میں محترم طاہر قریشی صاحب نے بیادنی پیاری احادیث سے ہمارے ایمان کو تازہ فرمایا۔ گفتگو میں محترم ناز سلسلوش دشنے ایک طویل مگر با مقصد خط کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان ہوئیں مبارک باد قبول فرمائے۔ محترمہ سہی کی صلاحیتوں کا اعتراف نہ کرنا کبھی ایک طرح کی بددیانتی ہے۔ آپ ماشاء اللہ صلاحیتوں بھری ہستی ہیں خداوند کریم آپ کا نظر بد سے بچائے اور آپ کی صلاحیتوں میں مزید برکت عطا فرمائے آئیں۔ محترمہ ریاضہ سعیدہ لاہور سے خوب صورت خط اور تبصرے کے ساتھ تشریف لائیں۔ مجاہد ناز عباسی صاحب ہر اچھی چیز کی تعریف کرتا میں ان کا فرض سمجھتا ہوں۔ یاد آوری کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ یہ پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ آپ دذلول سے ہی میں کی بات سے محروم ہو گئے۔ یہ سب سوئے رب کے کام ہیں اور اس کے کام حکمت سے خالی نہیں ہوتے۔ محترمہ میں کی مٹا کا کوئی نعم البدل بھی نہیں کہ جس کی میں آپ کو دعا دوں۔ محترم فقیر محمد بخش صابر لڑکا صاحب ایک خوب صورت خط کے ساتھ تشریف لائے وہ بہت خوب صورت اور پیارے انداز میں تحریر فرماتے ہیں خدا نے کم بزل ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور انہیں صحت اور تندرستی کی دولت سے مالا مال فرمائے آئیں۔ محترم غزل پسند فرمانے پر بے حد شکر گزار ہوں۔ لائق صد احترام جناب مقبول احمد جاوید صدیقی حسب سابق خوب صورت تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ صدیقی صاحب تبصرہ پسند فرمانے کا بے حد شکر ہے۔ محترم ریاض ہٹ صاحب یاد دہانی کا شکر ہے۔ محترمہ شہناز بانو صاحبہ تو ماشاء اللہ فریضہ حج آ کر کے واپس تشریف لائیں گی۔ گزشتہ ماہ انہیں بہت بہت مبارک باد دی گئی۔ شاید خط لیت پہنچا یا ڈاک والے مہربانوں کی نذر ہو گیا۔ بہر حال گفتگو میں شامل ہونے سے مدد گیا اور وہ مبارک باد محترمہ شہناز بانو تک پہنچ گئی۔ شہناز آج کی آپ کو ادب کے میاں کو بہت بہت مبارک۔ امید کال ہے کہ باہر دعوں میں آپ نے سب تقاریر سننے اتنی کھیر و بھر پر یاد رکھا ہوگا۔ خوش یونین میں اس بار عمر اسرار کا انتخاب بہت لائق جواب تھا۔ کسی غزل پر نظم میں کوئی شعرے دن نہیں تھا۔ خوشیوں سے سخن میں شامل تمام شاعر اور شاعرانہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں مزید محنت سے لکھنے کی توقع عطا فرمائے حصہ نثر ابھی پڑھنا باقی ہے۔

ریاض ہٹ..... حسن ابدال۔ اسلام علیکم! ماہ دسمبر 2012ء کا شمار اس بار 21 نومبر کو ہی کیا گیا۔ سرورق کی

سید عبداللہ شاد۔۔۔۔۔ حیدر آباد اسلام آباد کے دورِ حجاز کے مطلق سے امید کرتے ہیں کہ آپ فخریت سے ہوں گے اور میرے ہر دھڑکنے رسالے "نئے افق" کی تمام وحدتوں، جہتوں اور نیرنگیوں کو خوب سے خوب تر بنانے اور سنوانے میں مصروف عمل ہوں گے۔ مجلس ادارت میں شامل رفقاء نے کار جناب اقبال، محلی جناب طاہر قریشی، جناب حسن اختر، میر کی خدمت میں سلام اور دلی خواہشات پیش کرتا ہوں۔ ساتھ ہی قبلہ محترم بابا مشتاق احمد قریشی سے اپنی محنت کا کلمہ کے لیے دعاؤں کی درخواست کرتا ہوں۔ امید ہے قبلہ صاحب اس کم نصیب سید کی بخشش کے لیے دعا فرمائیں گے اللہ عزوجل آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔ بھائی عمران احمد آپ نے اس مرتبہ میری کہانی "حشی" کو خلاف توقع شائع کر کے ربطِ حیرت میں ڈال دیا۔ پانچ برسوں کی اس رفاقت میں ایسا حسن اتفاق شاذ و نادر دیکھنے میں آیا ہے کہ آپ نے میری تحریروں کو تسلسل کے ساتھ کیے بعد دیگرے شائع کیا ہو۔ ہر غرض اس گرم فرائی کا تبدل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ گزشتہ ماہ پرے میں ناول "شبِ خون" کو آپ نے شائع فرمایا تھا۔ اس پر آپ نے پورے ہائی خوب آزمائش لے ڈالی۔ حضور ﷺ کے امتحان آپ نے میرے ہر قدم میں اس لیے رکھ دیے کہ میں گہائی نویسی ہوں اور اسٹوری رائٹنگ میں اپنا کیرئیر بنانا چاہتا ہوں۔ آپ حکم مزل کی حد کر جاتے ہیں اور میں بے بسی سے انتظار ہر طوطا آپ نے کہانیوں کو نگار شائع کر کے نکلے شکوے کچھ کم کیے ہیں اس لیے بہت شکر گزار ہوں۔ اب آتے ہیں اپنے رسالے "نئے افق" کے تازہ ترسے کی طرف اس بار کا سروں کو مسہرما کی فیض بخشندگی اور طمانیت کا احساس دلانا محسوس ہوا۔ کئی کہانیاں میں اس مرتبہ میرے ساتھ محترمہ ریاض بٹ اور بڑا نیا مضمون قدق بھی خوش نصیب رہیوگراؤں کی حیثیت سے شامل اشاعت تھے ریاض بٹ کو میری طرف سے بہت مبارک باد کہ عمران احمد کہانی کی اشاعت میں آئیں گے۔ بہت انتظار کروا تے ہیں۔ اس کے بعد سب سے پہلے مغرب سے انتخاب میں شامل کہانیوں کا مطالعہ کیا۔ پہلی "مہرِ خشت" جسے طاہر قریشی نے ترجمہ کیا سب سے عمدہ کہانی تھی۔ دوسری کہانی "عقلِ خطوط" (اسلم اور) جو اس بار افتتاحی اشاعت تھی۔ ایک پر محسوس اور سازشی انسانوں کی پہچان کرنی والی کہانی تھی۔ تیسری مغربی کہانی "پڑتال" (صابر حسین) ایک دلچسپ اور پر محسوس ایسا تھا جس کا غیر متوقع انجام گھر کا جمید لگاؤ حبابے کے مصداق تھا اور جسے بڑا کر چیرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ آخر اس کے روشن صفحات پر جناب طاہر قریشی گزشتہ اندازت کے تسلسل میں اللہ تعالیٰ پر اس کے بندے کا رول اور رضا بالقضا کی تشریح کو لکھتے ہیں اور سب لفظوں میں بیان کر رہے تھے۔ مذہبی فقرے اور اس کی انجھون کو دور کرتی ان کی مدلل گفتگو نے دل دوزخ کو تباہ کیا۔ خدا کے مطلق سے اور رب تعالیٰ ہم مسلمانوں کو اپنی اصلاح کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور حق بات کے لیے ہمارے دلوں کو کھول دے آمین۔ اس دفعہ ابتدائی جتنی صفحات پر "یا اباؤ" (محترم خورشید پیرزادہ) کی چٹکی قسط کا مطالعہ کیا۔ ناول کی ہر دہائی شیعہ عرف نیزہ اس قسط میں پورے طور پر سامنے آئی اور اپنی سبیلوں اور دھن کے دوستوں کی توجہ کا مرکز بن گئی ہے۔ دلچسپ ماکھوں اور چھوٹے چھوٹے واقعات سے آگے بڑھتے ہیں ناول کا سبک رومیو بے حد لطیف دے ہا ہے۔ سائیکلر آئندہ کے سامنے شرقی کی پختگی روح نے جو بالحد لطیفیات تماشادھائی ہے پڑھتے وقت اپنی جگہ ہوں ہر اس سرمد گیا تھا۔ جیسے ساہب کوٹھ پہنچا اپنے کمرے کے سکوت سے ڈر کر چونک گیا تھا۔ ہر غرض یہ ناول اپنے فکشن کے لحاظ سے خوب مزاد ہے۔ خورشید پیرزادہ کو مبارک باد۔ مستقل سلسلوں میں "روحانی علاج" میں حافظ شبیر احمد صاحب قرآن آیات کے ذریعے بیماروں اور آفت زدگان کی خوب سہجائی فرما رہے ہیں۔ خوش یونین میں اس سال ہر معیاری غزلیں اور نظمیں پڑھنے کو ملیں ہیں اور خاص کر خواہش شاعرانہ کی آواز نظمیں جن میں ناز سلوش زشتہ ریحانہ سعیدہ ہرہ جیمین نارائین شاہین اور محترمہ شبنم ارشد وغیرہ۔ اس سے شاعری کے اس سلسلے کی افادیت اور شان میں اضافہ ہوا ہے۔ ہر دفعہ آزاد شاعری میں مقابلے کا ماحول نظر آتا ہے۔ اس ماہ عبدالملک کف اور مجاہد زہما کی بھی خواتین کے اس مقابلے میں اپنی اپنی آواز نظمیں سناتے دکھائی دیے۔ ریحانہ سعیدہ کے خواب میں ان کی کم محنتی کا اظہار ہوتا ہے۔ مجاہد زہما کی نظم "بنامیر سے جینا" ہمدت و استقامت سے دیکھنے جڑیوں کا صدور شک بیان ہے۔ وہ عبدالملک کف نے "عجب راحت یہ محبت" میں خواب کے بارے میں ریحانہ سعیدہ کو بھی بھیجی ہے۔ شاعری کے ساتھ جواب دیا ہے۔ خواہ عرق نہ محب "انتراف" میں جلازی خدا کی سہیلی کو تسلیم کر رہی ہیں اور کئی ارشاد کی نظم "محبت کی

لہر" پانچ مصرعی جملوں میں دل دوزخ کو مودہ رکھی ہے۔ پابند شاعری میں شہ علی آغا کی شروع غزلیں عصمت اقبال عین کی ساتھیوں میں ہر گھونک اور لفظ لفظ لٹائے خوب صورت غزلیں آغا صاحب کے لیے ایڈٹ کا جواب پتھر کے صدق ہے۔ سنی غزل اور ویم آخر کی غزلیں بھی اچھی ہیں۔ یہ انہوں کی بات ہے کہ کن دوستوں نے گفتگو کے صفحات پر آنے کی رحمت نہیں اٹھائی۔ قدیر رائے، یمن حسین، قمر اور پریس واد جتنوں کی غزلیں بھی خوب اور شاندار رہی۔ بھائی عمران احمد میرے گیت کو آپ نے بڑے شائق کیا اس لیے بے حد شکریہ۔ ذوق آگئی میں ریاض بٹ کا مکر و فلسفہ "طلب و آرزو" سائنس کی تحریر ہے۔ عظیم رانی کا واقعہ حاتم طالی سے دشمنی پر لطف اُفتاب ہے۔ اس مرتبہ کئی کہانیوں میں مشائی نظم کی حامل عمدہ تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ شعبہ و کلامت سے متعلق تین کہانیوں پڑھنے کو میرا آئیں جن میں سب سے بہترین دوسرے حصے کی اسٹوری "عقود" (نوشاد عادل)۔ میرا ایک پر پسند آئی۔ تسلیم چک اور دوزخ میں ان کے مکمل شباب الدین نے اپنی عمر بھر کی محنت اور خدمات کا خوب بدلہ لیا اور اس کردار کو ڈھونڈنے کی چال اپنی مٹی میں لے کر یوں ملک پرواز کر گئے۔ بینک کے دولت پر چارہ و فکشن کیا ہے مصنف نے لیکن ایک قابل اعتراض بات یہ محسوس ہوئی کہ کوئی تجویز ہوں کھلے ہندوں پولیس والے کی پٹائی نہیں کرتا۔ جس طرح کا نوشاد عادل نے کہانی بیان کرتے ہوئے لکھا۔ ہر غرض کہانی بڑا کھلے آئی۔ دوسرے نمبر پر محمد فاروق انجم کی "اقبال جرم" بھی شعبہ و کلامت کی پر مغز اور پر محسوس کہانی تھی۔ ساحلی کا پلاٹ کے لحاظ سے تانا بانا جواب تھا۔ تیسری کہانی اس موضوع پر غزل جبار نے "گوش حالات" کے عنوان سے لکھی اور کوثر دیوڑ کی حیثیت سے تسلیم اور شائع کے مقدمے کی رو دلوگو بیان کیا۔ باقی کہانیوں میں شہر اجال (طلعت نفیس) اور میں پوانہ (محمد نسیم اختر) بھی منفرد اور معیاری کہانیاں ہیں۔ اپنی اسٹوری "حشی" پر خود سے کیا تبصرہ کریں۔ یہ حق تو پڑھنے والے قارئین خود دوسرے لکھاریوں کا ہے۔ اب ذرا گفتگو کے دوستوں اور ساتھیوں کی طرف آتا ہوں۔ آپ کی شہید کے بعد پہلا خط ناز سلوش ڈشے کا دیکھ کر حیرت اور خوشی کا احساس ہوا۔ اس مرتبہ بھی ڈشے کو صدائی کر رہی سنبھالنے کی میری جانب سے پر غلطی مبارک باد۔ ساتھ ہی نیا سال 2013 کے ڈھیر دیں تہنیتی کارڈز تمہاری نذر کر دیا ہوں۔ میں تجھے کو گفتگو میں شریک نہ ہو سکا کہ قدر گواہ بنا ہے بار بار کا آباہوں لیے تمہاری ہاک نظم سے دوستی پرانے نئے سے کا تھا۔ جو احساس میں جلجلیک جذبوں کا نہایت دل کش اظہار تھا۔ تم نے بہت ساری باتیں لکھیں اور شادی ارشاد کو اچھے لفظوں میں سمجھا دیا۔ بات یہ ہے کہ کہانی کی اور اپنی بات ہے۔ یہ افلاطون کے مکر کی مذاق کی بات کو بھی ڈائریکٹ دل پر لے لیتی ہے۔ ہر کچھ پیٹ کی ہلکی بھی ہے کہ سبک نہ کو بھی ہڈیوں کے گزرت کی طرح شیر کر کے لگتی ہے۔ اب یہ کم عطفی ہے یا بعد سے زیادہ کہ خود اپنی زبان سے اسٹوری رائٹنگ کا قدر مبالغہ گزرا کر رہی ہیں محترمہ ڈشے عثمان بھائی اور بھائی کو اداری و افہام کو میری طرف سے سلام اور نیک خواہشات پہنچاؤ اور دعا دے کے لیے کہنا۔ اس کے بعد ریحانہ سعیدہ نے میرے ناول "شبِ خون" پر تبصرہ کیا۔ ہر پسندیدی کا اظہار کیا ہے اس لیے شکریہ۔ اس کے علاوہ عزیز مجاہد زہما عباسی محترمہ خیمہ بخش صابر لگاؤ اور محترمہ ریاض بٹ کا بہت شکر یہ کہ آپ دوستوں نے "شبِ خون" پر رائے زنی کی اور اسے پسند کیا۔ آخر میں سب مقبول جاوید احمد صدیقی کے اپنے ناول پر تیق و ستان چلانے پر بھی شکر یہ ادا کرتا چلوں کہ ستر تیرہ نگاہ نے جس طرح مجرموں میں سے ناول پر رائے دی ہے اس سے جناب علی کی ادنیٰ کدورت اور نفیض دیکھا کا پتا چلتا ہے۔ خدا جانے صاحب متحول کو مجھ سے کسارت سے خدا واسطے کلیر ہو گیا ہے۔ گفتگو میں محض چھ سات خطوط شائع کیے گئے تھے۔ کراچی کی ان شاہین عالیہ انعام اکبری، انم خان اور جہلم کے ریاض حسین قمر عبداللہ عاظم عبدالملک کیف البشر احمد بھٹی محمد ارشد قریشی ناظم بخاری وغیرہ بھی کیا بھیا شہباز بانو کے دوبارے ریسٹ پر ناغہ کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ اچھا بہانہ ہے دوستو! محترم عمران بھائی آپ تینہ معیار پر میری دو کہانیاں کہنی اور ترازو اچھی رکھی ہیں۔ ان کا بھی فیصلہ کریں۔ جا شام



اِقْبَال

ترتیب: طاہر قریشی

نوکل اور رضا بالقضا۔

(۲۳۵)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہی سواری پر آپ کے پیچھے سوار تھا کہ آپ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے لڑکے! تو اللہ تعالیٰ کا خیال رکھ (یعنی اس کے احکام کی تعمیل اور اس کے حقوق کی ادائیگی سے غافل نہ ہو) اللہ تعالیٰ تیرا خیال فرمائے گا اور دنیا و آخرت کی آفات و بلیات سے تیری حفاظت کرے گا، تو اللہ کو یاد رکھ جیسا کہ یاد رکھنا چاہئے۔ اس کو تو اپنے سامنے پائے گا اور جب تو کسی چیز کو مانگتا چاہے تو بس اللہ سے مانگ اور جب کسی ضرورت اور ہم میں توبہ و کفایت اور طالب ہو تو اللہ ہی سے امداد و اعانت طلب کر اور اس بات کو دل میں بٹھالے کہ اگر ساری انسانی برادری بھی باہم متفق ہو کر اور جز کر جائے کہ تجھ کو کسی چیز سے نفع پہنچائے تو صرف اسی چیز سے تجھ کو نفع پہنچا سکے گی جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے مقدر کر دی ہے۔ اس کے سوا کسی چیز سے نہیں اور اسی طرح اگر ساری انسانی دنیا تجھ کو کسی چیز سے نقصان پہنچانا چاہے تو صرف اسی چیز سے نقصان پہنچا سکے گی جس سے نقصان پہنچانا اللہ تعالیٰ نے پہلے سے ہی تیرے لیے مقدر کر دیا ہے اس کے سوا کسی چیز سے تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جاسکے گا اٹھ چکے قلم اور خشک بھی ہو چکے صحیفے۔

(مسند احمد جامع ترمذی)

(تشریح) حدیث کا مطلب و معنی اور اس کی روح یہی ہے کہ ہر قسم کا نفع و نقصان اور دکھ و آرام صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اس کے سوا کسی کے بس میں کچھ بھی نہیں، حتیٰ کہ اگر ساری دنیا کے انسان مل کر کسی بندہ کو کوئی نفع یا نقصان یا دکھ یا آرام پہنچانا چاہیں تب بھی اللہ کے حکم اور اس کے فیصلے کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے، وجود میں وہی آئے گا اور وہی ہوگا جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہے اور قلم تقدیر جس کو اب سے بہت پہلے لکھ کر فارغ ہو چکا ہے اور اس کی تحریر خشک بھی ہو چکی ہے۔ ایسی صورت میں اپنی حاجات کے لیے کسی مخلوق سے سوال کرنا اور اس سے مدد مانگنا صرف نادانی اور گمراہی ہے لہذا جو مانگتا ہو اللہ سے مانگو اور اپنی حاجات کے لیے اس کے آگے ہاتھ پھیلاؤ اور اس سے لینے کی صورت یہی ہے کہ اس کو اور اس کے احکام و حقوق کو یاد رکھو وہ تمہیں یاد رکھے گا اور تمہاری ضرورتیں پوری کرے گا اور دنیا و آخرت میں تم پر فضل فرمائے گا۔

چونکہ کتاب الایمان میں تقدیر کے بیان میں پوری وضاحت اور تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ ”تقدیر“ کا مطلب کیا ہے اور تقدیر کو مانگنے کے باوجود عمل اور تدبیر کی ضرورت کیوں ہے اس لیے اس شبہ اور محسوسہ کے

متعلق یہاں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اگر کسی کو اس بارے میں غلیان ہو تو معارف الحدیث میں تقدیر کا بیان پڑھ لیا جائے۔

(۲۳۶)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: اے لوگو! نہیں جو کوئی چیز ایسی جو جنت سے تم کو قریب اور دوزخ سے تم کو بعید کرے مگر اس کا حکم میں تم کو دے چکا ہوں اور اسی طرح نہیں ہے کوئی چیز ایسی جو دوزخ سے تم کو قریب اور جنت سے بعید کرے مگر اس میں تم کو اس سے منع کر چکا ہوں (یعنی کوئی نیکی اور ثواب کی بات ایسی نہیں رہی جس کی تعلیم میں نے تم کو نہ دی ہو اور کوئی بدی اور گناہ کی بات ایسی نہیں رہی جس کی میں نے تم کو ممانعت نہ کر دی ہو۔ اس طرح اور امر و نہی کی پوری تعلیم میں تم کو دے چکا ہوں اور اللہ کے تمام مثبت و منفی احکام جو مجھے ملے تھے وہ میں تم کو پہنچا چکا ہوں) اور الروح الامین نے اور ایک روایت میں ہے کہ روح القدس نے (اور دونوں سے مراد جبرائیل امین ہیں) ابھی میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے (یعنی اللہ کی طرف سے یہ وحی پہنچائی ہے) کہ کوئی تنفس اس وقت تک نہیں کرتا جب تک کہ اپنا رزق پورا نہ کر لے (یعنی ہر شخص کو اس کے مرنے سے پہلے اس کا مقرر رزق ضرور بالضرور مل جاتا ہے اور جب تک رزق پورا نہ مل جائے اس کو موت آ ہی نہیں سکتی ہے) لہذا اے لوگو! خدا سے ڈرو اور تلاش رزق کے سلسلے میں نیکی اور پرہیزگاری کا رویہ اختیار کرو اور روزی میں کچھ تاخیر ہو جانا تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اللہ کی نافرمانیوں اور نامشروع طریقوں سے اس کے حاصل کرنے کی فکر و کوشش کرنے لگو کیونکہ جو کچھ اللہ کے قبضہ میں ہے وہ اس کی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری ہی کے ذریعے اس سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(شرح السنۃ شعب الایمان ج ۱)

(تشریح) حدیث کا ابتدائی حصہ صرف تمہید ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر دراصل وہی خاص بات اپنے مخاطبین کو بتلانا اور پہنچانا چاہتے تھے جو جبرئیل امین نے اس وقت آپ کے دل میں ڈالی تھی لیکن مخاطبین کے ذہنوں کو پوری طرح متوجہ کرنے کے لیے آپ نے پہلے ارشاد فرمایا کہ لوگو! حلال و حرام اور گناہ و ثواب کی پوری تعلیم میں تم کو دے چکا ہوں اب ایک اہم پچھیل بات جو ابھی جبرئیل امین نے مجھے پہنچائی ہے میں تم کو بتانا چاہتا ہوں۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی)



بلاوا

خورشید پیرزادہ

ماہوق الطمطمرة واقعات، قصے کہانیاں اور ان پر بنائے جانے والے فلمیں ڈرامے
جسے درود میں انسانیت کے ذہنوں پر اثر انداز ہوتا رہا، وہی ہے۔ زہر نظر کھاتے
ایک خواب سے شروع ہوتی ہے جو آگے چل کر بھر پور نئے موڑ لے کر اب محو حیران
کمرے میں۔

سنائی کے سس پسند تار میں کے لیے بطور خاص ایک سٹی خیر ناول

جب ریتھو اوپر آئی تو اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ کیا
سے کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو یہی سوچ رہی تھی کہ نیرو کے
بارے میں پوچھنے کے لیے ہی اس کو بلایا گیا ہے۔
”بیٹی! اگر آئندہ شادی کرنے میں تمہیں کوئی
اعترض نہ ہو تو ہماری عزت بچ جائے گی۔ آئندہ کے
والد نے بغیر کسی لگ پٹی کے ہی پوچھ لیا۔ ریتھو کو اپنے
کانوں پر یقین ہی نہیں ہوا۔ لہذا چھری اسپیکر اس کے
سامنے کھڑا اس کو ہی دیکھ رہا تھا۔

”مہم..... میں.....“
”کوئی زور زبردستی کی بات نہیں ہے بیٹی۔ تمہارا
سہا بنے ہم برا حسان کرنے کے بہانے ہی یہ مشورہ
دیا ہے لیکن اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو۔“
ریتھو نے آئندہ سے نظریں ملائیں اور شرما کر اپنی
ماں کے پہلو میں چھپ گئی۔

”بول دو بیٹا۔ جو کچھ بھی تمہارے دل میں ہے
بول دو۔“ ماں نے تہا بیت دلا رہے کہا۔
”مہم..... مجھے کیوں اعتراض ہو گا ماں۔ یہ تو
میری خوش قسمتی ہوگی اور پھر اس سے اچھا حل نکل بھی
نہیں سکتا۔“ ریتھو نے ماں کے کان میں دھیمے سے
کہا۔ مگر سن سب نے لیا۔ اس کے ساتھ ہی گھر میں
پھر سے خوشیاں پھیل گئیں۔

”ہاں۔ کرو۔ مگر جلدی کرو پلیز۔“ نیرو ہڑ بڑائی
ہوئی سی تھی۔

روہن نے موبائل نکال کر گھر کا نمبر ڈائل کیا۔
”ہیلو۔“ گھر سے فون کر کے آواز آئی۔

”کا کا! مجی کھون دیتا۔“ روہن نے جلدی سے کہا۔
”چھوٹے مالک کہاں چلے گئے ہو آپ۔ گھر پر
سب آپ کے لیے فکر مند ہو رہے ہیں۔ بیگم صاحبہ
بہت غصے میں ہیں۔“ کا کا نے کہا۔

”یار جلدی فون دو۔ میں سمجھا دوں گا انہیں۔“
روہن بولا۔

”یہ لیں۔ آگئیں بیگم صاحبہ۔ روہن بابا کا فون ہے
۔“ کا کا فون می کوڈے کر چلا گیا۔

”کہاں چلے گئے ہو تم؟ یہاں کون جی رہا ہے۔
مر رہا ہے۔ نہیں فکر بھی ہے۔“ می کی آواز سے غصہ
اور پیار دونوں جھلک رہے تھے۔

”مہم..... وہ..... میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ کہیں
جار ہا ہوں۔“ روہن ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا خاک بتایا تھا۔ تین دن کا کہہ کر گئے تھے۔
آج پورے آٹھ دن ہو گئے ہیں۔ فون تو کر ہی سکتے
تھے نا۔“ می کی آواز اب بھی نرم نہیں پڑی تھی۔

”اس کے لیے سواری می۔ میری بات سنیں۔“
روہن نیرو کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔

”تمہارا تو سواری کہہ کر ہی کام چل جاتا ہے خیر
چھوڑو ان باتوں کو پہلے میری بات سنو۔ بیٹا نے
تمہارے لیے بہت اچھا رشتہ دیکھا ہے آسٹریلیا میں
لڑکی پر بھی لکھی ہے اور بہت ہی خوب صورت ہے۔
اپنے ہی ملک کی ہے۔ بہت ہی اچھا خاندان ہے۔ تم
جلدی سے گھر آ جاؤ۔ لڑکی کے فادر پاکستان آئے
ہوئے ہیں آج کل۔ تم مل لیں گے کیا ہوا فون
کات دیا کیا۔“ می نے ایک ماحول میں سب کچھ کہنے

کے بعد پوچھا۔ فون پر کافی دیر سے آواز نہیں آئی تھی۔
”نہیں می۔ یہیں ہوں۔“ روہن نے مری ہوئی
آواز میں کہا۔

”تو کل پکا آرہے ہوتا تم۔ بول دوں لڑکی والوں
کا۔“ می نے پوچھا۔

”نہیں می..... وہ.....“ روہن بولتا بولتا رک
گیا۔

”نہیں کے بچے۔ تم گھر آ جاؤ ایک بار۔ کیا نہیں
نہیں کی رٹ لگا رہی ہے۔ کل آرہے ہوں؟“ می
شاید آسٹریلیا والے رشتے کے لیے بے تاب سی ہو
رہی تھیں۔

”میری بات تو سن لیں می۔“ روہن مایوس ہو کر
بولا۔

”ہاں بولو جو بولنا ہے۔ مگر کل نہیں آئے تو دیکھ لیتا
پہلے ہی بتا رہی ہوں۔“ می نے پیش میں آ کر کہا۔ مگر
پھر بھی ان کے ہر لفظ سے بیٹے کے لیے پیار جھرنے
کی طرح بہہ رہا تھا۔ ماں تو ایسی ہی ہوتی ہے۔
”آئے کو تو میں آج بھی آ جاؤں گا می لیکن۔“
روہن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ نیرو کے بارے میں می کو
کیسے بتائے۔ کہاں سے آغاز کرے اور وہ بھی تب
جب می نے پہلے ہی رشتے کا ذکر کیا دیا ہے۔
”لیکن کیا؟ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ آج ہی
آ جاؤ۔“ می خوش ہوتے ہوئے بولیں۔
”پہلے میری پوری بات تو سن لیں می۔“ روہن
دھیمے گے میں کہا۔
”بولو گے بھی تو سنوں گی نا بولو۔“ می نے پیار
سے کہا۔
”مہم..... میں شادی نہیں کروں گا می۔“ روہن
نے سانس چھوڑتے ہوئے آدھی بات کہی۔
”کیا! یہ کیا کہہ رہے ہو تم شادی کیوں نہیں کرو

www.pdfbooksfree.pk

”ارے یہ کیا کر رہی ہو تم رو کیوں رہی ہو اب اس سے شادی کے لیے تمہارا دل مان گیا ہے کیا۔ چلو کر لیس کے ایڈ جسٹ۔“ ریتو ہنسنے لگی۔

”تم کیا ہو یا ریتو میرے لیے تم نے یہ سب کر لیا۔ میں کیا کہوں۔“ ریتو دسکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں پاگل ہوں کیا جو تمہارے لیے کروں گی۔ میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اگر ایسا رشتہ میرے لیے آتا تو میں کبھی منع نہ کرتی۔ وہ تو بتا جی کے دماغ میں جانے کیسے یہ خیال آ گیا۔ اب تم یہ ساری باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کہاں ہو میرا پورا خاص والا باطل تو بند ہے۔ خیر جہاں بھی ہو جلدی سے اڑ کر آ جاؤ۔ باقی باتیں یہاں بیٹھ کر ہی کریں گے۔“ ریتو نے ہنالاگ لپٹ کے اپنے دل کی بات اپنی بہن جیسی گڈلی کو بتادی۔

”ٹھیک ہے۔ تم میرے گھر پر ہی ملنا۔ میں آرہی ہوں۔ بیس بجیں منٹ میں۔“ ریتو نے کہا اور فون رکھ دیا۔

فون رکھتے ہی اس نے روہن کو اس کا نام لے کر

”بتا جی! مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ میں نے ان کی عزت مٹی میں ملا دی۔ کیا منہ لے کر واپس آؤں؟“ ریتو کی آواز سے لگ رہا تھا جیسے وہ اپنا رونا شروع کر دے گی۔

”ایسا مت کر دو یا ریتو میں نے تو پہلے بھی تمہیں سمجھا دیا تھا۔ مگر تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آیا آ جاؤ۔ گھر پر سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں بے فکر ہو جا۔ تمہاری پینشن میں نے اپنے گلے میں ڈال لی ہے۔“ ریتو ہنسنے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب؟“ بات ریتو کی سمجھ میں نہیں آئی۔

”ان کا رشتہ میرے ساتھ ملے ہو گیا ہے اب تو خوش ہوتا تم۔“ ریتو نے بڑی خبر سنانے کے سے انداز میں کہا۔

ریتو تو فوری دیر تو ہی سن ہی ہو کر کھڑی رہی۔ پھر اچانک اس نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے رونے کی آواز دوسرے کمرے میں روہن اور ریتو تک بھی پہنچی اور وہ گھبرا کر باہر نکل آئے۔ مگر ریتو کو فون کان سے لگائے دیکھ کر واپس اندر چلے گئے۔

”ٹھیک ہے۔ پیار سے بات کر کے پوچھنا کہاں جاؤ اور ہو سکتے تو اس کو واپس بلا لینا۔ میں تھوڑا سا آرام کروں آج تو سب کام ایسے کا ایسے ہی پڑا ہے۔“ یہ کہہ کر وہاں انہیں اور اندر جا کر دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو گئیں۔ ان کو یقین تھا کہ اگر فون پر ریتو ہوئی تو ریتو منہ سے اپنا رشتہ ملے ہونے کی بات ضرور بتائے گی۔ وہ جانا چاہتی تھی کہ ریتو اس رشتے سے خوش ہے بھی یا نہیں۔ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا تھا کہ ان کو اپنی نبی کے دل کی بات جاننے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ ان کو یہ تھا کہ ریتو غصے سے کچھ نہیں چھپائے گی۔

امید کے مطابق ان کے باہر نکلنے ہی پھر کھنٹی بجی۔ ریتو نے جھٹ سے فون اٹھا لیا۔

”ہیلو۔“

”ہیلو ریتو۔“ ریتو نے بوجھل سی آواز میں کہا۔

”کہاں مر گئیں تم۔ میں کبھی تم مذاق کر رہی ہو۔ مگر تم تو صبح میں ہی چلی گئیں ایسے بھی کوئی کرتا ہے بھلا تمہیں پتہ ہے یہاں سب کتنے پریشان ہیں۔“ ریتو ریتو کی آواز پہنچاتے ہی شروع ہو گئی۔

”چاچی کہاں ہیں؟“ ریتو نے پوچھا۔

وہ باہر ہیں۔ میں ایسی ہی ہوں۔ بتاؤ نا کہاں ہو تم۔“ ریتو نے پیار سے پوچھا۔

”ماتا جی اور پتا جی ٹھیک تو ہیں نا۔“ ریتو کو ان کی فکر زیادہ تھی۔

”ایسے کیسے ٹھیک رہ سکتے ہیں۔ چاچی کا تو صبح سے برا حال ہے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا ہیو۔“ ریتو نے اس کی سرزنش کی۔

”وہ۔۔۔۔۔ لوگ۔۔۔۔۔ آئے تھے کیا؟“ ریتو نے پوچھا۔

”ہاں آئے تھے۔ مگر اب تمہیں ان کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم گھر آ جاؤ۔“ ریتو نے کہا۔

”ہے۔ اب کیا کریں؟ تم کل صبح نہیں آ سکتیں کیا؟“ ریتو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خیالوں میں کہیں اور ہی کھنٹی ہوئی تھی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا ریتو کو گھر والوں کی یاد ستانے لگی تھی۔ گھر سے نکلنے وقت اس نے اس بات کو جتنا آسان سمجھا تھا دراصل یہ فیصلہ اب اسے اتنا ہی بھاری لگ رہا تھا۔ اسی ابو کی یاد اور اس کے نانا کی حالت کی فکر نے اس کو بے چین سا کر دیا تھا۔

”ریتو۔“ روہن نے اس کو خیالوں میں کھویا ہوا پا کر پھر آواز دی۔

”آں۔۔۔۔۔ میرا نام شیو ہے۔ مجھے اسی نام سے بلاؤ پلیز۔“ ریتو نے چونک کر خیالوں سے پلٹتے ہوئے کہا۔

”پاپا مان گئے ہیں۔ مگر کل آنے کو کہہ رہے ہیں۔“ روہن نے اس کی کھنٹی ہوئی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے ایک فون کرنا ہے دو گے پلیز۔“ ریتو نے جواب میں اتنا ہی کہا۔

”ہاں ہاں۔“ روہن نے خوش ہو کر فون ریتو کی طرف بڑھایا۔

”وہ۔“ مجھے اکیلے میں بات کرنی ہے۔“ ریتو نے روہن کی طرف دیکھ کر ہنسی کہا۔

”ٹھیک ہے ہم اندر جا رہے ہیں۔ بات کرنے کے بعد بلا لیتا۔“ روہن نے کہا اور اندر چلا گیا۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ آواز ریتو کی ماں کی تھی۔ ریتو نے کوئی بات کیے بغیر فون کاٹ دیا۔

”کون تھا ماں۔“ ریتو ان کے پاس ہی بیٹھی تھی۔

”پتہ نہیں۔ فون کٹ گیا۔“ ماں نے جواب دیا۔

”ضرور شیو کا ہوگا۔ اب کی بار مجھے اٹھانے دینا۔“ ریتو آ کر فون کے پاس بیٹھ گئی۔

اپنے دنیا میں سب سے پہلے میں مقیم ہوں

پہلی نظر سے

ایک سال کے لیے 12,000 روپے سالانہ (ماہیول رجسٹرڈ ڈاک فرم)

پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے

امریکا کیلئے 5500 روپے

میل اینڈ ایڈریس فارم پر کے لیے 6000 روپے

رقم واپس ڈارفت بھی آؤر بھی مگر کمیشن پر یونٹن کے ذریعے بھی جاسکتی ہیں۔ مقامی افراد دفتر میں نقد ادائیگی کر کے کر سکتے ہیں۔

رابطہ: طارق احمد قریشی۔ 0300-8264242

تفصیل: غروب آف جیسی کیشز کرہ نمبر 7 قریب مجید عبداللہ بارون روڈ کراچی۔

فون نمبر: 922-35620771/2 لکس 922-5620773 Email: circulationnp@gmail.com

پکارنے کی کوشش کی۔ مگر جانے کیوں اس سے نام لیا نہیں گیا۔

”ارے..... سنیں۔“ روہن تو بلا دے کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ رویندر کو اندر ہی رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر آ گیا تاکہ نیرو کو اپنے دل کی بات کہنے میں کوئی پریشانی نہ ہو۔

”آپ رو کیوں رہی ہیں؟“
”مجھے اپنے گھر جانا ہے۔“ نیرو نے فون روہن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ..... کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ میں نے تو پایا سے بھی کہہ دیا ہے۔“ روہن نیرو کی یہ بات سن کر دم بخود ہوا۔

”سوری..... مگر مجھے لگتا ہے کہ مجھے گھر واپس جانا چاہئے میں جانتی ہوں کہ آپ کو میری یہ بات بہت بری لگ رہی ہوگی۔ مگر میں نہیں جانتی میرے گھر والے پریشان ہو رہے ہیں سوری۔ مگر میں آپ سے بعد میں بات کر لوں گی۔ وعدہ رہا۔“ نیرو دوسرے جھکائے بولتی جا رہی تھی۔

”تھ۔۔۔ تو کیا آپ گھر والوں کو بتائے بغیر آئی تھیں۔ ایسا کیوں کیا آپ نے؟ میں تو آپ سے پہلے ہی پوچھ رہا تھا کہ۔“

”سوری۔“ نیرو نے پہلی بار روہن سے دوپل سے زیادہ دیر تک نظریں ملائیں۔ آج اس کو روہن کی آنکھوں میں اپنا پس سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں وہ چھپن نہیں تھی جو نیرو کو دوسرے لڑکوں کی آنکھوں میں دکھائی دیتی تھی۔

”میں بعد میں ملوں گی آپ سے۔“ نیرو نے کہا اور باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

”کچھ کہا تو نہیں نا چاچا۔ چاچی نے۔“ ریتو نے

نیرو کے اوپر آتے ہی پوچھا۔ نیرو گھر آنے کے تقریباً پندرہ منٹ بعد اوپر آئی تھی۔ جب ای نے اس کو بتایا کہ ریتو اوپر اس کا انتظار کر رہی ہے۔

”نہیں۔۔۔ کچھ خاص نہیں۔ ایوے تو زیادہ بات ہی نہیں کی۔ لگتا ہے مجھ سے ناراض ہیں۔ تم بتاؤ۔ تم بھی ناراض ہو کیا؟“ نیرو نے ریتو کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

”تم توج میں ہی جاگل ہو یا مجھے یقین نہیں تھا کہ تم حج میں چلی جاؤ گی آخر تم نے سوچ کیا رکھا ہے۔؟ پوری عمر ایسے ہی بیٹھی رہے گی کیا؟“ ریتو نے غصہ دکھاتے ہوئے کہا۔

”میری بات بعد میں کرتی رہنا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم خوش تو ہونا آئندے کے ساتھ رشتہ طے ہونے پر اگر ایسا نہیں ہے تو میں ساری زندگی خود کو معاف نہیں کر پاؤں گی تم نے میرے گھر والوں کو بچا لیا۔ مگر تمہاری خوشیوں کی قربانی دے کر میں یہ سب کبھی نہیں چاہوں گی تم مجھے حج بتاؤ تمہیں میری قسم۔“ نیرو نے اس کے سوال کو ٹالتے ہوئے اپنا سوال داغ دیا۔

”ہاں۔ میں بہت خوش ہوں یا رانا سے اچھا لڑکا مجھے مل ہی نہیں سکتا تھا تمہیں نہ پاسنے کی کسک ان کی آنکھوں میں صاف دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اس نے اپنے گھر والوں کو قطعی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ شاید ان کی خوشی کے لیے ہی انہوں نے مجھے قبول کیا ہے مجھے جانے کیوں ڈر سا لگ رہا ہے کہ کہیں وہ مجھے اتنا پیار دے ہی نہ پاس جتنے کی میں ان سے توقع رکھ رہی ہوں۔“ ریتو نے اپنے دل کی بات سنا دی اور یہ سب باتیں کہتے ہوئے آئندے کا خوب صورت چہرہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ کچھ دیر وہاں جب چھائی رہی۔ پھر اچانک ریتو نے کہا۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں۔“

”ان کے پاس۔“ نیرو نے جواب دیا۔
”ان کے کن کے..... کیا روہن کے پاس؟“ ریتو نے اندازہ لگاتے ہوئے چونک کر پوچھا۔
”ہاں۔“ نیرو نے نظریں جھکا لیں۔

”کیا؟“ اپنا اندازہ درست ثابت ہونے پر ریتو پھر چونکی۔ ”اس دن تو تم میرے ساتھ بھی جاتے ہوئے ذرا ہی تھیں پھر ایسے کیسے چلی گئیں؟“
”پتہ نہیں یار..... مگر میرے پاس کوئی اور راستہ بچا ہی نہیں تھا۔“ نیرو بولی۔

”انہوں نے کچھ پوچھا نہیں تم نے کیا بتایا۔“ ریتو اب تک حیرت میں تھی۔

”میں نے ان کو یہی بتایا تھا کہ مجھے ان کے خواب والی بات پر یقین سا ہو رہا ہے۔ اس لیے میں اس کے ساتھ ٹیلے پر چلنے کو تیار ہوں۔“ نیرو نے کہا۔
”پھر کیا ہو لے؟“ ریتو خوش ہو کر بولی۔

”انہوں نے تو چلنے کی تیاری کر بھی لی تھی پھر مجھے لگا کہ میں غلط کر رہی ہوں اس لیے میں نے تمہیں فون کیا اور واپس آ گئی۔“

”اوہ۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ اس مذاق سے ان کے دل پر کیا بیتے گی حج میں بہت سنگدل ہو تم وہ حج ہی کہتے ہیں تمہارے اندر دل ہی نہیں ہے اور نہ جذبات۔“ نیرو کی بات سن کر ریتو بھڑک اٹھی۔

”میں کیا کرنی یا ر حج کہوں تو مجھے بھی بہت شرم آئی تھی ان کو انکار کرتے ہوئے مگر میں کیسے جاسکتی تھی تم ہی بتاؤ میں نے تو دو چار دن گھر سے باہر رہنے کے لیے ان کو ایسا بول دیا تھا۔“

”انہوں نے کچھ کہا نہیں ان کو تو تم پر بہت غصہ آیا ہوگا۔“ ریتو نے پھر اندازہ لگا دیا۔

”پتہ نہیں میں تو یہ بولتے ہی باہر نکل آئی تھی کہ بعد میں بات کر لوں گی۔“

”اور اب تم ان سے بات کر دینی نہیں ہے نا یہ وعدہ توڑنا بھی تمہارے لیے مشکل نہیں ہے۔ کیوں؟“ ریتو کو روہن پر حس آ رہا تھا۔

”پتہ نہیں مگر حج بتاؤں مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ان کے سینے اور میرے نام کے بدلنے کی کہانی ایک دوسرے سے جڑی ہوئی سی لگتی ہے پتہ نہیں کیوں مجھے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا ان کے سامنے جا کر ایسا لگنے لگا ہے کہ میں ان کو بہت پہلے سے جانتی ہوں بہت سادوں سے مگر یہ نہیں کیوں میرا دل اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔“ نیرو نے اپنے دل کی الجھن بیان کرتے ہوئے کہا۔

”دل ہوگا تمہارے اندر بھی تو مانے کا نادر نہ کبھی ان کو جھوٹا یقین دلا کر ان کے جذبات سے نہ کھینچ سچ میں یار۔ دل کر رہا ہے تمہیں زبردستی اٹھا کر اس ٹیلے پر لے جا کر شیخ دوں جو ہوگا دکھا جائیگا۔“ ریتو نے پیار بھرے غصے سے کہا۔
نیرو کچھ نہیں بولی۔ بس ہنسنے لگی۔ شاید اپنے آپ پر۔

☆ ☆ ☆

”مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ اس کے دماغ میں کچھ اور چل رہا ہے۔ بات تک نہ کرنے والی بھابھی جی اتنی جلدی چلنے کو تیار کیسے ہو سکتی تھیں۔“ رویندر اور روہن بیٹھے بات کر رہے تھے۔

”مگر یار اس نے بولا تو ہے نا کہ بعد میں بات کریں گے۔ ہم انتظار کرنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔“ روہن کے لہجے میں مایوسی تھی مگر ہمت نہیں ہاری تھی اس نے۔

”ڈر لا پنا سو بائل تو دینا۔“ رویندر نے کہا۔

”کیا کرو گے؟“ روہن نے فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ رویندر نے کوئی جواب نہیں دیا

”میں ہوں رویندر فون مت کاٹنا۔“ رویندر نے جلدی سے کہا۔

”اوہ! ہاں کیا بات ہے تمہیں۔ نمبر کہاں سے

”اے سب نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بجاورد، میں

دو پہر سے رو رہا ہے بچوں کی طرح۔“ روئندہ نے
روئین کے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”میں کیا کر سکتی ہوں میں بھی اس کو بھی سمجھا رہی ہوں مگر وہ نہ دانتوں کا مچھڑا رہا نہ رستہ نہ

وہ لوگوں کی طرح ہی مارتیں کہیں گے۔

”اس کی بات ہو سکتی ہے کیا رومن سے؟“
ریٹو نے فغانہ اور وہکا طرف بڑھایا۔

”نہیں۔ مجھے نہیں کرنی کوئی بات۔“ نیرو ہڑبڑا کر کہنے لگا۔

”بات کر لو ناپار۔ تم کہہ کر تو آئی تھیں اسے۔“

”نہیں مجھے نہیں گوارا ہے کہ میں اس سے بڑھ کر کوئی اور کہوں۔“
 رتو غصے سے بولی۔

دیکھ لوں گی۔“ تیرو نے صاف منع کر دیا۔

اپنے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

”لوہہ۔ میں اس کی طرف سے معافی مانگتی ہوں۔“

اس نے جان بوجھ لڑ مذاق نہیں کیا تھا۔ اس ملاقات ہونے پر سب بتا دوں گی۔“ ریتھونے لا چاری سے کہا۔

”مگر میں نے مشکل سے تو پایا کو منایا تھا۔ اب اس کے بغیر گھر کیسے جاؤں۔ میں نے پایا کو کچھ بھی دیا

ہے کہ میں خیر کو لے کر آ رہا ہوں۔“ روہن نے بے بسی سے کہا۔

”کیا؟“ تم نے اپنے پاپا کو بھول دیا ہے۔ تم

”ایک بات تو بتاؤ؟ تمہیں کیا لگتا ہے۔ روبن
چھوڑا ہے۔ بدتمیز ہے۔“ ریتو نے پوچھا۔

”نہیں تو۔ میں نے ایسا کب کہا۔“

”تو پھر اس کی شکل سے نفرت ہے؟“
”جی نہیں توور۔“

”تم کیا سمجھتی ہو وہ ہمارا ناجائز قائدہ اٹھا سکتا ہے
 کیا۔“

”یہ سب تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ نیرو نے پلٹ کر سوال کیا۔

”تمہارا دانا۔“

”نہیں۔“

”اب تک جتنی بار ملے ہیں۔ تمہیں لگتا ہے کہ اس

کے دل میں کوئی جور ہے، وہ سب جھوٹ بول رہا ہے۔“

”تو پھر براہم کیا ہے یار! رتم مجھ سے بچ چوگی تو

جانے خود تمہیں بھی لگتا ہے کہ تمہاری حقیقت کہیں نہ

نہیں اس سے بڑی ہوتی ہے۔ اور میں دوسرے کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ وہ ایسا لڑکا نہیں ہے جو یونہی

میں بھی تو چل رہی ہوں میں بھی دیکھنا چاہتی ہوں کہ

آخرم دونوں کے بیچ پیار کی وہ کوئی نلکی ہے جس کی طاقت نے تمہیں آنندت شادی ماننے کے لیے گھر

سے بھاگنے پر مجبور کر دیا آج تک خودم نے ایسا نہیں
سوچا ہو گا کہ تم بھی ایسا کر سکتی ہو۔ مگر تم نے ایسا کیا

یہ تم دونوں کے درمیان کوئی انجانا بندھن نہیں تو اور کیا ہے جس نے روہین کو یہاں تک آنے پر مجبور کر دیا اگر

اس کو نالک ہی کرنا ہوتا تو کیا کراچی میں بڑیوں کی کڑی
 ہے۔ بھرا بڑا ہے پورا کراچی کہیں بھی دل چنگی کر سکتا

تھانہ رتھوے تمام باتیں کہہ کر ایک گھبراہٹس لیا۔

”یہ نہیں تم کہاں کی باتیں کر رہی ہو اور پھر ہم جاسمیں گے کیسے؟“ نیرو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ریتو نکس بھروسے پر باہر جانے کی بات کر رہی ہے وہ بھی ہفتے بھر کے لیے۔

”میں نے سب سوچ لیا ہے۔ میں آج ماما جی کو بتاؤں گی کہ میرا پورا خاص سے میری سہیلیوں کا ٹور جا رہا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ بھی منع نہیں کریں گی اب تو ان کو میرے جیسے لگ رہا ہے کہ ان کی بیٹی بے وقت ہی شادی کی پیریز میں جکڑنے جا رہی ہے۔ پہلے میں ماں سے پوچھ لوں۔ میری ماں ہونے کے بعد چاچا بھی مان ہی جائیں گے۔“ ریتو نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”مگر میں نہیں جانا چاہتی یار۔“ نیرو نے نیم دلی سے کہا۔
”بھئی ہوں کیسے نہیں چلے گی اب میں جا رہی ہوں۔ ماما جی سے پوچھتے ہی تمہارے پاس آؤں گی اور ان کو بتا دیں گے۔“ ریتو نے فیصلہ سنا سنا تے ہوئے کہا اور فون اٹھا کر نیچے چلی گئی۔

.....☆☆☆.....
”تمہیں یقین ہے کہ وہ آجائیں گی؟“ سمیرا کی چابی اٹھاتا ہوا بولا۔

”اب وہ آئیں یا نہ آئیں۔ مجھے تو جانا ہی پڑے گا ایک بار بھی پاپا کو بولی جو دیا ہے۔“ روتن بار بار باہر نکل کر گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا وہ بے چینی سے ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔

”تم داپس آؤ گے نا سمیرا۔“ امان اداس سا بیٹھا ہوا تھا۔ کئی دنوں سے قائم گھر کی رونق آج پھر سونے پن میں بدلنے جا رہی تھی۔

”ہاں ہاں۔ آؤں گا کیوں نہیں۔ مگر اس بار بارات لے کر ہی آؤں گا تمہارے شیر میں۔“

سمیرا مسکراتے ہوئے بولا۔
”امان بھائی تم بھی ہمارے ساتھ چلو نا۔ تمہیں کراچی کی بچیاں دکھائیں گے۔“ روتن نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں یار۔ اب تو لڑکیوں سے لگتا ہے کہ دل بھر گیا ہے۔ پتہ نہیں اب کس کے سہارے جیا جائے گا۔“ امان نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔
”میری ماما تو تم شادی کر لو یار۔ بہت ہو چکی صوج مستی۔ اب تم بھی کوئی نخرے دکھانے والی دھونڈ ہی لو۔“ روتن نے آ کر امان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو امان آنکھیں بند کر کے مسکراتے لگا۔

”سمیرا والی کی تو شادی بھی ہو گئی ہوگی۔“
”یہ کیا کہہ رہے ہو بھائی یعنی تمہارا بھی کسی سے کوئی چکر چل چکا ہے؟“ روتن نے حیرت سے پوچھا۔

”کیوں بے چکر کیا صرف تم لوگ ہی چلا سکتے ہو۔ میرا چکر تو اس عمر میں چل گیا تھا جب تم لوگ تین پہیوں والی سائیکل چلاتے ہو گے۔ ہالہا۔“ امان کے مذاق میں بھی اس کے دل کا دورا بھرا آ رہا تھا۔

”اور پھر کیا ہوا؟“ روتن نے اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔

”سب قسمت واسے نہیں ہوتے یار۔ پیار سب کو نہیں ملتا۔“ امان نے اپنی بات پوری کی ہی تھی کہ ریتو دروازے پر نمودار ہوئی۔

اسے دیکھتے ہی سب کا دل خوش ہو گیا مگر روتن اب تک بے چین ہی تھا۔

”وہ نہیں آئی کیا؟“

”اس کے بغیر کیلی آ کر میں کیا کرتی۔ یہ باہر کھڑی ہے۔“ ریتو بولی۔

”ہیلو۔“ باہر آتے ہی روتن نیرو کے مرجھائے ہوئے

ہوئے چہرے کو دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا۔

”تم بھی چل رہی ہونا ہمارے ساتھ۔“

”ہاں ہاں چل رہی ہوں۔ بار بار پوچھ کر منع کروانا چاہتے ہو کیا۔“ ریتو نے جواب دیا۔

”پھر یہ ایسے کیوں کھڑی ہے چپ چاپ۔“

روتن نیرو کے چہرے پر مایوسی دیکھ کر جھجک رہا تھا۔

”آپ اس کے چہرے پر دھیان مت دیں۔ یہ ایسی ہی ہے۔ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گی۔ اب چلو یہاں سے۔“ ریتو نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

”آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا ہم تو تیار ہیں۔“ سمیرا نے کہا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

روتن آگے کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ریتو نے نیرو کو گاڑی کے اندر دھکیلا اور خود بھی بیٹھ گئی۔

”ریتو تھوڑا سرک جاؤ۔ مجھے بھی تو بیٹھنا ہے۔“

روتن کی خوشی اس کی مسکراہٹ سے صاف جھلک رہی تھی۔

”دوسری طرف سے آؤ نا۔“ ریتو مسکرا کر روتن سے بولی۔

مسکراہٹ میں اس کا اشارہ نیرو کے ساتھ بیٹھنے کے لیے تھا۔

”آ..... آپ اب بھر ہی بیٹھ جائیں۔“ روتن کو اپنی طرف والا دروازہ کھولتے دیکھ کر نیرو جلدی سے بولی۔

”چپ چاپ ابھر کھسک لو۔“ نہیں کھائیں جائے گا۔“ ریتو نے کہا اور نیرو کو اپنی طرف بھیج لیا۔

روتن بیٹھ گیا اور امان کو خدا حافظ کہہ کر سمیرا نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

شیر سے باہر نکلنے کے بعد ریتو خود کو ریپس محسوس کر رہی تھی مگر نیرو کے چہرے پر اب بھی ایک اطمینان سا تناؤ بچھایا ہوا تھا۔ وجوہات کئی تھیں۔ گھر والوں کا موڈ اب

تک اٹھ رہا تھا۔ روتن جو خود کو اس کا اپنا بھائی سمجھتی تھی

کر رہا تھا اس کا ساتھ ہونا۔ اور اطمینان منزل کی طرف جاتے ہوئے دل میں طرح طرح کے سوال ہونا۔

ایسا نہیں تھا کہ روتن یا دوسرے لڑکوں کے ساتھ ہونے سے اس کے اندر کسی طرح کا کوئی ڈر تھا۔ وہ تو

تب بھی شاید نہ ہوتا اگر ریتو اس کے ساتھ نہ ہوتی۔ دو چار ملاقاتوں میں ہی وہ روتن کے کردار کو اچھی طرح

سمجھ چکی تھی۔ اس نے اب تک روتن کو نہایت ہی بھولا اور صاف دل لڑکا پایا تھا۔ پھر بھی وہ پریشان ہی تھی۔

آج تک اس کے دل سے یہی آواز نکلی تھی کہ وہ شادی کرنے یا باہر کرنے کے لیے نہیں بنی۔ وہ

چاہے کچھ بھی رہی ہو مگر وہ لڑکوں کے نام سے ہی بدلتی تھی۔ اس نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا کیوں

ہے۔ وہ کیوں دوسری لڑکیوں کی طرح نہیں سوچتی اور آج سے پہلے اس نے اپنے دل کو بھی نفلے کی

ضرورت محسوس نہیں کی تھی مگر آج اس کے دل میں ایک عجیب سی پھل پھلی ہوئی تھی۔

اپنی حقیقت کو لے کر اپنی فطرت کو لے کر اور اپنا نام بدلنے اور روتن کے خواب میں آنے کی بات کو

لے کر۔

”ایسے منہ پھلا کر کیوں بیٹھی ہو باہر دیکھو موسم کتنا اچھا ہے۔“ ریتو نے اس کا دھیان بانٹنے کی کوشش کی۔

نیرو جواب تک ایک تک سامنے والی سیٹ کو گھور رہی تھی چونکہ گرا اپنی نظریں باہر کی طرف گھمائی تھیں۔

مگر چہرے کا تناؤ اب بھی نہیں بدلا تھا۔

”آپ نے کیا سوچ کر میرا سر پھوڑا تھا۔ بھابھی جی۔“ روتن سے مزید چپ نہیں رہا گیا۔

”مجھے نام سے بلاؤ۔“ نیرو نے جھلا کر کہا۔

”اوہ۔ سوری۔ نیرو جی۔“ روتن نے جیسے اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

”نیرو نہیں ہے۔ نیرو نہیں۔“ نیرو نے اس کو پھر

”نہیں اٹکل۔“ ریتو نے پہل کی۔

یو پایا۔ ”آئی لو یو۔“

”جیتی رہو چٹنا۔“ پایا نے پیار سے ریتو کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ریتو کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ ریتو بہت بے کل ہو رہی تھی۔ وہ روہن کے جذبات کی توہین نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر ریتو کے لاکھ سمجھانے کے باوجود اس کے منہ سے پایا لفظ نہیں اٹکل پایا۔ اسی اوہیر بن میں وہ نمستے تک کرنا بھول گئی اور سر جھکائے کھڑی رہی۔ پایا مسکراتے ہوئے کچھ دیر ریتو کو غور سے دیکھتے رہے۔ ریتو کا چہرہ تھا ہی اتنا دلکش کہ کوئی بھی ایک پل کے لیے تو سب کچھ بھول ہی جاتا تھا۔ اچانک جیسے پایا خیالوں کی دنیا سے واپس آئے۔ ”تم اتنی تم سم کیوں ہو بیٹی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ہوں نا تمہارے پایا کی جگہ اور پھر پیار میں اتنی دقتیں تو آتی ہی رہتی ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ جلد ہی میں تمہارے پایا سے بات کر لوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی جوائی کے دن یاد کروا کر میں ان کو منوالوں گا۔“

”جی۔ پایا جی۔“ ریتو کے لب لرز اٹھے۔

روہن کے پایا کے پیار بھرے بول سن کر وہ ان کو بے اختیار پایا کہنے پر مجبور ہو گئی۔

”جیتی رہو میری بیٹی۔“ پایا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”مجھے اپنے اس نالائق بیٹے کی قسمت پر پورا بھروسہ تھا بس تھوڑا بھولا ہے۔ اپنے میں ہی کھویا رہتا تھا آج کل۔ میں اس کے دل کی بات سمجھ نہیں پایا در نہ تمہیں لینے کے لیے خود اتنا اس کے ساتھ۔ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ دن یہ کوئی نہ کوئی ہیرا ڈھونڈ لے گا اپنے لیے اور تم تو میرے سے بھی بڑھ کر ہو بیٹی۔“ پایا نے روہن کی طرف دیکھا اور ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

روہن ایک بار پھر اپنے پایا سے لپٹ گیا۔ ”آئی لو

عجب سی نظروں سے پایا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اودہ ہو۔ تم باہر صوفے پر سونا یا رنگین ہی دن کی تو بات ہے۔ کل کرتے ہیں کچھ اور رو ریتو بھی نہیں رہ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ روہن نے کندھے اچکا دیے۔ ”اچھا اب میں چلتا ہوں مجھے کچھ کام منٹا کر جلدی گھر پہنچنا ہے۔ تمہاری مٹی کو بھی سمجھانا ہے نا۔ کھانا دانا دھنک سے کھا لینا میں صبح آ جاؤں گا۔“ پایا کھڑے ہو گئے۔

”لو کے پایا۔“ روہن نے کہا اور ریتو کے ساتھ ان کو باہر تک چھوڑنے آیا۔

☆☆☆☆

”کیسا لگا تمہیں؟“ ہاتھ دم سے باہر آتے ہی ریتو نے ریتو کو دیکھ کر آ نکھیں منکا میں۔

”کیا کیسا لگا؟“ ریتو نے سر اٹھا کر پوچھا۔ وہ کچھ پریشان سی لگ رہی تھی۔

”یہ سب۔“ ریتو نے بیڈروم میں نظریں گھما کر کہا۔ ”روہن کے پایا اور کیا؟“

”دیکھ ریتو صرف تمہارے کہنے پر میں آنے کے لیے تیار ہو گئی، ٹیلے تک بھی چل پڑوں گی، مگر فیصلہ میرا ہی ہوگا۔ سمجھ گئیں نا تم بار بار یہ باتیں مت کرو کل کو روہن یا اس کے گھر والوں کے جذبات کو کوئی شخص پہنچتی ہے تو اس کی ذمہ داری تیری ہوگی میری نہیں۔“ ریتو نے کہا اور سر جھکا کر اپنے ناخن کریدنے لگی۔

”یہ ٹیلے دیکھنا چکر چھوڑ دیا۔ مجھے تمہارے لیے روہن پسند ہے۔ تم بس جلدی سے اس کو ماں بول دو باقی معاملے ان کے ہاں آج سنبھالیں گے کتنے اچھے لوگ ہیں نا تم یہاں عیش کر رہی عیش شادی نہ کرنے کی عند چھوڑ دو یا۔“ ریتو اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”میں نے کہا نا اب یہ باتیں بند کرو۔“ ریتو بگڑ گئی۔ ”تمہیں کیا لگتا ہے۔ اس سے زیادہ پیار کرنے والا تمہیں مل جائے گا۔ زندگی بھر ڈھونڈنی رہنا پھر۔“ ریتو بھی چڑ گئی۔

”مجھے نہیں چاہیے پیار کرنے والا۔ اب میرا داغ خراب مت کر یا۔“ ریتو نے کہا اور لیٹ کر گروٹ بدل لی۔ ”بھی وردازے پر دستک ہوئی۔ ریتو واپس اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ریتو نے جا کر وردازہ کھولا۔ باہر روہن کھڑا تھا۔

”آؤ بھو جن کر لو۔“

”چلو شیو مجھے بھی بہت بھوک لگی ہے۔“ ریتو جھٹ سے تیار ہو گئی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم ہی کھا لو۔“ ریتو کا موڈ اب تک بگڑا ہوا تھا۔

”چلو نا یا راجھا سوری۔ اب اس بارے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔ آ جاؤ چلو کھڑی ہو جاؤ کھانے کو انکار نہیں کرتے۔“ ریتو نے ریتو کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

”تھوڑی آنا کافی کے بعد وہ تیار ہو گئی اور وہ باہر نکل آئے۔

”یہ سب تمہارا ہی ہے نا روہن۔“ کھانا کھاتے ہوئے ریتو نے پوچھا اور کن اکھیوں سے ریتو کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ روہن نے جواب دیا۔

”تو؟“ ریتو نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی تو سب کچھ پایا کا ہے میں ابھی کچھ کھانا نہیں ہوں بڑھ رہا ہوں۔“ روہن نے صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔

”اودہ میں بھی۔“ اپنی بات اٹھوری چھوڑ کر ہی ریتو نے گلاس کا پانی ایک سانس میں اپنے حلق سے نیچا مار لیا۔

کچھ اسی طرح باتیں اور ہلکا جھکا مذاق کرتے ہوئے سب نے کھانا کھایا اور پھر تیر اور ریتو واپس بیڈ میں گھس گئیں۔

☆☆☆☆

”ریتو“ نیرو نے کہا۔

”ہاں بولو۔ تمہیں کیا پریشانی ہے؟ جو بولنا ہے بول دو اگر تمہیں ہر حال میں ناشی کرنی ہے تو کل صبح ہی واپس چلتے ہیں۔ جتنے دن ہم یہاں رہیں گے بات اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔“ ریتو نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”تم ایک منٹ باہر جاؤ اور ان کو اندر بھیج دو۔ مجھے ان سے کچھ بات کرنی ہے۔“ نیرو دیو لی۔

”ایسی کون سی خاص بات ہے میں بھی نہیں کہتی ہوں نا۔“ ریتو چلی۔

”کہنا یا کر کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ جی تو تمہیں باہر جانے کو بول رہی ہوں۔“ نیرو نے جھٹکا کر کہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ شدید الجھن کا شکار ہے۔

”دیکھ لو۔ کچھ اٹا پلٹا کہہ دیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ ریتو اسے گھورتی ہوئی کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆☆

”ہاں..... نی.....“ روہن خوشی سے اچھلتا ہوا اندر آیا۔ مگر نیرو کا روہن سا چہرہ دیکھ کر اس کی ساری خوشی ہوا ہو گئی۔ ”کک کیا ہوا؟“

”بٹھو۔“ نیرو ایک طرف کو ہوتے ہوئے بولی۔

”کچھ غلط ہو گیا ہے کیا؟“ روہن نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کا دل نیرو کی رونی صورت دیکھ کر بیٹھا جا رہا تھا۔

”یہ..... پیار کیا ہوتا ہے روہن۔“ نیرو نے اپنی

سرلی آواز میں سولل کیا۔

”پیار؟ مجھے کیا پتہ کیا ہوتا ہے پیار؟ مگر مجھنا پتہ ہے کہ مجھے تم اب میرا ہی ایک حصہ لگنے لگی ہو تمہیں دیکھتے ہی دل کا ہر ابرمان کھل اٹھتا ہے۔ بات اب صرف یہاں تک نہیں رہ گئی ہے کہ کسی طرح مجھے پتہ لگ گیا کہ صدیوں پہلے ہم ایک دوسرے کے لیے جیتے اور مرتے تھے نا تب تو کوئی انکار کر کے کہہ دے کہ وہ سب جھوٹ تھا۔ محض خواب تھا تو بھی میں بھی تم سے الگ نہیں ہونا چاہوں گا میں اب تمہارے بغیر زندہ رہی نہیں پاؤں گا سوتا ہوں تو تمہیں سوچتا ہوں جاگتا ہوں تو تمہیں سب سے پہلے یاد کرتا ہوں کھاتے پیتے پتے پتے اٹھتے جاگتے۔ صرف یہی خواب دیکھتا رہتا ہوں کہ کب میرا خواب سچ ہوگا کب تم مجھے اپنا مانو گی کب میں تمہیں اپنا کہہ سکوں گا میرا دل تمہارے ہر روپ کو اپنا مان چکا ہے۔ کوئی اور اب اس دل کو گوارا نہیں ہوگا۔ چاہو تو آزما سکتی ہو۔ اگر تم نہیں رہیں تو جان بھٹے ہی نہ دوں۔ مگر جینے لائق بھی نہیں رہوں گا۔“ روہن جذبات میں بہہ کر بولتا ہی جا رہا تھا۔ اور مزید بولتا رہتا مگر نیرو اس کو نہ دیکھتی تو۔

”مجھے پتہ ہے روہن۔“ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ کوئی قسمت والی ہی ہوگی جو تمہیں شوہر کے روپ میں پائے گی میں تمہیں اچھی طرح جان چکی ہوں مگر کیا کروں؟ پیار نام سے ہی دل میں کلکلاہٹ ہونے لگتی ہے میری بے چینی بڑھ جاتی ہے مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ کیا ہے مگر میرا دل اور دماغ دونوں ہی پیار کے الٹ بولتے ہیں میں نے تمہارے بارے میں سوچنے کی بہت کوشش کی مگر میرا دم سا گھٹنے لگتا ہے ایسا کچھ بھی سوچتے ہوئے لگتا ہے جیسے میں کچھ دیر اور سوچتی رہی تو میرا دم ہی نکل جائے گا مجھے کی کوشش کرو۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں کسی کے ساتھ بھی شادی کرنے کے

بارے میں سوچ سکتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم یا تمہارے گھر والے اپنے دل میں کوئی امید باندھیں اور میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں آج میں چاہا سے ملی کتنا پیار ہے ان کے دل میں کل کو اگر ان کے دل کو نہیں چھنی تو میں تو جیتے جی ہی مر جاؤں گی پلیز روہن مجھے کل ہی واپس بھیج دو میں نہیں رہ سکتی یہاں میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔“ بولتے بولتے نیرو کی آواز بھاری ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

روہن سے کچھ بھی بولنا نہیں جا رہا تھا۔ کچھ دیر نیرو کو تنگی باندھ دیکھتا رہا اور پھر اٹھ کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆

محل میں ہر طرف افراتفری اور اپاؤ تھا پانی کا ماحول تھا۔ شہر کے قریب سنسان پڑا رہنے والا بڑا سا میدان میدان جنگ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ رہ رہ کر ٹل ٹل آنے والی ہاتھیوں کی چیخاٹھٹ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور اپنی جان جو حکم میں ڈال کر لڑائی میں اپنی جان جو تک دینے والے سپاہیوں کی آدویکار اور ان سب سے مل کر پیدا ہونے والی دہشت سے کل میں موجود ہر شخص کی روح تک کانپ رہی تھی۔

”ماتا شری۔ کیا ہم دشمنوں پر فتح پا سکیں گے؟“ سنگھان پریشی راج کمار کی نے راج ماتا سے پوچھا۔ بے پناہ حسن کی مالک اس راج کمار کی کا مہر جھایا ہوا چہرہ اس گھڑی میں بھی یوں ماتی کے چاند کی طرح دنگ رہا تھا۔

”بھگوان پر دوشاں رکھو راج کمار۔“ وہ سب ٹھیک کر دیں گے۔“ راج ماتا کے چہرے پر پرچھیا ہوا عجیب سا سناٹا اس کے الفاظ سے میل نہیں کھا رہا تھا۔ پھر بھی وہ جی کو دلا سے بے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہی تھیں۔

”مگر ہمارے پاس کیول ایک ہزار سینک ہیں جبکہ ان کے لشکر میں چار ہزار۔ ہم کیسے جیتیں گے

ماتا شری۔“ راج کمار کی پر یاد دہانی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”تم تھوڑا آرام کرو پتہ ہی۔ تھوڑی دیر نہ لے لو۔ کل رات سے تم نے ہلک تک نہیں بچھکا کی ہے۔ سو جاؤ اور بھگوان پر دوشاں رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ راج ماتا نے پھر سے اس کو جھوٹا دلا سے دینے کی کوشش کی۔ ”ہم کیسے سو جائیں؟ ماتا؟ وہاں دن بھوی میں..... وہ..... ہمارے دیو۔ کل رات سے ہی یہ بھوی میں ہیں۔ انہوں نے ہم سے وعدہ کیا ہے لوٹ کر آنے کا۔ پرتو وہ اب تک نہیں آئے۔ ہم انہیں دیکھنے بنا کیسے سو جائیں؟“ راج کمار کی کے سینے میں نیس سی اٹھی۔

”تم پھر اس کا نام لے رہی ہو۔ کتنی بار سمجھایا ہے جی تم ایک راج کمار کی ہو تمہارا دیو کسی راج کمار سے ہی ہوگا۔ اب تم اس کا انتظار چھوڑ دو مان لو میری بات۔“ راج ماتا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر پرچھیا کے گالوں کو چھونے کی کوشش کی۔ مگر دھڑک کر ان سے دور ہو گئی۔ ”نہیں! ہم کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے، ہمیں یقین ہے وہ آکر ہمیں لے جائیں گے یہاں سے راج محل میں کسی میں اتنی طاقت نہیں جو ان کا راستہ روک سکے اور نہ ہی آپ کے کسی راج کمار میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت ہے آپ دیکھ لیتا۔“ پر یاد دہانی ملتی ہوئی بولی اور اٹھ کر راج محل کے باہر جانے والے راستے کی طرف بھاگی۔

”ارے پکڑو اسے۔“ راج ماتا نے کہا اور غلاموں نے فوراً ان کی آگیا کا پالٹن کیا۔ ”مان جا بیٹی ورنہ ہمیں آپ کو پھر سے بیڈیوں میں جکڑنا پڑے گا۔“ راج ماتا نے پیار سے اس کو پکڑا کرتے ہوئے کہا۔

”باندھ دو مجھے۔ ہنالو بندی۔ مگر تم سب دیکھنا جب میرا دیو آئے گا تو تمہارے سارے پہرے بیکار جائیں گے تمہاری ساری بیڑیاں کٹ جائیں گی

کر جو کرنا ہے تمہیں۔“ پر پاجلا چلا کر کہہ رہی تھی۔
 راج مانتا ہے یہ مشکل بنتی کر کے راج کماری کو
 پرسکون کر کے پھر سے بٹھایا۔ مگر اس کی آنکھوں میں
 سکون نہیں تھا۔ اس کے ارمان پرسکون نہیں تھے۔ اس
 کے دبو نے لوٹ کر آنے کا وعدہ کیا تھا اور اسے دھواں
 تھا کہ بھگوان بھی اسے وعدہ پورا کرنے سے نہیں روک
 سکتے۔ اس کے کان دبو کے قدموں کی آہٹ سننے کو
 بے تاب تھے۔ اس کی نظریں دبو کے روشن کی پیاسی
 تھیں۔ دبو کے انتظار میں تڑپتی رہی پر پاجلا کی آنکھوں
 کے سامنے وہ خوب صورت لمحہ دوڑ گیا جب اپنی
 سہیلیوں کے ساتھ باغ میں اٹھکیلیاں کرتے ہوئے
 اس نے بولی بارو کو دیکھا تھا۔
 ”یہ جیانا جو ان کون ہے ری؟“ پر پاجلا نے اپنی
 سہیلیوں سے پوچھا۔
 ”آپ ان کو نہیں جانتیں راج کماری؟“ تاتنے
 حیرت سے پر پاجلا کی طرف دیکھا۔
 ”نہیں تو۔ میں کیوں جانوں گی اس کو؟ اسی کیا
 خاص بات ہے اس میں؟“ پر پاجلا نے ایک بار پھر اس
 نو جوان کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”ارے آپ وہیں تو تھیں جب اس شور ویر نے
 آس پڑوس کے دیوڑوں سے آئے راج کماریوں کو
 ایک ایک کر کے تلوار بازی کے مقابلے میں شکست
 دی تھی۔ اسی نے تو ہمارے راجہ کی لاج بچائی تھی۔
 آپ کو یاد نہیں ہے کیا۔“ تاتنے راج کماری کو یاد دلانے
 کی کوشش کی۔
 ”اوہ..... مگر یہ تو بڑا ہی سندھ ہے۔ ایک دم من
 موہن۔ اس دن ہم نے اسے غور سے نہیں دیکھا
 تھا۔“ پر پاجلا کی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی۔
 ”شور ویر کیا سندھ نہیں ہو سکتے راج کماری؟ جا
 نے کوئی ہی بالیکا میں اس کے پیچھے اپنا دل لیے گھومتی

ہیں۔ مگر یہ کسی کو گھاس نہیں ڈالت۔“ تاتنے اپنے سینے
 پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔
 ”اچھا! کیا نام ہے اس کا۔“ پر پاجلا نے مسکراتے
 ہوئے پوچھا۔
 ”دیو۔“ تاتنے بتایا۔
 ”ہوں۔ دیو! ذرا اسے بلانا تو۔“ راج کماری نے
 حکم دیا۔
 ”جی راج کماری جی۔“ سہیلیوں میں سے ایک
 نے کہا اور دیو کی طرف چل دی۔
 ”کیا ہو رہا ہے سینا پتی دیو۔“ سکھی نے جا کر
 پہلے پیار سے دوبا میں کرنے کی سوچی۔
 دیو نے نظریں ترچھی کر کے اسے دیکھا اور واپس
 اپنی تلوار کی دھار تھمر کرنے میں جٹ گیا۔ کچھ بولا
 نہیں۔
 ”آپ کی سنائی نہیں دیتا کیا؟“ سکھی نے تڑپ کر
 پوچھا۔
 ”دکھائی نہیں دیتا کیا؟“ دیو نے تلوار اٹھا کر اس کو
 دکھائی اور واپس اپنے کام میں لگ گیا۔
 ”آپ کو راج کماری پر پاجلا درستی بلا رہی ہیں۔“
 سکھی نے غم دلی سے کہا۔
 ”کیوں؟“ دیو اس کی باتوں پر کچھ خاص دھیان
 نہیں دے رہا تھا۔
 ”تم پر دل آگیا ہے ان کا۔“
 ”اچھا۔“ راجہ بے پردائی سے بولا۔
 ”مذاق کر رہی ہوں۔ میری شکایت مت کر دینا۔
 مگر وہ سچ میں آپ کو بلا رہی ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے۔ بول دو میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں
 ۔“ دیو نے کہا اور اپنی تلوار کو گل بنے پر گھسٹ رہا۔

 ”یہ کہا اس نے تم نے کہا نہیں کہ ہم نے بلایا

ہے۔“ راج کماری تلملا اٹھی۔
 ”بولتا تھا راج کماری مگر مہاراج کی کرپا سے سینا
 پتی بننے کے بعد یہ اور زیادہ ڈھیٹ ہو گیا ہے۔“ سکھی
 نے خفگی کرتے ہوئے کہا۔
 ”اوہ تو یہ سینا پتی ہے اب۔“ راج کماری بولی۔
 ”جی راج کماری جی۔ مہاراج نے مقابلے کے
 اگلے دن ہی ان کو سینا پتی بنانے کا اعلان کر دیا تھا۔“
 ”ہوں میں دیکھتی ہوں اسے۔“ راج کماری نے
 چڑ کر کہا اور اپنی سہیلیوں کو ساتھ لے کر واپس چلی گئی۔

 ”پتاشری۔“ پر پاشام کو مہاراج کے پاس تھی۔
 ”ہاں راج کماری۔“ مہاراج نے بات سننے کے
 لیے بڑے پریم سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”آپ کو نہیں لگتا کہ آپ نے اپنے سینا پتی کو کچھ
 زیادہ ہی سر پر چڑھا رکھا ہے۔“ پر پاجلا نے شکایتی لہجے
 میں کہا۔
 ”کیوں؟ کیا ہوا بیٹی؟“ مہاراج بات کو توجہ سے
 سننے کے لیے اس کی طرف جھکے ہوئے بولے۔
 ”کیا ہوا کیا کل ہم نے باغ میں کچھ آم توڑنے
 کے لیے اپنی سکھی کے ذریعے اس کو بلایا تھا۔ کہنے لگا
 میں تھوڑی دیر میں آؤں گا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات
 ہوئی؟“ راج کماری کے چہرے پر ہلکا سا غصہ اور ڈھیر
 ساری ناراضگی تھی۔
 ”ہا..... کیا اس کو پتہ تھا کہ راج کماری جی نے
 بلایا ہے؟“ مہاراج نے بات کو مذاق میں لیتے
 ہوئے پوچھا۔
 ”اور نہیں تو کیا۔“ سکھی کا کہنا ہے کہ اس نے اچھی
 طرح سے اس کو میرا حکم سنایا تھا مگر آپ ایسے کیوں
 ہنس رہے ہیں؟ میں مذاق نہیں کر رہی۔“
 ”ہنس نہیں رہا ہوں بیٹی کیا تمہیں پتہ ہے کہ اس

سے بڑھ کر ماہر تلوار باز اور مہیا ہمارے پورے راجہ
 میں تو کیا آس پڑوس کے بڑے بڑے راجہوں میں
 بھی نہیں ہے تم نے شاہی تلوار بازی کے مقابلے میں
 اس کے جو ہر تودیکھے ہی ہوں گے۔“
 ”تو کیا ہوا پتاشری؟ اس کے جوہر اسے راج محل
 کی ٹافریا کی اجازت تو نہیں دے سکتے تات۔“
 ”سنو تو راج کماری۔ یہ حق خود میں نے اسے دیا
 ہے۔ میں نے مقابلے میں فتح کے بعد اسے ملنے
 کے لیے بلایا تھا۔ میں نے اس سے کہا تم جیسا بہادر
 فوج میں بھرتی ہو کر دیش کی سیوا کیوں نہیں کرتا؟ تو
 اس نے کہا کہ میری یہ تلوار میرا پیار ہے مہاراج میں
 اسے کسی بے گناہ کے خون سے نہیں رنگنا چاہتا۔“
 ”پھر..... پھر آپ نے کیا کہا۔“ پر پاجلا نے تجسس
 سے پوچھا۔
 ”میں نے کہا۔ ہم نے سکھی کسی بے تصور کا ہونے
 بہایا۔ مگر نا انصافی اور ظلم کے آگے بھی جھکنے بھی نہیں
 ٹھیک اگر کل کو کوئی تم پر حملہ کر دے تو تم کیا کرو گے؟ اس
 نے نہایت سکون نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں
 آپ کی بات سمجھ رہا ہوں مہاراج۔ مگر راجہوں کے بیچ
 بدھ جتنا کے لیے بہت بھاری پڑ جاتے ہیں۔ ایسی
 جنگیں تو صرف راجاؤں کی شان اور ان کی راج گدی کو
 محفوظ رکھنے کے لیے ہوتی ہیں ایسی جنگوں میں صرف
 راجاؤں کا فحی مفاد ہوتا ہے۔ پیچھے سپاہی تو اپنے راجا
 کے حکم کے بوجھ تلے دب کر اس کے مفاد اور لالچ کا
 جھنڈا اٹھانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مگر میں تو ایسا جھنڈا
 اٹھا سکتا ہوں اور نہ ہی ایسا جھنڈا اٹھائے نزدوش
 سپاہیوں کا قتل کر سکتا ہوں۔“ مہاراج نے راج کماری پر پاجلا
 درستی کو دیو کے خیالات کے بارے میں بتایا۔
 راج کماری اس بہادر کے خیالات سے بہت متاثر
 نظر آ رہی تھی۔ ”پھر کیا ہوا پتاشری؟“

”میری تو خود یہی تمنا رہی ہے بٹی کہ پوری دھرتی پر امن اور سکھ چین کا بسیرا ہو۔“ مہاراج نے اتنا ہی کہا تھا کہ پرانے ان کو روک دیا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں یہ بتائیے کہ آپ نے اسے کیا جواب دیا اور پھر اس نے کیا کہا۔ پوری بات بتائیے نا۔“

”ہوں۔“ مہاراج نے کہا۔ ”میں نے کہا مجھے خوشی ہے کہ میرے راجہ میں ایسی سوچ بچل پھول رہی ہے۔ میں نے اسے کہا کہ میں دیش کی حفاظت کی باگ ڈور ایسے ہی نوجوانوں کے ہاتھوں میں سونپنا چاہتا ہوں جو جنگ کی مجبوری اور ظلم و نا انصافی کو سمجھتا ہو۔ میں نے اس کے سامنے سینا پتی بننے کی پیش کش رکھی۔ پہلے اس نے کچھ ٹال مٹول کی مگر میرے زور دینے پر وہ راضی ہو گیا لیکن اس کے لیے اس کی کچھ شرطیں تھیں انہی میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس کو بھی کوئی حکم نہیں دیا جائے گا۔ وہ صورت حال کے مطابق اپنے فیصلے خود کرے گا۔“

پریا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”پھر پتا شری۔ آپ نے اس کی شرطیں مان لیں؟“

”ہاں۔“ مہاراج مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وہ تھوڑا اکڑ مزاج ہے۔ مگر گلاب کے پودے سے کلیاں پختے کے لیے ہمیں کانٹے بھی قبول کرنے پڑتے ہی ہیں۔ وہ ہمارے راجہ کا بیش قیمت ہیرا ہے صرف اس کی بہادری اور جوہری وجہ سے ایسا نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کی سوچ۔ اس کے خیالات اور اس کے تصورات بھی بہت اعلیٰ معیار کے ہیں۔ میں اس سے دو چار بار ہی ملتا ہوں مگر خود میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔“

پریا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”پھر پتا شری۔ آپ نے اس کی شرطیں مان لیں؟“

”ہاں۔“ مہاراج مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وہ تھوڑا اکڑ مزاج ہے۔ مگر گلاب کے پودے سے کلیاں پختے کے لیے ہمیں کانٹے بھی قبول کرنے پڑتے ہی ہیں۔ وہ ہمارے راجہ کا بیش قیمت ہیرا ہے صرف اس کی بہادری اور جوہری وجہ سے ایسا نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کی سوچ۔ اس کے خیالات اور اس کے تصورات بھی بہت اعلیٰ معیار کے ہیں۔ میں اس سے دو چار بار ہی ملتا ہوں مگر خود میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔“

پریا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”پھر پتا شری۔ آپ نے اس کی شرطیں مان لیں؟“

”ہاں۔“ مہاراج مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وہ تھوڑا اکڑ مزاج ہے۔ مگر گلاب کے پودے سے کلیاں پختے کے لیے ہمیں کانٹے بھی قبول کرنے پڑتے ہی ہیں۔ وہ ہمارے راجہ کا بیش قیمت ہیرا ہے صرف اس کی بہادری اور جوہری وجہ سے ایسا نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کی سوچ۔ اس کے خیالات اور اس کے تصورات بھی بہت اعلیٰ معیار کے ہیں۔ میں اس سے دو چار بار ہی ملتا ہوں مگر خود میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔“

پریا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”پھر پتا شری۔ آپ نے اس کی شرطیں مان لیں؟“

”ہاں۔“ مہاراج مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وہ تھوڑا اکڑ مزاج ہے۔ مگر گلاب کے پودے سے کلیاں پختے کے لیے ہمیں کانٹے بھی قبول کرنے پڑتے ہی ہیں۔ وہ ہمارے راجہ کا بیش قیمت ہیرا ہے صرف اس کی بہادری اور جوہری وجہ سے ایسا نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کی سوچ۔ اس کے خیالات اور اس کے تصورات بھی بہت اعلیٰ معیار کے ہیں۔ میں اس سے دو چار بار ہی ملتا ہوں مگر خود میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔“

پریا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”پھر پتا شری۔ آپ نے اس کی شرطیں مان لیں؟“

”ہاں۔“ مہاراج مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وہ تھوڑا اکڑ مزاج ہے۔ مگر گلاب کے پودے سے کلیاں پختے کے لیے ہمیں کانٹے بھی قبول کرنے پڑتے ہی ہیں۔ وہ ہمارے راجہ کا بیش قیمت ہیرا ہے صرف اس کی بہادری اور جوہری وجہ سے ایسا نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کی سوچ۔ اس کے خیالات اور اس کے تصورات بھی بہت اعلیٰ معیار کے ہیں۔ میں اس سے دو چار بار ہی ملتا ہوں مگر خود میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔“

پریا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”پھر پتا شری۔ آپ نے اس کی شرطیں مان لیں؟“

”ہاں۔“ مہاراج مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وہ تھوڑا اکڑ مزاج ہے۔ مگر گلاب کے پودے سے کلیاں پختے کے لیے ہمیں کانٹے بھی قبول کرنے پڑتے ہی ہیں۔ وہ ہمارے راجہ کا بیش قیمت ہیرا ہے صرف اس کی بہادری اور جوہری وجہ سے ایسا نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کی سوچ۔ اس کے خیالات اور اس کے تصورات بھی بہت اعلیٰ معیار کے ہیں۔ میں اس سے دو چار بار ہی ملتا ہوں مگر خود میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔“

پریا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”پھر پتا شری۔ آپ نے اس کی شرطیں مان لیں؟“

”ہاں۔“ مہاراج مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وہ تھوڑا اکڑ مزاج ہے۔ مگر گلاب کے پودے سے کلیاں پختے کے لیے ہمیں کانٹے بھی قبول کرنے پڑتے ہی ہیں۔ وہ ہمارے راجہ کا بیش قیمت ہیرا ہے صرف اس کی بہادری اور جوہری وجہ سے ایسا نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کی سوچ۔ اس کے خیالات اور اس کے تصورات بھی بہت اعلیٰ معیار کے ہیں۔ میں اس سے دو چار بار ہی ملتا ہوں مگر خود میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔“

پریا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”پھر پتا شری۔ آپ نے اس کی شرطیں مان لیں؟“

”ہاں۔“ مہاراج مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وہ تھوڑا اکڑ مزاج ہے۔ مگر گلاب کے پودے سے کلیاں پختے کے لیے ہمیں کانٹے بھی قبول کرنے پڑتے ہی ہیں۔ وہ ہمارے راجہ کا بیش قیمت ہیرا ہے صرف اس کی بہادری اور جوہری وجہ سے ایسا نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کی سوچ۔ اس کے خیالات اور اس کے تصورات بھی بہت اعلیٰ معیار کے ہیں۔ میں اس سے دو چار بار ہی ملتا ہوں مگر خود میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔“

پریا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”پھر پتا شری۔ آپ نے اس کی شرطیں مان لیں؟“

”ہاں۔“ مہاراج مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وہ تھوڑا اکڑ مزاج ہے۔ مگر گلاب کے پودے سے کلیاں پختے کے لیے ہمیں کانٹے بھی قبول کرنے پڑتے ہی ہیں۔ وہ ہمارے راجہ کا بیش قیمت ہیرا ہے صرف اس کی بہادری اور جوہری وجہ سے ایسا نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کی سوچ۔ اس کے خیالات اور اس کے تصورات بھی بہت اعلیٰ معیار کے ہیں۔ میں اس سے دو چار بار ہی ملتا ہوں مگر خود میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔“

پریا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”پھر پتا شری۔ آپ نے اس کی شرطیں مان لیں؟“

”ہاں۔“ مہاراج مسکراتے ہوئے بولے۔ ”وہ تھوڑا اکڑ مزاج ہے۔ مگر گلاب کے پودے سے کلیاں پختے کے لیے ہمیں کانٹے بھی قبول کرنے پڑتے ہی ہیں۔ وہ ہمارے راجہ کا بیش قیمت ہیرا ہے صرف اس کی بہادری اور جوہری وجہ سے ایسا نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس کی سوچ۔ اس کے خیالات اور اس کے تصورات بھی بہت اعلیٰ معیار کے ہیں۔ میں اس سے دو چار بار ہی ملتا ہوں مگر خود میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔“

”شاید ان کو نگاہوں میں ٹھٹھکیں محسوس ہوتی ہوگی۔“ لڑا نے راج بھکاری کے سوال کا جواب دیا۔
 ”ٹھیک ہے۔ اب تم واپس جاؤ۔ ہم خود واپس آ جائیں گے۔“ پریا نے مسکرا کر کہا۔
 ”مگر راج بھکاری جی! آپ کو اکیسے چھوڑ کر؟“ لڑا ڈرتی ہوئی بولی۔
 ”ہم کسی دشمن کے گھر نہیں جا رہے۔ اپنے سینا جی کے پاس جا رہے ہیں۔ تم اپنے گھر نہیں ہی رہنا۔ جاتے ہوئے ہم نہیں لیتے جائیں گے۔“ پریا نے کہا اور اندر داخل ہوئی۔

.....
 پریا جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی۔ دیو اسے گھر کے چھوٹے سے آگن میں ہی مل گیا۔ وہ چوہے پر کھانا پکا رہا تھا۔ پریا کو یہ دیکھ کر حیرت سی ہوئی۔ وہ دور سے ہی دیکھ رہی تھی کہ دیو کی نظر اس پر پڑ گئی ہے۔ اس نے تو بے سے روٹی اتاری اور ادب سے اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔
 ”جی کیسے؟“ لڑا اس کے نام پر اس کے بدن پر صرف ایک ڈھونپی ہی تھی۔
 چوہے کی پیش سے سینے کی بوتل اس کے سرخ چہرے سے پھسلتی ہوئی کچھ اس کے سخت جان سینے پر اور کچھ ٹپک ٹپک کر نیچے گر رہی تھیں۔ کسرت اور رکھ رکھاؤ نے اس کے بدن کو مرنے جیسا بنا دیا تھا۔ اس کا بدن اتنا گولش تھا کہ ایک پل کو تو پریا اس میں ہی کھو کر سب کچھ بھول گئی۔ اس کی خاموشی کو توڑنے کے لیے دیو کو ہی دوبارہ مخاطب ہونا پڑا۔
 ”میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

پریا ہز بھائی۔ ”ہوں وہ۔“ میں..... آپ یہاں اکیلے ہی رہتے ہیں کیا؟“ پریا کو آخر کچھ حوجہ ہی گیا۔
 ”نہیں۔ میرا کیا لپاں بھی میرے ساتھ ہی رہتا

ہے۔ آپ یہاں آنے کی وجہ بتائیں گی کیا؟“ دیو نے مسکرا کر جواب دیا۔
 ”آ..... آپ..... ہم..... مجھے جانتے ہیں کیا؟“ پریا کو لگا کہ رانا کا پہناوا یہاں کام نہیں آیا۔
 دیو اتنی عزت سے بات کر رہا تھا کہ اس کو یہی لگا کہ دیو نے اس کو پہچان لیا ہے۔

دیو نے کچھ دیر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔
 ”لگتا ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی نہیں دیکھا ہے۔ مگر یہ میرا وہم بھی ہو سکتا ہے شاید میں کھانا بنا رہا ہوں کوئی کام ہے تو جلدی بتائیے۔“
 پریا کچھ نہیں بولی۔ ایک تک اسے دیکھتی رہی۔
 کچھ پل اور وہاں کھڑے رہنے کے بعد دیو واپس لوٹ گیا اپنے چوہے پر۔

.....
 تھوڑی دیر بعد دیو نے واپس مڑ کر دیکھا۔ پریا وہیں کھڑی تھی۔ دیو کے ماتھے پر سلوٹس بڑھ گئیں۔
 ”آپ بتائیں گی بھی کہ بات کیا ہے؟“ پریا دھیر سے دھیر سے چلتی ہوئی دیو کے پاس جا پہنچی۔
 ”سنائے آپ اس دراجیہ کے بیٹا جی ہیں۔ پھر خود یہ کشت کیوں اٹھا رہے ہیں آپ نوکر جا کر بھی تو رکھ سکتے ہیں یہ گھر بڑا ہوا سکتے ہیں آرام سے رہ سکتے ہیں آپ۔“
 دیو نے چوہے کی آگ بجھا کر اپنی بنائی ہوئیں روٹیاں اٹھائیں اور اندر کی طرف چل پڑا۔
 کچھ بولا نہیں۔

پریا بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی دروازے کی چوکت پر آ کر کھڑی ہوئی۔ دروازہ بھی برائے نام ہی تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ چھت کے نیچے جانے کا راستہ تھا بس۔

دیو نے زمین پر جٹائی، چھائی اور کھڑا ہو کر پھر سے پریا کی طرف دیکھا۔

”بھوجن کریں گی آپ؟“

”ہاں۔“ پریا نے جھٹ سے کہا اور اندر چٹائی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ دیو اس کے جواب دینے کے انداز پر مسکرائے۔ بنائیں رہ سکا۔
 پریا کی ہاں میں کوئی لاگ لپٹ نہیں تھی۔ کوئی جھجک نہیں تھی اس نے تو اس طرح ہاں کہہ دیا جیسے کسی نے اس کے اپنے ہی گھر میں پوچھ لیا ہو۔ تم سے کم شکریہ ہی کہہ دیتی۔

”آؤ بیٹھو۔“ دیو نے ایک بار پھر مسکرا کر کہا اور بیچ میں کھانا رکھ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔
 پریا کھانا کھاتے ہوئے بیچ بیچ میں رک کر دیو کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ نہ جانے کیسے نہ جانے کیوں مگر دیو اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ کھانے میں بھی اس کو ایک عجیب طرح کی محسوس لگی ایک عجیب سے اپنے پن کی محسوس۔

”آپ بھوکے رہ گئے ہوں گے۔“ پریا کھانے کے بعد دیو کو نوکر کر دیکھ رہی تھی۔
 دیو کھلکھلا کر ہنسا۔ ”یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہئے تھا نا! خیر میں بھوکا نہیں رہا میری گائے ضرور بھوئی رہ گئی۔ آپ نے اس کے حصے کا کھانا کھالیا ہے۔“ دیو نے انگلی سے گھر کے پچھواڑے بندھی گائے کی طرف اشارہ کیا۔ ”کوئی بات نہیں۔ میں اور بنا لوں گا۔“ دیو ہنستا ہوا بولا اور برتن اٹھا کر باہر چل دیا۔

”آپ نے بتایا نہیں آپ یہ سب خود کیوں کرتے ہیں؟“ پریا بھی اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی۔
 ”اس لیے کہ مجھے آتا ہے۔ سب کچھ خود کرنا اور مجھے اچھا لگتا ہے یہ سب خود اپنے ہاتھ سے کرنا۔ اس لیے۔“ دیو نے کہا اور باہر آگن میں حوض کے پاس برتن رکھ دیئے۔ ”لیکن آپ نے ابھی تک نہیں بتایا کہ آپ کون ہیں اور یہاں کیوں آئی ہیں؟“

”پتہ نہیں کیا میں کل پھر آ سکتی ہوں؟“ پریا نے آدھے سوال کا جواب دیا اور ایک سوال پوچھ لیا۔
 ”اگر کھانا کھانے ہی آرہی ہیں تو پہلے بتا دیجیے۔ میں پہلے سے زیادہ تیار کر کے رکھوں گا۔“ دیو نے ہنس کر کہا۔
 ”ہاں۔ کھانا بھی کھائیں گے۔“ پریا مسکرا کر بولی اور باہر نکل گئی۔

.....
 ”راج بھکاری کہاں ہیں؟“ راج ماتا نے پریا پر دشتی کے کمرے کے دروازے پر کھڑی داسی سے سوال کیا۔
 ”وہ مہارانی! وہ۔“ داسی کے چہرے پر خوف کی لکیریں واضح ہو گئیں۔
 ”کہاں ہیں راج بھکاری۔“ داسی کو ہکلاتا دیکھ کر راج ماتا کا ماتھا اٹھکا۔

”وہ ہم نے راج بھکاری کو روکنے کی کوشش کی تھی مہارانی۔ مگر انہوں نے ہماری بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ۔“ رسوئی گھر میں ہیں۔“ داسی نے سر جھکائے ایک ایک کر اپنی بات کہی۔
 ”رسوئی گھر میں؟ وہاں جانے کی ان کو کیا ضرورت پڑ گئی۔“ راج ماتا تیزی سے رسوئی گھر کی طرف بڑھیں۔
 ”آپ خود ہی جان لیجئے مہارانی۔“ داسی ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔

.....
 راج بھکاری پریا رسوئی گھر میں اپنی لنگی کو دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں دبوچے کھڑی تھی۔ راج ماتا کو دیکھتے ہی پریا مسکرائے گی۔
 ”ماتاشری۔“
 ”یہاں کیا کر رہی ہو تم؟ اور یہ..... یہ کیا کر لیا۔“ راج ماتا نے ناراضگی بھرے لہجے میں پوچھا۔

اور چنوتی ہی کیا دی ایک ایک کر کے اس نے جس طرح سارے راجکماروں کی ناک کاٹی۔ اس سے ہمیں شک ہے کہ شاید ہی کوئی امیدوار سوئسر میں آئے گا۔ دوسرے یہ کہ روایت کے مطابق ہم سوئسر کو صرف راجکماروں تک محدود نہیں رکھ سکتے۔ ہر سپاہی کو اس میں حصہ لینے کا حق ہوتا ہے۔ اور دوسری سپاہی ہی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ کوئی اس کے سامنے ٹک پائے گا وہ ایک سچا انسان ہے بیٹی۔ اس سے کسی کا جیت جانا مشکل ہے۔ مگر ہاں ہم اس سے بات کر کے سوئسر میں بھاگ نہ لینے کے لیے منا سکتے ہیں۔ اگر ایسا ممکن ہو گیا تو میں اس پر دستِ باری کر سکتا ہوں۔“ مہاراج نے اپنے دل کی بات اس کے سامنے رکھ دی۔

”ہمیں ابھی دیوانہ نہیں کرنا پتا شری۔“ اپنے غصے اور ناراضگی کو راجکماروں پر صرف یہی کہہ کر نکال پالی۔

دیو چٹائی اپنے سامنے بھوجن لگا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر نظریں جھکائے دل ہی دل میں مسکراتا رہا اور پھر باہر کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اسے کسی کا انتظار تھا۔ شاید راجکماروں کا حالانکہ راجکماروں کے آنے کی توقع نہیں تھی اور نہ ہی وہ آج پھر آنے کا وعدہ کر کے گئی تھی۔ مگر پھر بھی جانے کیوں دیو کی آنکھیں اس کے آنے کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ راجکماروں کی پچھلے پندرہ دنوں میں اب تک پانچ بار دیو کے گھر آ چکی تھی اور اس کے لیے راج کماروں کی راج محل سے باہر نکلنے کے لیے موقع کی تلاش میں رہتی تھی اور سیدھی اپنے دل میں بسے دیو کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ دیو کو اب اس کا آنا برا نہیں لگتا تھا۔ بلکہ اب وہ روزانہ نین لوگوں کا بھوجن تیار کرتا تھا۔ راجکماروں آئے یا نہ آئے۔ دیو کو احساس تھا کہ وہ انجان لڑکی اس کے پیار

جیسے گھر میں کیوں رہتا ہے؟“ راجکماروں اس وقت مہاراج کے سامنے بیٹھی تھی۔ مہاراج اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ”مگر آپ کو کیسے پتہ راجکماروں؟“ ”وہ ہمیں ہماری سیمپلی نے بتایا ہے۔ اس کا گھر ان کے پاس ہی ہے۔“ راج کماروں نے بڑی صفائی سے جھوٹ بول دیا۔

”ہوں۔“ مہاراج نے بولنے سے پہلے ایک لمبی سانس لی۔ ”ہم نے آپ کو بتایا تھا کہ بیٹا پتی کے عہدے کو قبول کرنے سے پہلے اس نے ہمارے سامنے کچھ شرطیں رکھی تھیں۔ اس کا اپنے پرانے گھر میں ہی رہنا اور کوئی شاہی دیدہ نہ لینا ہی وہ شرطیں تھیں بیٹی۔ ہمیں بھی یہ سب کچھ عجیب لگا تھا۔ مگر دل سے کہوں تو ہم اس کی اس مہمان سوچ کو سراہ کر رہے ہیں۔ ایسے سچے لوگ اب کہاں رہے ہیں بیٹی خیر ہم نے انہیں کسی خاص وجہ سے یہاں بلایا ہے۔“

”یو لیے پتا شری۔“ راجکماروں نے ادب سے کہا۔ ”پڑوس کے ہمارے دوست راجا کی طرف سے ان کے بیٹے ابھی کے ساتھ آپ کے دیوانہ کا پیغام آیا ہے۔ ہم اس بارے میں آپ کی رضا جانتا چاہتے ہیں۔“ مہاراج نے خوشدلی سے اپنی بات پوری کی۔ یہ سن کر راجکماروں ایک دم سوچ میں پڑ گئی۔ کل کے واقعے نے اس کی سوچ اور سہنوں کو پوری طرح سے بدل دیا تھا۔

”آپ سوئسر کیوں نہیں کروا لیتے پتا شری؟ جیسے تلوار بازی۔“ مہاراج پر یا کی بات سن کر ہنسنے لگے۔ ”ہم نے خود پہلے ایسا ہی سوچا تھا۔ راجکماروں۔ مگر اس دن جس طرح راجکمار کے ہار جانے کے بعد توہین محسوس کر کے دیو نے کھلے عام سب کو چنوتی دی

”وہ ہم۔“ بھوجن تیار کرنا سیکھ رہے تھے مانا شری۔ بلکی سی چھری لگ گئی ہے۔“ پریا نے ان کی ناراضگی کو بھانپ کر اپنا سر جھکا لیا۔

”بھوجن تیار کرنا؟“ راج مانا نے حیرت سے کہا۔ ”تمہیں اس میں کب سے دلچسپی ہونے لگی اور پھر تمہیں یہ سب سیکھنے کی کیا ضرورت ہے پریا تمہارے ہر حکم کو پورا کرنے کے لیے تمہارے پاس ہمیشہ سیکڑوں نوکر چاکر رہیں گے چھوڑو یہ سب۔“ راج مانا نے غصے ہو کر کہا اور اسے باہر لے کر آتے ہوئے داسی کو آواز دی۔ ”دیدہ کی کو بلاؤ راج کماروں کا ہاتھ کٹ گیا ہے۔“

”مگر مانا شری ہمیں خود کام کرنا اچھا لگتا ہے۔“ بھگوان نے ہمیں بھی تو وہ ہاتھ دینے ہیں کام کرنے کے لیے۔“ کہتے ہوئے پریا کے سامنے دیو کا چہرہ گھومنے لگا۔

”یہ بھوت تم پر کب اور کیسے سوار ہو گیا؟ ہم اس راجہ کے مالک ہیں ہم حکومت کرتے ہیں۔ بھگوان نے ہمیں یہ ہاتھ عزم دینے کے لیے دیئے ہیں۔ کام کرنے کے لیے نہیں۔“ راج مانا نے فخر سے سرو اٹھایا کر کے کہا۔

”لیکن مانا شری؟“ ”بس۔ ہم کچھ نہیں سننا چاہتے تمہارا کتنا خون بہہ گیا ہوگا۔ جب تک دیدہ نہیں آ جاتے تم ہمیں آرام کرو۔“ راج مانا نے حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں پتا شری نے بلایا ہے۔ مانا شری۔“ راجکماروں سر جھکائے بولی۔

”بعد میں۔“ راج مانا نے کہا اور راجکماروں کے کمرے سے نکل گئیں۔

”پتا شری۔ ہمارے دیش کا بیٹا جی بھوجن پڑی

میں بندھی اس کے گھر تک پہنچ جاتی تھی۔ اس کی دلچسپ ہستی اور بے باک رویہ دیکھو بھی بھا گیا تھا۔ بچ تو یہ تھا کہ دیو خود کو بھی اس کے پیار میں جکڑا ہوا محسوس کرنے لگا تھا راجکاری کی سورت کی افسردہ کی مانند سندھ رتا گورا رنگ اس کی سبجاری آنکھیں ساگر میں جوار کی طرح اٹھتا ہوا جوبن اور ان سب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر پھیلی کھل سی مسکان اور سیدھا سچا رویہ اس کی ہر اواز سے جھلکتا اس کا بھول پن دیو کو اپنی طرف متوجہ رہا تھا۔ حالانکہ ابھی بھی دیو اسے راجکاری کے طور پر نہیں بلکہ ایک عام نوجوان الہڑ لڑکی کے طور پر ہی جانتا تھا۔ جو نہ جانے کہاں سے اس کی زندگی میں آ گئی تھی۔ دیو نے بھی جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ ایک دو بار دیو نے پوچھا بھی مگر پرانے ہنس کر ٹال دیا۔ جو بھی تھا لیکن کہنے کی ضرورت نہیں تھی کہ دیو کو بھی اب اکیلا پن کا شے لگا تھا۔ اسے بھی اب ہمسفر کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی اور ہمسفر کے طور پر پر یاد رشتی کی۔

..... ☆ ☆ ☆

”ایک بات کہنے کو دل کر رہا ہے۔ کہہ دوں؟“ اپنی اگلی ملاقات میں پرانے دیو سے کچھ کہنے کی اجازت مانگی۔

”کیسے؟“ ”کیسے کیسے رہ لیتے ہیں آپ؟ آپ اپنے لیے کوئی سندھ رتی کنیا دیکھ کر دیوہ کیوں نہیں کر لیتے؟“ جھجکتے ہوئے راجکاری نے اپنے دل میں رہ رہ کر اٹھ رہی بات کو دیو کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

دیو نے مسکرا کر اپنی طرف ہی متوجہ اس کی کاٹنی آنکھوں میں جھانکا اور پھر ہنسنے لگا۔ ”کون کرے گی مجھ سے دیوہ؟ کون مجھ جیسے بھلے کے ساتھ رہ کر اپنی زندگی خراب کرنا چاہے گی۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“

”مگر کیوں؟ کیا نہیں ہے آپ کے پاس شاید یہ آپ کی ضد ہی ہوگی جو آپ اس طرح زندگی گزار رہے ہیں ورنہ تو آپ کی آنکھوں کے اشارے پر آپ پر جان بچا کر کرنے والی ایک سے ایک سندھ رتی آپ کے قدموں میں رہ کر جیون بھر آپ کی سیوا کے لیے تیار نظر آئے گی آپ اس راجیہ کے سینا پتی ہیں آپ چاہیں تو ایک مل میں اپنا جیون خوشحال بنا سکتے ہیں۔ آپ کے ہاں کہتے ہی اس کنیا کی جگہ محل بن سکتا ہے۔ سیکڑوں نوکر چاکر آپ کے ایک اشارے کے منتظر رہ سکتے ہیں۔ صرف آپ کے اشارہ کرنے کی دیر ہے۔“

”ہاں۔ آپ ایک دم صحیح کہہ رہی ہیں۔ کون ہوگی جو راجیہ کے سینا پتی سے دیوہ سے انکار کر دے گی۔ محلوں میں جیون بنانے کے لیے کون تیار نہیں ہوگی۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ آپ نے سینا پتی سے نہیں دیو سے سوال کیا ہے۔ میں ہمیشہ سے سینا پتی پس رہا ہوں۔ اور نہ ہی ہمیشہ رہ سکتا ہوں۔ میرے ساتھ صرف میرا نام چڑا ہوا ہے اور وہ نام ہی ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔ شاید مرنے کے بعد بھی۔ میرا حق صرف میرے شری پر ہے۔“ دیو نے کہنی موڑ کر انکھٹا اپنے سینے پر مارتے ہوئے کہا۔ ”میں زندگی بھر کے لیے اپنی بیوی کو محلوں میں رکھنے کا وعدہ نہیں کر سکتا اور جو وعدہ میں نبھانہ سکوں اس کا دعویٰ بھی میں بھی نہیں کرنا ہاں اپنے دل میں رکھنے کا وعدہ کر سکتا ہوں۔ اپنی پلکوں پر بٹھا کر اس لیے صرف میں اپنے بارے میں ہی بات کرتا ہوں۔ میں صرف اپنے مفاد اور لالچ کے لیے کسی کو اپنا نہیں بنا سکتا۔“

پر یا مہبوت سی دیو کی باتیں سن رہی تھی۔ جواب بھی جاری نہیں۔

”اُس لیے میں صرف اپنے بارے میں ہی بات کرتا ہوں اس لیے عہدے یا کسی لالچ کے لیے نہیں۔ محلوں میں زندگی گزارنے کا پسنا لیے تو اس راجیہ کے سینا پتی سے دیوہ کی خواہش تو ہزاروں لڑکیوں میں ہو سکتی ہے مگر اس بھلے دیو سے شادی کرنے کو کون ابھان تیار ہوگی؟“ دیو اپنی بات پوری کر کے اس کی طرف سوالیہ انداز سے دیکھ کر مسکراتے لگا۔

راجکاری دیو کی بات پوری ہونے پر بے کلم ہی ہو کر کھڑی ہوئی اور اس کی طرف دو قدم آگے بڑھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں سچے پیار کا سا گرمیوں کا بار تھا۔

”میں..... میں دیوہ کرنا چاہتی ہوں اس دیو سے۔ مجھے محلوں سے پیار نہیں میں صرف آپ کی ہستی سے پیار کرتی ہوں آپ جیسے مرد کے قدموں میں زندگی گزارنا میرے لیے خوش قسمتی سے کم نہیں ہوگی۔“ اپنی بات کہہ کر پر یا دیو کو جنموں جنموں کی سی پیاسی لگا ہوں سے دیکھنے لگی۔

دیو کچھ پل کو تو جیسے خود کو بھی بھول گیا۔ ایک تک پر یا کے شوق چہرے کو دیکھتا ہوا کچھ دیر بعد بولا۔ ”یہ میری بھی خوش قسمتی ہوگی اگر آپ جیسی خوب صورت اور سمجھدار اور رکھ رکھاؤ والی لڑکی مجھے پتی کے روپ میں سونپا کر کرے۔ کیونکہ آپ پہلے ہی دان میرے دل میں بس گئی تھیں میں تنہائی میں آپ کے چلے جانے کے بعد اپنے آپ کو آپ کے بارے میں سوچنے سے نہیں روک پاتا ہوں۔“ دیو نے آگے کہا۔ ”سچ کہوں تو میں اب بھی آپ کے بارے میں جان لینے کے لیے بیقرار ہوں آپ نے ابھی تک مجھی نہیں بتایا کہ آپ کون ہیں مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے پہلے بھی کہیں آپ کو دیکھا ہے۔ مگر کہاں دیکھا ہے۔ یہ یاد نہیں ہے۔“

راجکاری نے دیو کی کہی باتوں کو ہی آگے

آدائش کی کڑی دھوپ میں کب تک ہم چلیں گے ابھی تک تیری قربت کا سایہ نہیں مینر زندگی کی تاریک راہوں میں کب تک ہم چلیں گے ابھی تک تیری محبت کا دیا نہیں مینر چلتے چلتے ہم تو تھک کر پور ہو گئے ہیں ابھی تک مہرباں کا سہرا نہیں مینر بحرِ فرقت میں ہم کہیں نہ ڈوب جائیں ابھی تک تیرے وصل کا کنارہ نہیں مینر آکاش کب تک ہوگا تیرا یونکا انتظار ابھی تک حیرے آنے کا اشارہ نہیں مینر

دلہن احمد بخاری..... منجن آباد

بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ کی طرف سے کبھی ہوئی باتیں مجھ پر لاگو نہیں ہوں؟ میں بھی تو وہی سب کہہ سکتی ہوں۔ میں جو بھی ہوں۔ آپ کے سامنے ہوں میرے بارے میں اور یاد دہانے کے لیے بے کلم ہو کر تو آپ اپنی ہی باتوں کی نفی کر رہے ہیں میرے پاس صرف ایک ہی دل ہے آپ کو دینے کے لیے اسے آپ سونپا کر کریں یا نہ کریں مگر یہ اب سدا آپ کا ہی رہے گا آپ میرے بارے میں مزید جھان بین کرنا چاہتے ہیں تو میں اس کا انتظار کر سکتی

ہوں مگر جب بھی آپ مجھ سے سوال کریں گے میرا جواب ہمیشہ یہی ہوگا کہ میں دیو سے پیار کرتی ہوں اب یہ آپ پر ہے آپ اپنی دیوانی ہو چکی اس ناچیز کو قبول کرتے ہیں یا نہیں۔“

اپنے بارے میں راجکماری کے پیار بھرے خیالات جان کر دیو کی آنکھیں چٹک چٹکیں۔ آنکھوں میں آنسو ہونے کے باوجود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

کچھ دیر پر یا کو دیکھنے کے بعد اس نے اپنی راجکماری کی طرف انہیں پھیلا دیں۔ اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لیے انہی دیو کی ہانہوں کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر پر یا بھی خوشی سے پاگل سی ہوئی۔ ایک ہل کے لیے اس نے شرم کے مارے اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ پھر چہرے کو ڈھکے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں کو ہلکا سا کھول کر ان کے پیچ سے جھر دکا بنا کر اپنے برہمن دیو کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ دیو اب بھی مسکراتا ہوا ہانہوں پھیلائے اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

پر یا نے اپنے ہاتھ ہٹائے اور حیا کے بوجھ سے پلکوں کو جھپکایا۔ کچھ پروہ ایسے ہی کھڑی جانے کیا کیا سوچتی رہی پھر ایک ہی جھٹکے میں چار قدم کی میلوں میں لگ رہی اپنے اوردیو کے پیچ کی دوری کو ختم کر دیا۔ پر یا کسی ہازک تیل کی طرح کافی دیر تک دیو کے بدن سے چپٹی کھڑی رہی اپنی ہانہوں میں پر یا کو سمیٹنے دیو نے پوچھا۔ ”نام تو پوچھ ہی سکتا ہوں نایادہ بھی میں ہی رکھوں۔“ دیو کی آغوش میں سنی کھڑی پر یا کو اچانک دنیا بہت بڑی اور بری لگنے لگی۔ اس کو لگا جیسے اگر اب وہ دیو سے الگ ہوئی تو واپس اس کی ہانہوں میں نہیں لوٹ سکے گی۔

”میں آپ کو سب کچھ بتانے کے لیے تیار ہوں دیو مگر وعدہ کرو چاہے کسی بھی مشکلیں آئیں تم میرا ہاتھ بھی نہیں چھوڑو گے۔ مجھے ابھی سوچنا کر لو دیو مجھے ابھی اپنا بنا لو۔“

پر یا کے ہازک بدن پر دیو کے بازوؤں کی گرفت ہلکی سی سخت ہو گئی۔ اس احساس سے کسمسا کر پر یا چھوٹی موٹی کی طرح اپنے دیو میں ہی سمٹ گئی۔

”وعدہ رہا۔“ دیو نے کہا۔

”تو میں بھی وعدہ کرتی ہوں دیو۔ ہماری اگلی ملاقات میں آپ کو میرے بارے میں سب کچھ پتہ چل جائے گا۔“

اس دن پر یا دیو کے گھر سے لگی تو وہ راجکماری نہیں رہی تھی۔ رانی بن چکی تھی۔ اپنے بوجھ دیو کے سپنوں کی رانی۔ پہلے پیار کا نشہ پا کردہ خود کو ساتویں آسمان سے بھی اوپر محسوس کر رہی تھی۔ اس کے کھلے کھیلے چہرے کی رنگت اور مسکراہٹ آج دیکھتے ہی بن رہی تھی۔

”آج کیل گیا۔“

”سب کچھ مل گیا۔“

”سب کچھ مل گیا۔“

کے ساتھ ہی راجمان تھیں۔ نہیں ہے۔ پھر بھی ہم نے دوتی کی خاطر راجکماری سے ان کی رائے لی۔ راجکماری کی طرف منع کرنے کے بعد ہمارے پاس اس رشتے کو ٹھکرانے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ ہم راجکماری کی مرضی کے مطابق سوئسٹر چارہے ہیں اور اب تو صرف سوئسٹر ہی ہوگا۔ اگر ان کے بازوؤں میں سچے سپاہی کا خون ہے تو کم از کم سوئسٹر میں آئیں اور اپنا دم دکھائیں۔ ان کو کہنا کہ ہمارے دیش کے سینکڑوں میں ہی نہیں بچے بچے میں دیو بننے کا جنون سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ جواب ہمارا سینا پتے جان کی جانب سے کی گئی حلقے جیسی کوئی بھی جرات ناقابل برداشت ہوگی۔“

مہاراج کی بات سن کر قاصد نے ادب سے سر جھکایا اور باہر نکل گیا۔ ”مہاراج“ آپ مان کیوں نہیں لیتے ہمارا ان کے ساتھ کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ فوج اور عسکری برتری کے لحاظ سے وہ ہم سے میلوں آگے ہیں اگر انہوں نے حملہ کر دیا تو ہم کیا کریں گے؟ ”مہاراجی نے سہی ہوئی آواز میں کہا۔

”مہاراجی۔ سپاہی بھی دشمن کو کمزور یا طاقتور سمجھنے کے بعد مقابلے کا ٹکس سوچتے۔ یہاں جنگ آن بان اور شان کے لیے لڑی جاتی ہے۔ اس میں اگر اپنا سر بھی کٹے حوائے تو بھی پروا نہیں۔“ مہاراج ایک ایک لفظ کو غصے سے چڑھا چبا کر بول رہے تھے۔ ”ان کے پیغام کی زبان سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے راجکماری کا ہاتھ نہیں ہماری عزت مانگی ہے۔ اب چاہے کچھ ہو جائے راجکماری کا سوئسٹر ہو کر رہے گا۔“ مہاراج غصے کے مارے کانپ رہے تھے۔

مہاراجی نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور اٹھ کر چلی گئیں۔ مگر پر یا درشتی اب بھی وہیں بیٹھی تھی۔ اسے

پیغام پڑھنے کی اجازت دینے سے پہلے ہی مہاراج کے ماتھے پر فکر کی ہلکی ہلکی لکیریں دکھائی دینے لگی تھیں۔

”کہو قاصد کیا پیغام بھیجا ہے ہرے دوست ویدرات نے۔“

”مہاراج انہوں نے پیغام بھیجا ہے کہ۔“ بولتے ہوئے قاصد نے پیغام کو کھول لیا اور اس میں سے پڑھ کر بولنے لگا۔ ”آپ نے ہمارے سپتر راجکماری کے آپ کی سپتری پر یا درشتی کے ساتھ دیوہ جوڑنے کی ہماری خواہش کو ٹھکرا کر اور راجکماری پر یا درشتی کے دیوہ کے لیے سوئسٹر کی شرط پڑا کر رہ کر

دنوں راجیوں کے پیچ برسوں سے چلی آ رہی دوتی کا ایک ہل میں ہی بڑی بے دردی سے گلا گھونٹنے جیسا کام کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ان تعلقات پر غور کر کے فوراً ہمارے قاصد کے ہاتھوں ہی آپ کا آخری فیصلہ اچھا یا برا ہم تک پہنچا دیں۔ ورنہ آج کے بعد آپ کے راجیہ پر حملہ کر کے آپ کے راجیہ اور راجکماری کو حاصل کرنے کے لیے ہمارے بھی راستے کھلے ہیں۔“ پیغام پڑھنے کے بعد قاصد نے پیغام پھینکا اور جھک کر کھڑا ہو گیا۔

مہاراج کے ساتھ ہی راجکماری پر یا درشتی اور مہاراجی بھی تھلا اٹھیں۔ مہاراجی کے چہرے پر غصے کے ساتھ ساتھ ڈر بھی الگ ہی پڑھا جا سکتا تھا۔ دنوں مہاراج کے جواب کا انتظار کرتے ہوئے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد مہاراج نے بولنا شروع کیا۔ ”قاصد جا کر ان سے کہہ دینا کہ دوتی کا خون ہم نے نہیں۔ ایسا ناپاک پیغام بھیج کر انہوں نے کیا ہے۔ ہمارے دھرم میں سوئسٹر کوئی نئی روایت

اب ایک اور فکر ستارہ رہی تھی۔ کہیں مہاراج نے دیو کو اس سے وعدہ کرنے سے پہلے ہی سوئیکر میں حصہ نہ لینے کا وعدہ تو نہیں لے لیا۔ راجکماری کو تو پتہ بھی نہیں تھا کہ کب مہاراج نے سوئیکر کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”بتا شری آپ نے ہمارے سوئیکر کا فیصلہ کب لے لیا؟“

”ابھی ہم نے فیصلہ نہیں لیا تھا راجکماری۔ صرف اس کم بخت کا شیشہ ٹھکراتے ہوئے تمہاری رائے سے متعلق ہونے کا اعلان کیا تھا۔ مگر اب تو ہر حال میں سوئیکر ہوگا وہ بھی جلد سے جلد ہم کل ہی سارے راجیوں میں اعلان کروا دیتے ہیں۔“ مہاراج بیٹی کا چہرہ دیکھ کر کچھ ششدر ہوئے۔

”مگر..... کیا آپ نے دیو سے بات کر لی ہے۔ اس بارے میں؟“ پرپانے فکر مند ہوتے ہوئے پوچھا۔ مہاراج بے فکری سے بولے۔ ”دیو کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے راجکماری۔ اس کو تو صرف کہنے کی دیر ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ ہمارے حکم کو کبھی نہیں ٹالے گا۔“

”پھر بھی۔“ یہ سن کر پرپا کو دھچکا سا لگا۔ ”بتا شری۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ایک بار ان سے بات کر لیں۔ جلد سے جلد اور ہم چاہیں گے کہ اس وقت ہم بھی وہیں موجود ہوں۔“

”جیسے آپ کی مرضی راجکماری۔ ہم کل ہی اس کو اپنے پاس بلوا لیتے ہیں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ رہنا۔ ہمیں یقین ہے کہ کل آپ دیو کو ایک اور روپ میں جان جائیں گی۔“ مہاراج کے چہرے پر دیو کو یاد کرنے سے ہی رونق آگئی۔

☆☆☆

دیو سینا پتی کے لباس میں راج محل میں داخل ہوا۔ مرکزی دروازے پر کھڑے دووں وزیرانوں نے او

ب سے اپنا سر جھکا لیا۔

”مہاراج کہاں ہیں؟“ دیو نے اندر بچھ کر وہاں کھڑے ایک اور دربان سے پوچھا۔

”مہاراج اپنے کمرہ خاص میں آپ کی راہ دیکھ رہے ہیں سینا پتی جی۔“ دربان نے ادب سے جواب دیا۔ ”مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں آپ کو وہاں تک لے چلوں آئیے۔“ درباری نے کہا اور کمرہ خاص کی طرف بڑھ گیا۔ دیو اس کے پیچھے چل پڑا۔

☆☆☆

”مہاراج میں آپ کے حکم کے مطابق سینا پتی جی کو یہاں تک لے آیا ہوں۔ اب آپ سے ان کو اندر بھیجے کی آگیا چاہتا ہوں۔“ درباری نے دیو سے پہلے کمرہ خاص کے اندر جا کر مہاراج سے اجازت مانگی۔

راجکماری پر یاد دہانی ان کے ساتھ ہی پیشی تھی۔ وہ اپنے دیو کو سینا پتی کے لباس میں دیکھنے کے لیے بے چین تھی۔ مگر آنے والے لمحوں کے بارے میں سوچ کر اس کا دل زوروں سے دھڑکنے لگا تھا۔

”ہوں۔“ مہاراج نے رعب سے کہا۔ ”انہیں اندر بھیج دو۔“

”جو آگیا مہاراج۔“ درباری نے کہا اور اپنا سر جھکا کر پلٹا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کمرہ خاص میں داخل ہوتے ہی پہلے تو دیو مہاراج کو کورٹش بجایا پھر راجکماری کو پرنام کیا۔ لیکن اچنبھے کی بات یہ تھی کہ اس کے چہرے پر حیرت کا کوئی تاثر نہیں تھا اور نہ ہی راجکماری کو دیکھ کر اس کے ماتھے پر کوئی شکن ابھری تھی۔ شاید اس نے راجکماری کے چہرے پر غور ہی نہیں کیا تھا۔

ملوہر راجکماری پتہ دیو کو اس روپ پہن دیکھ کر

دارباری واری جاری تھی۔ دیو کے خوب صورت منڈول اور سٹیلے بدن پر فوجی لباس حد سے زیادہ جچ رہا تھا۔ روپ رنگ گن اور رکھ رکھاؤ سے وہ کسی دلش کے راجا سے کسی بھی صورت کم نہیں لگ رہا تھا۔

اس کا چہرہ سورج کی طرح روشن تھا اور اس کے پیکر کو چار چاند لگانے کے لیے ہمیشہ کی طرح اس کی بیٹی مسکان اس کے ساتھ تھی۔

”شریف رحیم سینا پتی جی۔“ مہاراج نے دیو کو اس کے عہدے کے مطابق اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جو آگیا مہاراج۔“ دیو نے احترام سے جواب دیا اور نہایت ادب کے ساتھ مہاراج کے سامنے براجمان ہو گیا۔ ”مہاراج مجھے اچانک یہاں بلانے کی کوئی خاص وجہ؟“ دیو نے مہاراج سے نظریں ملاتے ہوئے پوچھا۔

”جی سینا پتی جی۔ وجہ بہت اہم ہے۔ اس لیے ہم نے آپ کو اچانک یاد کیا۔“ مہاراج بولے۔

”تجئے مہاراج۔“ دیو نے راجکماری کی طرف اب تک بھی غور نہیں کیا تھا۔

”دراصل ہم راجکماری پر یاد دہانی کے دیوا کے سلسلے میں ایک سوئیکر رچانے کا من بنا رہے ہیں۔“ مہاراج نے بات کی تمہید باغی۔

”تو اس میں مشکل کیا ہے مہاراج۔ آپ جب چاہیں سوئیکر کی تیاری شروع کروا سکتے ہیں اور اس مبارک کام میں میں آپ کے کسی کام آسکوں تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔“ دیو نے صراحت کے ساتھ کہا۔

”ہوں! ہم آپ کے اونچے آدرشوں اور سوچ کے قائل ہیں سینا پتی۔ بلاشبہ آپ ہمارے راجہ کے سب سے اہم رتن ہیں۔ آپ کے سینا پتی بننے کے بعد ہم اپنے راجہ کو محفوظ رکھنے لگے ہیں۔“

بدایت اور اصلاح کا روشن چراغ

ملک کے مفکر و دینی و اصلاحی رسالہ

الاسلام

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

ممتاز مفکر و دانشور شائق احمد قریشی کی زیر ادارت

قیمت 20 روپے

دینی مسائل کا حل، مولانا سعید احمد جلال پوری
روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد

دنیا کے اسلام کے تمام مسائل متعلق
علماء کرام کی نگارشات اور ادارہ مشتمل

ادارہ شائع ہوا ہے

alislamkhi@gmail.com

گہمت نسوان

طاہر قریشی

علاقہ کو قدرت نے کائنات میں رنگ بھرنے کے لیے پوچھا تھا اور اسے نرو و نازک دل دیا جو کھدے کے پھٹ دیکھ پر جھلک دھڑلے اٹھے اور اپنے محبوبہ شوہر اور بچوں پر پیر نچھاور کرے مگر انصاف نے اُسے جود سے درجے کا شہرہ بنا دیا۔

اک خاتون کا قصہ اُس نے وقت بڑے پرغور کردوں سے بڑھ کر ثابت کر دیا تھا۔

میری عمر تیرہ سال تھی لیکن میں جسمانی اعتبار سے صحت مند ہونے کی وجہ سے اپنی عمر سے بڑا دکھائی دیتا تھا۔ انہی دنوں میرے پاپا نے مجھے خواتین کو کھینے کے سلسلے میں پہلا سبق دیا۔ عورتیں کائنات کی اہم ترین مخلوق میں سے ہیں لیکن جیری الا سکا کی عورتیں بظاہر نرم و نازک لیکن درحقیقت بے حد سخت جان ہوتی ہیں۔

اس دن مجھے بہت شدید ہچک لگ رہی تھی۔ میں کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا کہ پاپا نے کہا۔ ”رک نے آج مجھے برخواست کر دیا ہے۔ اسے کسی نوجوان کی ضرورت ہے اور میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔“ میرا ہاتھ رک گیا۔ کھانا چھوڑ کر میں اس دھماکے کا انتظار کرنے لگا جو کبھی نہیں ہوا۔

میری بہن سلی جس کی رک سے شادی ہونے والی تھی سوچ میں پڑ گئی پہلے اس نے اپنے رہنما کتے فینک کو فروخت کر دیا۔ اسے ڈربا ریس کے لیے کم عمر کتا چاہیے۔ اب اس نے اپنے سپرنٹنڈنٹ کو جواب دے دیا۔

میں نے مٹی کی طرف دیکھا۔ ہمارے گھرانے کے ساتھ کوئی زیادتی کرے تو مٹی پر فروخت ہو جاتی تھیں۔ وہ اس وقت سلی کو غور سے دیکھ رہی تھیں اور لمبے لمحوں ان کے چہرے پر فخر کا تاثر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

اب اگر کوئی فوج کو اکٹھا کر کے جنگ میں اترے تو بچا تھا تو وہ تھا صرف دو۔ سابقہ سینا پتی تو مہاراجا کا۔ کیا حکم ہے مہاراج؟“ دو دیو نے مہاراج سے ان کی ناشا جانا چاہی۔

مہاراج مٹی آنکھوں میں نمی دکھائی دینے لگی۔ ”جیتنا ناممکن ہے سینا پتی۔ مگر ہم بڑوں کی طرح بھاگ کر نہیں۔ بہادروں کی طرح لڑ کر مرنا چاہتے ہیں۔“

”آپ آگیا دیجئے مہاراج۔ میرے جیتے جی کوئی راج محل کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ جو دیکھے گا آپ کی بہادری فوج اس کی آنکھیں نکال دے گی۔“ دیو کی آواز راج محل میں گرج اٹھی۔

”تو جاؤ سینا پتی۔ جا کر سینا کی کمان سنبھالو۔ ہم کچھ ہی دیر میں تیار ہو کر آتے ہیں راجپوت کو تم جیسے بہادر پر ہمیشہ ناز رہے گا۔“

”جوا آگیا ہو مہاراج۔“ یہ کہہ کر دیو نے اب اس سے لپٹ کر کھڑی پریا کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”مجھے جانے دو پریا۔ دلش کی آن مجھے پکار رہی ہے۔ میں لوٹ کر آؤں گا وعدہ کرتا ہوں۔“

پریا رو رو کر پاگل سی ہو چکی تھی۔ مگر وہ دیو کے وعدے پر بھروسہ کر کے پیچھے ہٹ گئی۔ دیو نے آخری بار اس کے چہرے کو پیار سے دیکھا اور اجازت لے کر باہر نکل گیا۔

باقی آئندہ

مہاراج کے تیور کچھ اور گڑبڑا گئے۔ ”آج کا دن اپنے آپ میں ہی ایک انہونی ہے۔ کہو۔ کیا بات ہے؟“ مہاراج ابھی تک پریا کا ہاتھ پکڑے کھڑے تھے۔

درباری نے فوراً کہنا شروع کیا۔ ”مہاراج۔ اطلاع ملی ہے کہ ویدرات آ میرے راجا کے ساتھ مل کر حملہ کرنے آ رہا ہے۔ ہمارے سابقہ سینا پتی بھی ان سے جا ملے ہیں۔ انہوں نے پیغام بھیجا ہے کہ اگر اب بھی آپ شکست سے بچنا چاہتے ہیں تو راجگھڑی پریا درستی کو ان کے سپرد کر دیں۔ راجپوت بہت برا وقت آگیا ہے مہاراج۔“

”کیا؟“ یہ خبر مہاراج پر بجلی کی طرح گری تھی۔ ان کے ہاتھ کی پکڑ پریا کے ہاتھ پر ڈھیلی ہو گئی۔ ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔

پریا نے تو جیسے کچھ سنائی نہیں۔ جیسے ہی مہاراج کی پکڑ کمزور ہوئی وہ دیو سے لپٹنے کے لیے دوڑ پڑی اور جا کر اپنے دیو کے سینے سے لگ گئی۔

”مجھے یہاں سے لے چلو دیو۔ مجھے یہاں سے لے چلو میں اب یہاں اور نہیں رہ سکتی میں تمہارے بغیر ایک لمبھی نہیں رہ سکتی۔ ہم کسی دوسرے راجپوت میں رہ لیں گے اپنا وعدہ پورا کرو دیو مجھے لے چلو۔“ پریا کی آنکھوں سے آنسو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

”مجھے بزدل بننے پر مجبور مت کر د پریا۔ ہمارے راجپوت پر اس وقت مصیبت آئی ہوئی ہے۔ مجھے مہاراج کے آخری حکم کا انتظار ہے۔ بے فکر رہو۔ میرے جیتے جی کوئی نہیں۔ مجھ سے دور نہیں کر سکتا۔“

پریا دیو سے پہلے کی طرح ہی لپٹی رہی اور اپنا سر اوپر اٹھا کر اس نے مہاراج کے سامنے ہی دیو کے گالوں کو چوم لیا۔ مگر دیو ساکت سا کھڑا مہاراج کی طرف دیکھتا رہا۔ مہاراج کی آنکھیں شرم سے جھلک گئیں۔

ڈان تک پہنچے تھے۔ اس کے بعد وہ یہ مشکل اوم پہنچ کر سیٹ ہوئے تھے۔ میں نے پاپا کو بہت سخت جان لوگوں سے مقابلہ کرتے دیکھا تھا۔

”شاید پاپا کو اب تک کوئی امتحان لینے والا ہی نہیں ملا ہے۔“ میں نے زیر لب کہا لیکن مجھے بڑی اذیت محسوس ہوئی۔

تفریح گاہ میں پاپا کی بچی اور رک داخل ہوا۔ میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی عمر پچیس سال تھی وزن دس پونڈ تھا۔ چھٹ لیکن کوئی چیز مجھے وہاں گاندن اس کی طرف اچھالنے سے نہ روک سکی۔ ”بدبو دار آدمی۔“ میں چلایا۔

کسی نے مجھے دھکیل کر باہر نکال دیا۔ میں بہت غصے میں تھا۔ پھر میں کیلر کی طرف چلا گیا۔ جس نے رک کے رہنما کتے فینک کو خریدا تھا۔ کتے بندھے ہوئے تھے تاکہ آپس میں لڑنے نہ لگیں۔ ان میں سے کچھ کے لیے چھوٹے چھوٹے گھر بھی بنے ہوئے تھے لیکن بیشتر برف پر سو رہے تھے۔ ان کی دھن ان کی ناکوں پر دھری تھیں۔ کچھ کھڑے غرا رہے تھے۔ جیسے سروی کی شکایت کر رہے ہوں۔ فینک مجھے دیکھ کر خوش ہوا۔ اس نے دم ہلاتے ہوئے منہ سے عجیب سی آوازیں نکالیں میں نے اس سے وہ احمقانہ گفتگو کی جسے سن کر کتے خوش ہوتے ہی۔ وہ مجھ سے بالکل چپک گیا۔ پاپا مجھے دھونڈتے ہوئے آئے تو میں انہیں دہیں ملا۔

سلی کے بال سرخ تھے آنکھیں سبز تھیں اور وہ بہت غصہ ور لڑکی تھی۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ نوم میں اس سے زیادہ حسین لڑکی کوئی نہیں تھی۔ اس کی عمر صرف بیس سال تھی لیکن کوئی بھی اسے کمزور نہیں کہہ سکتا تھا۔ جب رک سے اس کی مٹنی ہوئی تو میں نے سوچا تھا کہ یقیناً مجھے ایک بھالی مل گیا ہے۔ میں رک کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ دو سال پہلے نوم آیا تھا۔ کتوں میں اسے خاص طور سے دلچسپی تھی۔ ابتدا میں وہ ہر شخص سے سوال کرتا پھر۔ بلاخر اس نے برف صاف کرانے کا ٹھیکہ لیا۔ اس کے بعد اس نے کچھ زمینوں کے حقوق حاصل کیے اور کان کنی کا آغاز کر دیا۔ مشینیں منگوائی گئیں اور پاپا اس کے سپر سنڈنٹ ہو گئے۔

”بزدل۔“ میں نے پاپا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے پتھر ماریں گے اور جواباً میں..... تاہم ان کے اوپر کوٹ نے ان کے چہرے کا بیشتر حصہ چھپا رکھا تھا لیکن میں نے دیکھ لیا کہ میرے کہے ہوئے لفظ نے انہیں کتنی تکلیف پہنچائی ہے۔ مجھے خوشی ہوئی انہوں نے وہ ہاتھ جو مشفقانہ انداز میں میری طرف بڑھایا تھا واپس ہٹا لیا پھر وہ ہاتھ بے جان سے انداز میں ٹپک گیا۔ ”تم میں بڑا دم ہے جیری۔“ لیکن بچے ہوا بھی۔ خیر چھوڑو آؤ چلیں۔“ انہوں نے میرے کانڈھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے اچھا لگا۔ وہ واقعی مجھ سے محبت کرتے تھے۔ میں نے وہ ہاتھ جھٹک دیا اور خود کو بہت سی محسوس

میں برف پر ٹھوکریں مارتا پل رہا تھا اور خود کو بتا رہا تھا کہ مجھے کوئی پروا نہیں لیکن میں جانتا تھا کہ مجھے پروا ہے۔ میں کسی کی تفریح گاہ میں داخل ہو گیا تاکہ گرم فضا کا لطف اٹھا سکوں۔

”تمہیں تو اپنے بستر میں ہونا چاہیے تھا جیری!“ ٹیکس نے کہا۔ لیکن اس نے مجھے پوکر کا کھیل دیکھنے دیا۔ سب سے زیادہ جیس شرط باز بکن کے سامنے رکھے تھے۔ وہ بہت قوی الجھ تھا اور ہر وقت مسکراتا رہتا تھا۔ پاپا کا کہنا تھا کہ وہ اچھا کھلاڑی نہیں لیکن بڑے داؤ کے کھیل میں اس کے سامنے جتنا مشکل ہے۔

”کیا می نے آپ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا کرتے لگا۔“

چند قدم خاموشی سے چلنے کے بعد پاپا بولے۔

”میں جانتا ہوں جیری۔ تم کیا محسوس کر رہے ہو۔“

ایک بات بتاؤں بس صرف تمہیں بتا رہا ہوں۔ رک نے فینک کو بڑھا ہونے کی وجہ سے بیچا تو اس نے غلطی کی اور میرے ساتھ جو اس نے کیا وہ غلط ہے یا صحیح اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔“

”فیصلہ وقت کرے گا۔“

”آخر ہوا کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”میں کام ترتیب سے کرنا چاہتا تھا۔ ترتیب کے مطابق زیادہ مال دار زمینوں کا نمبر بعد میں آتا۔ رک کا کہنا تھا کہ پہلے سب سے اچھی کان پر کام شروع کیا جائے تاکہ اسٹاک ہولڈر مطمئن رہیں۔ اس صورت میں ابتدا میں زیادہ منافع ہوتا لیکن میرے طریقے میں ابتدا میں منافع کم ہوتا اور بتدریج وہ بڑھتا جاتا یہاں تک کہ مستحکم ہو جاتا۔ چند برس کے بعد منافع بہت زیادہ ہوتا۔“

”آپ کی بات سمجھ میں آتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں اپنی بات پر اڑا رہا۔“ پاپا نے کہا۔ ”اس مین کے خاتمے پر رک نے حساب لگایا کہ اگر اس کا طریقہ اپنایا جاتا تو منافع کتنا زیادہ ہوتا۔ اسے یہ بات بری لگی اور اس نے میرے کاٹریکٹ کی تجدید کرنے سے انکار کر دیا۔“

”اب آپ کیا کریں گے گے یہ ثابت نہیں کریں گے کہ وہ غلطی پر تھا۔“

”بہتر ہے کہ ہم سب کچھ سلی پر چھوڑ دیں۔“

”سلی تو لڑکی ہے۔“

”ہاں اور جب کوئی لڑکی کسی کو اپنا اہل سمجھتی ہے تو اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے۔ سلی بھی تمہاری ماں کی طرح ہے۔“

”کیا می نے آپ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہے میں سمجھا وہ جواب نہیں دیں گے۔ پھر وہ بولے۔ ”جب میں رک جتنا تھا تو بہت سخت ہوتا تھا میں چلوٹ درے کی برف میں دو سو پونڈ وزن اٹھا کر پندرہ سو قدم تک بغیر رکے چلا رہا۔ تمہاری ماں نے بھی ساتھ چلنے کی ضد کی۔ تم دونوں مناسب ہاتھوں میں تھے۔ میں نے اسے صاف منع کر دیا تاہم اس نے میرا ساتھ دیا میں کسی بنا رہا تھا تو وہ تنھے ہٹا اٹھا کر مجھے دے رہی تھی۔ پھر جہاں پانی کا بہاؤ کم تھا میں نے اسے کشتی چلانے دی۔ اس کا کہنا تھا کہ جب گھر اسے کی تاریخ رقم ہو تو اس کا شمار بوجھ میں نہ ہو جیسے مکی اور گیہوں کا ہوتا ہے۔“

میں سمجھ سکتا تھا مکی ایسی ہی تھیں۔

”آگے مالٹر کا آبی درہ تھا۔ تم نے سنا ہے اس کے متعلق داں پانی کا بہاؤ بہت تیز ہوتا ہے۔ وہاں تو ماہر کشتی راں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں یا پانی کا بہاؤ کم ہونے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ میں نے تمہاری ماں سے کہا کہ وہ اتر کر پیدل چلے میں کشتی کو یہاں سے نکالتا ہوں۔ بس جناب اس نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا۔ میں نے اسے چار عورتوں سے کانفرنس کی اجازت دے دی جن کے شوہروں نے انہیں یہی ہدایت کی تھی۔“

پاپا نے موضوع بدل دیا۔ ہم پھر کیلر کی دکان میں داخل ہو گئے تھے۔ میں درہ مالٹر کے بارے میں سوچ سوچ کر الجھتا رہا میں جانتا تھا کہ مکی مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں بتائیں گی۔

”سلی نے مجھے بھیجا ہے۔“ پاپا نے کیلر سے کہا۔ ”وہ فینک کو خریدا چاہتی ہے۔ میرا اعزاز ہے کہ وہ

ڈاگ ریس کے لیے ٹیم تیار کر رہی ہے۔
 ”میرا خیال ہے رک اپنے قد سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔“ کیکر نے کہا۔ ”ظاہر ہے ایسے میں سیلی کو ہی ٹیم بنانا پڑے گی۔ بہر حال میں ایک شرط پر بیچوں گا اسے وہ یہ کہ رک جب اسے خریدنا چاہے گا تو وہ اس سے آسانی قیمت وصول کرے گی۔“
 ”یہ معاملہ سیلی پر چھوڑ دو۔“ پاپا نے کہا۔
 اگلے روز رک ہمارے گھر آیا۔ اس کا موڈ جتنا خوباں تھا لیکن سب اس کے ساتھ ایسے پیش آئے جیسے کچھ ہوائی نہ ہو۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ شاید اسے گزشتہ رات والا گالہ دان یاد آ گیا تھا۔ میں مسکرایا۔ اتنے میں فینک نے رک کے پاس پہنچنے کے لیے گھر سر پر اٹھادیا۔
 ”تم یہاں کیا کر رہے ہو بڑھے لڑکے۔“ اس نے فینک سے کہا۔

”اسے میں نے خرید لیا ہے۔“ سیلی نے کہا۔
 ”میں کچھ سائبرین کتے منتخب کرنا چاہ رہی ہوں۔ اس کے بعد میں ڈاگ ریس کے لیے ٹیم بناؤں گی۔“
 ”شمالی علاقوں میں ایسی کوئی ٹیم نہیں جو میری ٹیم کی گرد کو بھی پہنچ سکے۔“ رک نے کہا۔ ”میری ٹیم میں نوجوان خون ہے لیڈر بھی نوجوان ہے۔“
 ”ڈرائیڈر بھی نوجوان ہے۔“ سیلی نے کہا۔ رک کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
 ”میں سمجھتی ہوں کہ نامساعد حالات میں عمر اور تجربے کا بہت بڑا سہارا ہوتا ہے۔“
 ”تمہارا ڈرائیڈر کون ہوگا؟“ رک نے پوچھا۔
 ”میرا مطلب ہے تمہاری چوہوں پر مشتمل اس ٹیم کا جس نے کتوں کی کھال پہنچی ہوئی ہوگی۔“
 ”یہ الفاظ بہت سخت ہیں۔“ سیلی کا لہجہ خطرناک حد تک نرم تھا۔

”ایسا لگتا ہے کہ تم ان پر نرک اور سرخ چھڑک کر کھا جاؤ گے۔ بہر حال ڈرائیڈر کے سلسلے میں ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ آؤ چلیں۔“
 وہ اس وقت سر اپا ٹیم ہو رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ اندری اندر لاوالٹل رہا ہے رک کا تو ذرا بہر حال گزر گیا تھا۔
 وہ ڈرائیڈر کے لیے چلے گئے۔ پاپا، ممی سے باتوں میں مصروف ہو گئے وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔
 ”پاپا اب بتائیے تادہ مالٹر میں کیا ہوا تھا۔“ میں نے پوچھا۔ ممی نے زوردار ہتھکڑیاں لگایا اور پاپا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔
 ”چلو جیری کھک لو یہاں سے“ انہوں نے کہا۔

☆.....●.....☆
 اگلے ہفتے کے دوران سیلی نے آٹھ دس سائبرین کتے منتخب کر لیے وہ بہت جلد ارادہ کر چکے تھے۔ اس تمام عرصے میں ہمارا گھر کپڑا خانہ بنا رہا۔ رسیاں کپڑے والا بلا ادھر ادھر کھڑی رہیں۔ سیلی کی کتوں کی ٹیم سب سے مغرور اور عجیب تھی۔ فینک کی مدد سے سیلی ان کتوں کی تربیت میں مصروف تھی فینک ایک آزاد لیڈر کی حیثیت سے تربیت یافتہ تھا۔ ایسے کتے باندھے نہیں جاتے وہ آزاد و کمزور کی علامت ڈھونڈتے ہیں پھر وہی دوسرے کتوں کی رفتار بڑھانے کا سبب بنتے ہیں۔
 لیکن فینک کو بھیا دکھ ہوا ہوگا کیونکہ سیلی نے اسے گاڑی میں جوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ”میں جانتی ہوں کہ ادھر میں نے تمہیں کھولا ادھر تم رک تک پہنچے۔“ سیلی نے اسے سمجھایا فینک نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں حیران رہ گیا۔ کیا کتے سب

ریس کا دن جیسے قریب آتا گیا۔ سنسنی بڑھتی گئی بکائن کے گرد ریس پر نرم لگانے والوں کا ہجوم تھا۔ ہوشیار شرط باز رک پر نہیں لگا رہے تھے بارٹ پر بھی خاصی زینیں لگائی گئی تھیں پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ سیلی اپنی ٹیم کو خود ہی ڈرائیڈر کرے گی۔
 رک نے سیلی سے اس کی تصدیق چاہی اور سیلی نے تصدیق کر دی۔
 ”میرے خدا! رک نے سر پیٹ لیا۔“ لڑکی تم جانتی بھی ہو ریس کے بارے میں؟ اس کے علاوہ سخت برف پر یہ ہلکے ہلکے کتے اور یہ اس قدر بڑھا لیڈر۔“
 ”ممی کو دردہ چلوٹ اور مالٹر کے آلی درے کے متعلق کچھ پتا نہ تھا لیکن وہ کامیاب ہوئیں۔“ سیلی نے جواب دیا۔ ”پھر پاپا میرے ساتھ ہوں گے اگر کوئی لڑیڈر ہوئی تو سنبھال لیں گے۔“
 ”مجھ پر پہلے ہی بارٹ اور دوسروں سے متعلق پریشانیوں کا بوجھ ہے۔ اس پر مزید ستم چڑا جیسے دماغ والی ایک حسینہ کی پریشانی جس کی مجھ سے شادی ہونے والی ہے۔“ رک دباؤا۔
 سیلی نے متفکری کی انگوٹھی اتار کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ”امید ہے اب تمہاری پریشانی میں کچھ تو کمی ہو جائے گی۔“ اس نے سر دھجے میں کہا۔ ”جشی یہ لو اپنی انگوٹھی اور شگون کے طور پر اسے اپنی ناک میں پہن لو۔“
 ”خدا جانے تمہارے دماغ میں کیا سایا ہے؟“
 رک غرایا پھر وہ پاپا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”آپ نے کسی لڑکی کو ایسی حماقتوں میں مبتلا ہونے دیکھا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ہاں اور اکثر ان کی ایسی حماقتیں بار آور بھی

☆.....●.....☆
 ”ممی کو دردہ چلوٹ اور مالٹر کے آلی درے کے متعلق کچھ پتا نہ تھا لیکن وہ کامیاب ہوئیں۔“ سیلی نے جواب دیا۔ ”پھر پاپا میرے ساتھ ہوں گے اگر کوئی لڑیڈر ہوئی تو سنبھال لیں گے۔“
 ”مجھ پر پہلے ہی بارٹ اور دوسروں سے متعلق پریشانیوں کا بوجھ ہے۔ اس پر مزید ستم چڑا جیسے دماغ والی ایک حسینہ کی پریشانی جس کی مجھ سے شادی ہونے والی ہے۔“ رک دباؤا۔
 سیلی نے متفکری کی انگوٹھی اتار کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ”امید ہے اب تمہاری پریشانی میں کچھ تو کمی ہو جائے گی۔“ اس نے سر دھجے میں کہا۔ ”جشی یہ لو اپنی انگوٹھی اور شگون کے طور پر اسے اپنی ناک میں پہن لو۔“
 ”خدا جانے تمہارے دماغ میں کیا سایا ہے؟“
 رک غرایا پھر وہ پاپا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”آپ نے کسی لڑکی کو ایسی حماقتوں میں مبتلا ہونے دیکھا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ہاں اور اکثر ان کی ایسی حماقتیں بار آور بھی

ثابت ہوتی ہیں۔“ پاپا نے خوش دلی سے کہا۔
 ”آپ پر بھی شاید عورتیں حکمران رہی ہیں۔“ رک نے جواب دیا۔ اس کا غصہ اب اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ چنانچہ جاتے وقت اس نے دروازہ دھماکے سے بند کر دیا۔
 ”تھری چیئر ز!“ پاپا نے اس کے باہر نکلنے سے پہلے کہا۔
 ”نامک تم میں تو ذرا بھی شعور نہیں ہے۔“ ممی نے کہا اور سیلی کے پیچھے پیچھے بیڈروم میں چلی گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سیلی رو رہی ہے نگیہ پنپنے کی آواز ہی بھی سنائی دے رہی تھی۔
 ”نہ نہ پریشان نہ ہوں۔“ ممی کی آواز سنائی دی۔
 ”دیکھ لینا آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
 کچھ دیر بعد وہ دونوں بیڈروم سے ہنستی اور آنکھیں خشک کرتی نکلیں۔ سیلی نے آتے ہی فینک کو شفقت سے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا لیکن وہ رک کی ہوسو گھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆.....●.....☆
 ”ریس شروع ہونے میں تین دن باقی تھے کہ پاپا بیمار ہو گئے۔
 ”آپ بیمار ہیں لہذا سیلی کے ساتھ میں جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”ممی اتنی بوڑھی ہیں کہ سیلی کی مدد نہیں کر سکتیں۔“
 ”ہش آہستہ بولو۔“ پاپا نے سرگوشی کی۔ ”اگر اس نے سن لیا تو کوشش کیے بغیر نہیں مانے گی۔“
 اتنی دیر میں ممی مکمل اٹھائے ہوئے آ گئیں۔ سیلی گرم پانی کا برتن اٹھائے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ عام طور پر پاپا مکمل دیکھ کر ناک بھجوں چڑھانے لگتے تھے لیکن اس مرتبہ وہ سعادت مند مریض ثابت ہوئے۔ ممی کو امید ہو گئی کہ وہ ڈرہی

رہیں تک بھلے جنگے ہو جائیں گے۔

ذرا اپنا خیال رکھنا۔

☆.....☆

ڈرنی ریس کے قوانین کے تحت ہر چیک پوسٹ پروڈیور کو کتوں کی تصاویر دکھانا ہوتی ہیں اس طرح ممکنہ بے ایمانی کی روک تھام ہوتی ہے۔ ورنہ لوگ درمیان میں تازہ دم کتے گاڑی میں جوت لیتے تھے۔ اس طرح کتے بدلنے کی صورت میں ڈرائیور کو مقابلے سے خارج کر دیا جاتا ہے اگر راستے میں کوئی کتا زخمی ہو جائے یا دم توڑ دے تو اسے گاڑی سے نکال دیا جاتا ہے۔

ریس سے ایک دن پہلے ہی کو بتایا گیا کہ بکان نے سیلی پر ۱۵ کا ہارڈ لگایا ہے۔ انکس بہت غصہ آیا۔ ”صرف اس لیے کہ سیلی لڑکی ہے۔ مانک ہمیں سیلی کی ٹیم پر ایک ہزار لگانا ہوں گے۔“ ”جو بی چاہے کرو۔“ پایا نے کہا۔ می نے بچت میں سے ایک ہزار ڈالر نکالے اور سیلی کی ٹیم پر لگا دیے۔ بکان نے شرط قبول کر لی لیکن اس کے فوراً بعد بھاؤ ۹ کا ہو گیا۔

اس سہ پہر می نے پایا کو غور سے دیکھا۔ ”تمہاری حالت تو ایسی نہیں کہ تین چار دن سیلی کا ساتھ دے سکو۔“

”آپ اس کا ساتھ دے سکتی ہیں می۔“ میں نے پایا کی گفتگو کی روشنی میں چالاکی سے کام لیا۔ ”لیکن آپ کو پایا کی جمہداشت کرنا ہوگی کیوں نہ سیلی کے ساتھ میں جاؤں؟“ ”نہیں۔“ پایا نے کہا۔

”ایک منٹ مانک۔“ می نے انہیں ٹوک دیا۔ ”جب بھی کوئی مشکل اور سخت کام ہوتا ہے تم جبری کی طرف اشارہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ تم جب جبری جتنے تھے تو اب مانک۔“

”ٹھیک ہے۔“ پایا نے براستہ بنا کر کہا۔ ”جینے۔“

نوم کے ہاں منتظر تھے سیلی اس وقت تک نہیں نکلی جب تک رک آدھے رستے میں نہیں پہنچ گیا۔ وہ ڈرنی تھی کہ فینک رک کی بو پا کر چل اٹھے گا۔

بھاری کتوں کے پنچوں پر غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ تاکہ ان کے حیر محفوظ رہیں۔ سیلی کے کتے کیونکہ سیلی تھے انہیں غلاف کی ضرورت نہیں تھی۔ جب تمام ٹیمیں مقام آغاز پر پہنچیں تو بکان نے یہ چیز دیکھ لی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ابھر آئے۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ سیلی کے کتے سخت برف پر زیادہ تیز رفتاری کا مظاہر کر سکتے ہیں۔ وہ اوگ نامی انکیس کی طرف مڑا اور اس سے کچھ پوچھا۔ اوگ نے بکان کو بتایا کہ سیلی کے کتوں کو اس وقت تک غلاف کی ضرورت نہیں جب تک ان کے پیچھے زخمی نہ ہو جائیں۔ بکان نے ایک طویل سانس لی۔

تالیوں کی زبردست گونج میں ریس کا آغاز ہوا۔ سیلی نے لوگوں کی تالیوں اور نعروں کا ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔ وہ اس وقت بہت خوب صورت لگ رہی تھی اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور شوق رنگ چہرہ اور کوسٹ میں سے جھلک رہا تھا کچھ ہی دیر بعد نوم پیچھے رہ گیا۔ اب ہمارے سامنے دور دور تک بے کراں برفانی راستوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

رات کو جب ہم نے پہلا پڑاؤ ڈالا تھا تو سیلی نے مجھے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ ”ہم اپنے تمام کتوں کو بہ یک وقت استعمال نہیں کریں گے تاکہ آخری مرحلے کے لیے ہمارے پاس تازہ دم کتے موجود ہوں۔ باری باری ہم انہیں نکال رہیں گے۔ سب کو گاڑی میں نہیں جوتیں گے اب اس وقت ہم

اپنے کتوں کو گوشت کھا کر ان کے جسموں پر ماش کر رہے تھے۔ سیلی کا ارادہ چار گھنٹے آرام کرنے کا تھا۔ لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا۔

جلد ہی ہم نے سوائے رک اور بارٹ کے ریس میں شامل تمام ٹیموں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ کچھ آرام کر رہے تھے اور کچھ اپنے کتوں کی ماش اور دیکھ بھال میں مصروف تھے ریس کی رپورٹ اور مختلف ٹیموں کی پوزیشنوں کے متعلق اطلاعات فون کے ذریعے برابر نوم تک پہنچ رہی تھیں۔

ہم نے پھر آرام کا وقفہ کیا اور دوبارہ سفر شروع کیا۔ تب بھی صرف رک اور بارٹ ہم سے آگے تھے۔

”وہ دونوں ایک دوسرے کو ناپسند کرتے ہیں اور اس دوران ایک دوسرے کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں جبری ایسا نہیں ہے۔“ سیلی نے کہا۔ ”ذاتی اختلافات کے لیے وہ ریس جیتنے کے امکان کو خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔ کیا تم انہیں بے وقوف سمجھتے ہو؟“

بعد میں بارٹ ہمیں راستے میں ملا۔ ریس کے اصول کے تحت اس نے اپنی گاڑی ایک طرف کر کے ہمیں سہقت حاصل کرنے کا موقع دیا۔

”کچھ آخر کے لیے بھی بچا لو سیلی!“ اس نے چیخ کر نصیحت کی۔ سیلی نے انتہات میں سر ہلایا اور ہم آگے بڑھ گئے۔

اسی انداز میں ہم کنیڈا تک پہنچ گئے۔ جہاں سے ریس کا مقررہ راستہ گھوم کر نوم کی طرف واپس جانا تھا۔ ہم وہاں پہنچے تو رک وہاں سے نکل رہا تھا۔ اب ہمیں مقررہ راستے سے ہٹ کر سفر کرنا تھا ورنہ فینک رک کی بو پا کر جگا رہ کھڑا کرویتا۔ سیلی اب بھی تروتازہ بیٹھ سے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن فوراً ہی جھکا لیا۔

لگ رہی تھی لیکن ریس کا دباؤ اب اس پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔

فینک نے پھیلتا شروع کر دیا اور ہمیں اندازہ ہو گیا کہ اب ہم رک کے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ ادھر برف باری شروع ہو گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد رک ہمیں نظر آیا۔ وہ رہنما کتے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو ریس میں شامل ہر کتے سے لڑنے پر تیار ہوا تھا۔ اس وقت میں نے پہلی بار جانا کہ وہ محبت کرنے والے ایک دوسرے سے بے نیاز اور رسماً بھی مل سکتے ہیں۔

”شائد ریس جاری ہے۔“ سیلی نے پوچھا۔ ”بالکل۔“ رک نے جواب دیا۔ ”گڈ لک۔“ گفتگو وہیں ختم ہو جاتی لیکن فینک ٹھٹک کر رہ گیا اور مسرت بھرے انداز میں رک کو دیکھنے لگا۔

”فینک!“ سیلی تحسانہ انداز میں چیخی چلو۔ اس نے چابک لہرایا۔ لیکن فینک اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ سیلی نے چابک برساتے خوشامدیں کیں چکارا لیکن فینک اڑا رہا۔

اسی دوران بارٹ بھی آ پہنچا اور مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

”رک فینک سو بے بازی نہیں جانتا۔“ سیلی نے کہا۔ ”وہ اب بھی خود کو توہارا کتا سمجھ رہا ہے۔ وہ بڑھا ضرور ہے لیکن اب بھی تمہارے کتوں کی رہنمائی کرنا چاہتا ہے۔“

”ذرا میرے لیڈر کو سنبھالو جبری۔“ رک نے مجھ سے کہا پھر اس نے فینک کے پاس آ کر تحسانہ آواز میں نکالیں فینک اس کے آگے کچھ سا گیا۔ جیسے اس کے حکم کی تعمیل کا اظہار کر رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں واضح طور پر ایک الجھا نظر آ رہی تھی۔ رک نے رک کی بو پا کر جگا رہ کھڑا کرویتا۔ سیلی اب بھی تروتازہ بیٹھ سے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن فوراً ہی جھکا لیا۔

”کیا کروں۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”میں کتوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“

سیلی اور میں خاموش رہے۔ ایسا لگتا تھا کہ فینک رک کی ایک نہ سنے گا لیکن رک بھی اڑا ہوا تھا۔

”اب میں سمجھ گیا۔“ رک نے مسکراتے ہوئے کہا اور سیلی کی گاڑی پر چڑھ گیا۔ چلو فینک۔“ وہ چیخا اور فینک نے سمجھا کہ اب وہ رک کا رہنما کرتا ہے ہماری گاڑی پھر حرکت میں آگئی تھی۔

سیلی اور رک نے اپنی جگہیں بدلیں۔ ”کتے کو دھوکا دینے کا یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں۔“ سیلی نے کہا۔

”اس بار تو کام آگیا لیکن آگے کیا ہوگا۔ آگے رہنا چاہوں گی تو یہ تمہاری وجہ سے میرا شیڈول برباد کر دے گا۔“

”قسمت پر بھروسہ کرو۔“ رک نے تسلی دی۔

●●●●●

ہم رئیس کے مقررہ راستے سے نیچے اتر آئے دور سے ہمیں رک کی ٹیم کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن اب فینک رک کی بو نہیں سونگھ سکتا تھا۔ برف باری بھی شدید ہو گئی تھی۔ سونٹ آگے بھی دیکھنا دشوار ہو گیا تھا۔ کتوں کو گھومت کھلانے کے بعد میں سو گیا تھا۔

جانے کتنی دیر ہوئی تھی کہ سیلی نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ معمولی سے آرام کے بعد کتے تازہ دم دکھائی دے رہے تھے اور چلنے کے لیے تیار تھے ہمیں یقین تھا کہ ہم رئیس جیت لیں گے۔

ہمیں اندازہ بھی نہ ہوا کہ اب ہم راستا بھٹک گئے سیلی کے انداز سے اب مایوسی بھٹک رہی تھی۔ ”پول لائن نظری نہیں آ رہی ہم راستا بھٹک گئے ہیں۔“ اس نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

برفستان کے سفر میں بھٹک جانا کوئی مذاق نہیں ہر سمت نیکر اس سفید برفانی صحرا ہزاروں ہفتوں جاری

رہتا ہے۔

”اب ہم بائیں جانب مڑیں گے۔“ سیلی نے فیصلہ سنایا۔ ”میرے خیال میں پول لائن اس طرف ہے اور ہم ایک ساتھ رہیں گے۔ ادھر ادھر منتشر ہو کر راستہ تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھ گئے۔“

اگلے دو گھنٹے ہم دونوں نے شدید کھچاؤ کے عالم میں گزارے۔ آسمان برف چھینکے جا رہا تھا اور ہوا میں سنسناری تھیں۔

”فینک“ مسلسل دائیں جانب دباؤ ڈال رہا ہے۔“ سیلی نے کہا۔

”میں اسے موقع دوں گی کہ یہ راستہ تلاش کر لے۔ اس کا انجام اس سے زیادہ خراب تو ہونے سے رہا۔“

اگلے نصف گھنٹے تک فینک مسلسل دائیں جانب دوڑتا رہا۔ پھر اچانک دنیا کا جمین ترین مظہر میں نظر آیا۔ ایک موسم زدہ لکڑی کا کھنپا میں نے راستے پر موجود نشانات کا جائزہ لیا۔ ”دو“ میں ہم سے آگے ہیں سیلی۔“ میں نے کہا۔

”بارت اور رک۔“ سیلی نے جواب دیا۔

کوئی ایک سیل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہمیں بارت نظر آیا۔ وہ مکمل طور پر برفانی انسان نظر آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی راستہ بھول بیٹھا تھا۔

پھر میں نے اس کے رہنما کتے کو فوراً دیکھا جو بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کی حالت تباہ ہو رہی تھی۔

”کسی نے میرے ساتھ بے ایمانی کی ہے۔“ بارت بہت برہم تھا۔ راستے میں خاندان جھاڑیاں بچھا دی گئی تھیں۔ اس موسم میں جب دس فٹ آگے دیکھنا بھی ممکن نہ تھا میرے کتے کے نیچے زخمی ہو گئے ہیں۔ مسلسل خون بہہ رہا ہے۔“

”کس نے کی ہوگی یہ حرکت؟“ سیلی نے پوچھا۔

”مجھے پتا چل جائے تو دیکھنا اس کا حشر!“ بارت نے کہا۔

مجھے اس لمحے بارت سے خوف آنے لگا۔ میں تصور کر سکتا تھا کہ کتنے بچھانے والے کے ساتھ وہ کیا سلوک کرے گا۔

”لیکن تم اب بھی جیت سکتے ہو۔“ سیلی نے کہا۔

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بس اب تو میں اس شخص کو پکڑنا چاہتا ہوں۔ جس کی یہ حرکت ہے اور یہ کوشش تمہیں روکنے کے لیے کی گئی تھی۔ نوم فیر کچھ تھی کہ ممکنہ فلاح تم ہو صرف فینک کے اڑیل پن کی وجہ سے میں آگے تھا۔“

ہم آگے بڑھ گئے ہم نے رفتار کم کر رکھی تھی کیونکہ ہم دوسری بار راستے سے ٹپس بھٹکنا چاہتے تھے۔ ہوا نے جو ہماری پشت کی طرف سے چل رہی تھی اچانک رخ بدل لیا۔ اب ہمیں ہوا کے تھپڑے سامنے سے پہنچے پڑ رہے تھے۔ پھر سیلی نے ایک جگہ گاڑی روک دی۔

”کوئی آ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”شاید رک۔“

لیکن وہ اولین نامی ڈرائیور تھا۔ ”تم نے رک کو کہا اور رک کیا؟“ سیلی نے اس سے پوچھا۔

”میں بھی نہیں بلکہ میں نے تو بارت کے سوا کسی کو بھی اور فینک نہیں کیا۔“ اولسن نے جواب دیا۔

”اچھا لڈ لک میں تو یہاں آرام کروں گا۔“

ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ سیلی نے پھر گاڑی روک دی۔ ”میرا خیال ہے کہ رک راستے سے بھٹک گیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”فینک اسے ڈھونڈنے کی صلاحیت رکھتا ہے کیوں نہ۔“ اچانک اس کے لہجے میں مسرت اور امید بھٹک اٹھی۔

”اور ہم رئیس بار جائیں۔“ ہمیں اپنا۔“ ہمیں

جیتنا ہے می کو بکا بن سے چند ہزار ڈالر ملیں گے۔ ہاں جاؤ گی تو می کے ایک ہزار ڈالر بھی ڈوب گئے۔“

”مجھے معلوم ہے مجھے نہ پڑھاؤ۔“ وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ ”اس رئیس کے نیچے پر بہت سی باتوں کا انحصار ہے۔ رک کا بھٹک جانا بظاہر اچھی بات ہے لیکن میرے اور رک کے درمیان فاصلے بڑھ جائیں گے جبری۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

”یہ ویسا ہی معاملہ ہے نا جیسا می اور پایا کے درمیان درد مالز پر پیش آیا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلادیا میں نے سوچا تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ ”می نے اپنی سوچ کے مطابق عمل کیا اور کامیاب رہیں۔“ میں نے جیسے خود کو یاد دلایا۔

”تم بہت پیارے بھائی ہو جبری۔“ اس نے مجھے تھپکی دی۔ ”مجھے اسی یاد دہانی کی ضرورت تھی۔“

سیلی نے فینک کو آواز دے کر گاڑی فینک نے کان اٹھا کر کچھ دیر فضا میں چاروں طرف سونگھا وہ پتکچایا جیسے کوئی سوال پوچھ رہا ہو۔

سیلی نے اپنا بازو بلایا اور فینک برف باری کی چادر میں گم ہو گیا۔

ایک آنٹ میں خود کو تھکا تھکا محسوس کرنے لگا۔ سیلی نے دوسرے کتوں میں سے ایک پیدائشی لیڈر کو آگے جوت دیا اور ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس میں ہمارا عمل دخل نہیں تھا۔ سب کچھ میکا کی طرح لپٹے سے ہوتا گیا۔ ہم راستے سے نہیں بھٹکے وقتاً فوقتاً آرام کرتے کتوں کو تازہ دم کرتے ہم بڑھتے رہے۔

چھتیس گھنٹے بعد ہم نوم کے قریب پہنچے تو لوگوں نے بتایا کہ ہم قریب ترین ٹیم سے دو گھنٹے آگے ہیں اور قریب ترین ٹیم رک کی تھی۔ مقام اختتام تک پہنچتے

یہ بچتے لوگوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ پھر اچانک ایک مخالف آواز ازا بھری۔

”ہاں! ایک کتا پیچھے چھوڑ کر آئی ہے۔ اسے مقابلے سے خارج کر دو!“

مقام انتظام سے سونگڑ ہلے سبکی نے گھڑی روک دی۔ ”ابھی ریس ختم نہیں ہوئی ہے۔“ اس نے لوگوں کو مخاطب کیا۔ ”ابھی میں راستے ہی میں ہوں۔“

لوگوں کی سمجھ میں اس کی بات آئی تو تالیوں اور نعرہ ہائے تحسین کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا ہم نے راک کرکٹوں کی مائل شروع کر دی اور ان کے پیچہ سہلانے لگے کچھ دیر ہم نے آرام کیا اور پھر گر مارم کھانا کھایا چوبی اور پاپا ہمارے لیے لائے تھے۔

ایک کوئی چیتا۔ ”ٹینک رگ کو لے کر آ رہا

”میں نے یہی خطرہ مول لیا تھا۔“ سیلی نے کہا اور پاپا نے تنہی انداز میں سر ہلادیا۔ ان کی نظریں ریکسن پر جمی ہوئی تھیں۔ جو بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ پھر کسی نے اسے سیلی کی حکمت عملی کے متعلق بتا دیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی ابھری اور وہ ریس کے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ پاپا چاہتے تھے کہ اس کا ارادہ واپس لیں۔

”تم کہیں نہیں جاؤ گے، احقر۔“ پایا نے دو قدم آگے بڑھ کر کہا۔

”کوئی فینک کو بنگ پوسٹ کر اس کرنے سے نہیں روک سکتا۔“

بکانن ہاتھ پاؤں چلانے لگا لیکن نتیجہ اس کے حق میں خراب نکلا۔ چند ہی لمحوں میں اس کی ناک لہلہا ہوا ہو گئی۔ پھر اس کے دو دانت جھڑے اور آخر میں وہ زمین پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ پایا بڑی نرمی سے اپنے ہاتھ پہلے رہے تھے۔

پھر ہمیں فینک نظر آیا۔ اس کی تھکی ہوئی ٹانگیں لرز رہی تھیں وہ یہ مشکل آگے بڑھ رہا تھا۔ لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا تھا اور میری رگوں میں خون کی گروٹس تیز ہو گئی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے راک کی ٹیم تھی۔

جیسے ہی فینک ہمارے پاس سے گزرا سیلی نے اپنی ٹیم کو اشارہ کیا اور ٹیم متحرک ہو گئی۔ ہینک پوسٹ ہم لوگوں نے رک سے پہلے کر اس کی تھی۔ مجمع خوشی سے بے قابو ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر فینک رک کی تلاش میں خود بھٹک جاتا اور اگر رک کو خود راستا مل جاتا تو مجی کے ایک ہزار۔

کچھ دیر بعد ہم گھر کی طرف جا رہے تھے۔ فینک
 ہماری گاڑی میں جتا ہوا تھا۔ پایا بہت خوش تھے کہ
 انہوں نے ایک نوجوان کو ایک اچھا سبق سکھا دیا
 ہے۔ ”تمہارے بوڑھے شوہر میں اچھی دھم ہے۔“
 انہوں نے نئی سے کہا۔

”مجھے کبھی اس پر شک بھی نہیں رہا۔“ می نے غصہ لہجے میں کہا۔

”اور مانگ یہ تمہارے ہاتھوں کے پرانے زخم پھر
سکھل گئے۔“

”پاپا یہ پرانے زخم کیسے گئے تھے؟“ میں نے

”یہ ان لوگوں کی مرمت کے نشان ہیں جو مانک کو پانی کا ڈر پوک کہہ کر چمینزرتے تھے۔“ مئی نے جواب دیا اور پاپا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

☆.....●●.....☆

اس رات رک ہمارے گھر آیا۔ وہ بڑی بے یقینی سے سیلی کو تنگی یاندھے دیر تک دیکھتا رہا پھر وہ دونوں ایک ساتھ مسکرا دیے۔

”بارٹ نے اوٹنگ کو پکڑ لیا ہے۔“ ریک نے کہا۔
اسی نے راستے میں جھاڑواں بجھائی تھیں۔ بارٹ

نے اس کی خوب مرمت کی اور اسے اتنی چھاڑیوں میں رگیدڈ لالا۔“

”جرم کی نوعیت کے لحاظ سے مناسب ترین سزا“ چاہیے نہ کہا، مگر اور سبکی نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن وہ دونوں اس سزا کے تصور ہی سے لرز کر رہ گئی تھیں۔

’اب فینک کی بات ہو جائے۔‘
 فینک اٹھ کر رک کی طرف بڑھ گیا۔ رک نے
 بڑی محبت سے اس کی پیٹھ پیچھے تپا دی۔

”اس کہتے نے مجھے خود تلاش کیا۔“ ریک نے کہا۔
 ”اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بری طرح جھٹک گیا
 تھا۔ پھر اس نے ریس کا مقصد رستا تلاش کیا پھر اس
 نے نویم تک کا میں میل کا سفر طے کیا میں جانتا تھا کہ
 سیلی دنگ پوسٹ کے قریب اس کی منتظر ہوگی۔ میں
 بہر حال اس کا بھی مقروض تھا۔ چنانچہ معاذے کے
 طور پر میں نے اسے گاڑی میں جوت دیا تاکہ یہ خوش
 ہو جائے۔ قریب پہنچ کر میں نے اسے آزاد کر دیا۔“
 ”تم بہت اچھے ہو رک۔“ سیلی نے کہا۔

”آدمی کی عمر سیکھنے ہی میں گزر جاتی ہے۔“ رک نے کہا۔ پھر وہ بابا کی طرف مڑا۔ ”اور مجھے کان کنی کے کام کو سپروائز کرنے کے لیے آپ کی خدمات درکار ہیں۔“

”میں کل ہی پہنچ جاؤں گا۔“ پاپا نے جواب دیا۔
 ”سبلی میں خینک کو خریدنا چاہتا ہوں۔“ رک نے
 کہا۔ ”اس کی قیمت بتاؤ۔“

”کیلر نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ تم سے اس کی آسانی قیمت وصول کروں گی۔“ سینی نے جواب دیا۔
”میں تیار ہوں جو کہو۔“ رک نے انگوٹھی نکالتے ہوئے کہا۔

☆ 1 2 3 4 5 ☆

لڑکے یہ تمہارے لیے ایک سبق ہے۔" پایا نے مجھ سے کہا۔

”اس طرح تم دشواریوں سے بچ سکتے ہو لیکن امریکا اب بھی ہے کہ تم بھی بم بیل جیسے دماغ کے مردوں کی طرح ترک اٹھا کر ہی سمجھو گے۔ ممکن ہے درد مانگتا نہ ہو ممکن ہے نوم ڈاک ریس نہ ہو لیکن کوئی اور موقع آئے گا اور کوئی لڑکی تمہیں اپنے ہاتھوں میں لے لی گی۔“

”ایسا میری بات سنیں جلد ہی میں بھی پورا مرد بن جاؤں گا مجھے بتائیں کہ مالک کے آئی دے کے پر کیا واقعہ پیش آتا تھا۔ خواہ وہ آپ کے لیے کیا ہی ذلت آمیز کیوں نہ ہو میرے دل میں آپ کی عزت کم نہیں ہوگی۔ آخر آج میں نے آپ کو پکانے کی شہکالی کرتے دیکھا ہے۔“

پاپا نے محی کو لورمی نے پاپا کو دیکھا پھر وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔ جیسے شادی شدہ لوگ بعض باتیں یاد کر کے ہنستے ہیں۔

”جس دوران میں پانی کے بہاؤ کا جائزہ لے رہا تھا تمہاری بی لان چار عورتوں کے ساتھ کانفرنس کر رہی تھیں جن کے شوہر انہیں پائو سمجھتے تھے پھر اچانک تمہاری می کسٹی چلا رہی تھیں۔ وہ چاروں عورتیں ان کی مدد کر رہی تھیں اور میں؟“ پاپا نے دو مرتبہ منہ کھولا اور تین مرتبہ تھوک نکالا۔“ اور میں کنارے کنارے چل رہا تھا۔ اسی طرح جس طرح انہیں چلانا چاہتا تھا۔ اس دن سے کچھ عرصے کے لیے میرا نام پانی کا ڈربوک پڑ گیا اور میرے ہاتھوں کو ورزش کا موقع ملتا رہا۔ بابا کا چہرہ پھر سرخ ہو گیا تھا۔

اگلے ہی لمحے می اور یا پاپا پھر قہقہے لگا رہے تھے۔

قانون کا بک

تیسیم صدر

مشرقیہ کرافٹ لائنز ایئر لائنز کے حادثہ میں جس میں ہر چاروں قانون دان اپنے منقلب کا انصاف حاصل کر رہے تھے۔ وہیں کہ تلامذہ اور معارف سے متعلقہ ملزم اور ملزم متعلقہ بن جاتا ہے۔

ایک چالاک وکیل کا اصول اس نے قانون سے کیا حاصل کیا ہے یہ کہ آپ حیران رہ جائیں گے

عدالت کا کمرہ خاصا خستہ حال اور نیم تاریک تھا۔ جیسے کہ اکثر عدالتوں کے کمرے ہوتے ہیں۔ سچ بھی خاصا گھسا پٹا نظر آتا تھا کیونکہ اس طرح کے عمر رسیدہ تجربہ کار آدمیوں سے انصاف کا پلڑا برابر رکھنے کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ وہ اپنی کرسی انصاف پر یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اپنے تخت سے اکتاپا ہوا کوئی بادشاہ۔ اس نے تھکی تھکی نظروں سے ملزم کی طرف دیکھا۔ اس کی کیس پرو فائل پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔ ”ملزم جارج منڈیز تم پر جوئیز کورٹ نے سرسری سماعت کے بعد ڈیٹ کی فرد جرم عائد کی ہے تم اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتے ہو؟“ ”نہی کہ میں مجرم نہیں بے گناہ ہوں۔“ جارج منڈیز نے اکھڑے لہجے میں جواب دیا۔ وہ ایک لمبے قد اور گہری رنگت والا مسکین تھا جو امریکی شہریت اختیار کر چکا تھا۔ اگر اس کے چہرے پر قانون اور طاقت سے بغاوت کے فطری رد عمل کے نتیجے میں نفرت نہ پھیل جاتی اور اس کے ہونٹ بھیجے ہوئے نہ ہوتے تو وہ خاصا اسارت آوی نظر آتا۔ ”کیا تمہارے پاس وکیل کرنے کے لیے رقم ہے؟“ سچ نے دریافت کیا۔ ”نہیں۔“ ملزم نے جواب دیا۔ اس نے سچ سے کہا۔ ”جناب پور آر رنز“ کے الفاظ غیر ضروری سمجھے تھے۔ ”اچھا تو تمہیں اس صورت میں عدالت کی جانب سے وکیل مہیا کیا جائے گا تا کہ تمہاری طرف سے اپنے دفاع کے قانونی تقاضوں کی تکمیل ہو سکے۔“ سچ نے ملزم کے چہرے اور لہجے سے چھلکی نفرت سے کوئی اثر لیے بغیر کہا۔ عدلیہ میں اپنی طویل ملازمت کے دوران اسے اس قسم کی بے شمار نفرتوں سے واسطہ پڑا تھا اب وہ خاصا بے حس ہو چکا تھا۔ ”میں وہی وکیل چاہتا ہوں جس نے جوئیز کورٹ میں میری طرف سے بیرونی کی تھی۔“ ملزم نے اسے قطعی اکھڑا دیا۔ ”وہ جوئیز کورٹ کا وکیل تھا جو صرف جوئیز کورٹ میں ہی مقدمے لڑ سکتا ہے۔“ سچ نے نرم لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”یہاں تمہیں اعلیٰ عدالت کی طرف سے ایسا وکیل مہیا کیا جائے گا جو سینئر کورٹ میں مقدمہ لڑنے کا اختیار رکھتا ہو۔“ ”مجھے وہی وکیل چاہیے جوئیز ہو یا سینئر۔“ منڈیز نے ضدی لہجے میں کہا۔ ”نہیں، تمہیں ایسا وکیل مہیا کیا جائے گا جسے سینئر کورٹ میں مقدمات لڑنے کا طویل تجربہ ہو

تا کہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔“ سچ نے قلم کی ٹوپی اتار کر ملزم کی کیس فائل پر کچھ تحریر کرتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ جوئیز کورٹ کے وکیل۔۔۔۔۔۔!“ ”میں اس کے سوا کسی وکیل سے بات بھی نہیں کروں گا۔ مجھے وہی وکیل پسند ہے۔“ ”عدالت کی کارروائی میں مداخلت مت کرو۔“ سچ نے پہلی مرتبہ کچھ برہم ہوتے ہوئے کہا۔ ”جوئیز کورٹ کے وکیل کو سینئر کورٹ میں مقدمہ لڑنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ بالخصوص جبکہ مقدمہ اتنی سنگین نوعیت کا ہو۔“ ”میں کسی دوسرے وکیل سے بات بھی نہیں کروں گا۔“ ملزم زور سے بولا۔ سچ کے جڑے بھیج گئے۔ اس کی پیشانی پر نقائیں پڑ گئیں۔ ”مقدمہ کی اگلی پیشی انیس تاریخ کو ہوگی۔ ملزم کو اس روز پیش کیا جائے۔“ اسے ملزم جارج منڈیز سے ٹھنسنے کے لیے عارضی طور پر بہترین محسوس ہوا تھا۔ ”لیکن میں کسی اور وکیل سے ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتا گا۔“ جب عدالت کا ہیلف اسے بازو سے پکڑ کر حوالات کے دروازے کی طرف لے جا رہا تھا تو ملزم نے زور زور سے کہا۔ ”سنا آپ نے۔“ مجھے صرف وہی وکیل چاہیے جس کا نام بشپ ہے مجھے انصاف چاہیے اس لیے میں اپنی پسند کا وکیل منتخب کرنے کا آئینی حق رکھتا ہوں۔ کیونکہ وہی ایک وکیل ایسا ہے جو۔۔۔۔۔۔!“ اس نے مزید جو کچھ کہا وہ سنا نہ جاسکا کیونکہ اب تک ہیلف اسے دروازے سے باہر لے جا رہا تھا۔ ”سنا اس نے ان اخباری

رپورٹوں کی توجہ اپنی جانب ضرور مبذول کر لی لی جو وہاں معمول کے مطابق اپنے اپنے اخبارات کے لیے عدالتی کارروائی نوٹ کرتے آئے ہوئے تھے اور انہیں اس انوکھے مطالبے میں اپنے اپنے اخبار کے لیے ایک دلچسپ خبر بن گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ڈینس بشپ کے کاندھے کچھ جھکے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود اس کی شخصیت میں خاصی کشش تھی۔ اس کا چہرہ بہت تروتازہ نہ تھی مگر اس کی مسکراہٹ اور پر خلوص لہجہ اس کی یہ کمزوری چھپا لیتا تھا۔ ”یہ کیا چکر ہے بشپ؟“ ڈینی چیف نے صبح کا اخبار اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ ملزم جارج منڈیز کون ہے اور کیوں تمہاری نام لے رہا ہے۔“ ”میں خود حیران ہوں چیف۔“ بشپ نے جواب دیا۔ ”جوئیز کورٹ میں سرسری سماعت کے موقع پر مجھے سرکاری طور پر اس کی طرف سے مقدمے میں بیرونی کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور ایسا کرنے کے بعد میں تو اسے بھلا ہی چکا تھا۔ اس کے بعد آج ہی اس کا نام سنا ہے میں نے۔“ ”تو پھر یہ اچانک اس کے دل میں تمہارے لیے اتنی محبت کیوں جاگ اٹھی ہے؟“ ”میں کچھ نہیں کہہ سکتا چیف۔“ بشپ نے کہا۔ ”میں نے اس سے وہی سلوک کیا تھا جو ملزم سے کرتا ہوں یعنی اسے ایک دو مرتبہ سگریٹ پیش کیے اس کی طرف سے اپنی بہترین صلاحیت کے مطابق مقدمے کی بیرونی کی لیکن

اس کے.....!"

"خیر جو بھی ہو رہا ہے وہ کچھ اچھا نہیں رہا اس سے ہماری نیک نامی میں کوئی اضافہ نہیں ہو رہا۔" ڈپٹی چیف کہنے لگا۔ "مگر عدالت میں چیف جج کریں کہنا کہ اسے تمہارے سوا کسی پر اعتماد ہی نہیں ہے اور.....!"

"لیکن چیف دیکھیے نا اس میں میرا کیا.....!"

"ہاں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے بَشپ۔" ڈپٹی چیف نے جواب دیا۔ "لیکن ایسا مطالبہ یہاں کے نظام میں بے جا مداخلت کے مترادف ہے۔ جوئیئر اور سینئر کورٹ میں مقدمہ لڑنے میں حفظ مراتب کا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ ہم اس سارے نظام کو درہم برہم نہیں کر سکتے۔ تین سال تک جوئیئر کورٹ میں مقدمات لڑنے کے بعد ہی کسی جوئیئر وکیل کو سینئر کورٹ میں مقدمے لڑنے کا اجازت نامہ ملتا ہے اور تمہیں تو لاء کانج سے یہاں آئے ہوئے ابھی آٹھ ماہ ہی ہوئے ہیں۔"

"جی ہاں مجھے معلوم ہے سر۔" بَشپ نے کہا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" ڈپٹی چیف نے اچانک سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہم جج صاحب سے ملنے جا رہے ہیں۔"

وہ لفٹ کے ذریعے چوتھے فلور پر چلے گئے جہاں سینئر کورٹ کے دفاتر واقع تھے۔ سینئر کورٹ کانج اپنے چیمبر میں تھا۔ وہ بھی اس روز کا اخبار دیکھ رہا تھا۔ ڈپٹی چیف اور بَشپ کو دیکھ کر اس نے اخبار میں چھپی ہوئی خبر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "یہ خبر بڑا غلط تاثر دے رہی

ہے مجھے اس کا انداز بالکل پسند نہیں آیا۔ اس سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ملزم منڈیز کو اپنی پسند کا وکیل منتخب کرنے کے آئینی حق سے محروم کر دیا ہے۔" اس نے ڈپٹی چیف کو گھورا۔ پھر اس نے بَشپ کی طرف سوالیہ انداز میں گھورتے ہوئے کہا۔ "اور میرے خیال میں بَشپ تمہارا ہی نام ہے؟ اس ملزم کے چہیتے وکیل تم ہی ہو؟"

"جی ہاں یور آنر لیکن.....!" بَشپ نے نروس لہجے میں کہا۔

"سر۔" ڈپٹی چیف نے جلدی سے لقمہ دیا۔ "اس بے چارے کا اس میں کوئی قصور نہیں اس کا کہنا ہے کہ یہ تو سرسری سماعت کے بعد بھول بھی چکا ہے کہ ملزم ہے کون۔"

"ہو سکتا ہے۔" جج نے اسی لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ مجھے اس سوال کا جواب تو دے سکتا ہے کہ ملزم کو آئین کے تحت پسند کا وکیل حاصل کرنے کے حق کے بارے میں کسی نے کچھ دیا ہے۔ ایک ان پڑھ اور اکھڑ مزاج آدمی کو اپنے آئینی حقوق کا علم نہیں ہوتا۔ اسے ضرور کسی نے بتایا ہے؟" ڈپٹی چیف نے اس مرتبہ اپنے ماتحت بَشپ کی طرف سے صفائی پیش کرنے کی جرات نہیں کی۔ اس نے سوچا کہ اس طرح کے چہیتے ہوئے سوال کا جواب خود متعلقہ فرد کو ہی دینا چاہیے۔

"م..... میں نہیں جانتا یور آنر۔" بَشپ نے لرزرتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اس سے پہلے بھی وہ ایک دوسرے معمولی نوعیت کے جرائم میں قید بھگت چکا ہے۔ ممکن ہے انہی دنوں کسی وکیل نے اسے یہ باتیں بتائی ہوں یور آنر۔"

مجھے امید ہے آپ نے یہ قیاس نہیں لگایا ہوگا کہ اسے یہ باتیں بتانے والا میں.....!"

"میں کبھی قیاس نہیں لگایا کرتا۔" جج نے حکمت سے جواب دیا۔

"میں صرف حقائق کو ترازو میں تول کر فیصلہ کرتا ہوں۔ میرا کام انصاف کرنا ہے نو جوان اور تمہارا کام صرف جوئیئر کورٹ میں آنے والے مفلس ملزمان کا دفاع کرنا ہے سمجھے۔"

"جی..... جی ہاں..... یور آنر۔"

کمرے میں بو جھل سناٹا اچھا گیا۔ آخر ڈپٹی چیف نے ڈرتے ڈرتے خاموشی کا قفل توڑا۔ "سر اب ہم کیا کریں گے اس مقدمے کے بارے میں؟"

"اس منحوس خبر کے چھپنے کے بعد مسئلہ اور الجھ گیا ہے۔" جج نے اخبار پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اس لیے ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ علامتی طور پر سہمی۔ کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا پڑے گا ورنہ اخبارات میں عدلیہ پر تنقید شدت اختیار کر لے گی۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کیس کو ایلیٹ بورڈ کے پاس بھیج دوں گا وہی کوئی روٹنگ دیں گے مقدمے کا فیصلہ وہاں سے روٹنگ آنے کے بعد ہی کیا جائے گا اور اس دوران میں....." اس نے ڈپٹی چیف کو گھورا۔

"میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم ذرا اپنے دفتر پر کڑی نظر رکھو۔ ڈسپلن کا خیال رکھو جوئیئر وکیلوں کو اپنے قابو میں رکھو انہیں ملزموں سے زیادہ غرض ہونے کا موقع نہ دو۔ پریس والوں سے بھی خبردار رہو۔ اس طرح کی باتیں تمہیں خود بھی سوچنی چاہیے۔"

"لیس سر میں ایسا ہی کروں گا۔" ڈپٹی چیف

نے سیدتان کر کہا۔

ایلیٹ بورڈ نے اپنی روٹنگ ملزم جارج منڈیز کے حق میں دیتے ہوئے کہا۔ "ہر ملزم کو اپنی پسند کا وکیل منتخب کرنے کا آئینی اور قانونی حق حاصل ہے۔ عام طور پر مفلس ملزموں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ مردہ نظام کی حدود میں رہ کر ہی حکومت کی طرف سے مہیا کردہ قانونی مشیران میں سے اپنے لیے وکیل کا انتخاب کریں۔ تاہم اگر کوئی ملزم کسی خاص وجہ سے اس مردہ دائرہ کار کے باہر سے بھی اپنے لیے وکیل کا انتخاب کرنا چاہے تو عدالتوں کا فرض ہے کہ اس کی خواہش کا احترام کریں۔"

جج نے ایلیٹ بورڈ کی روٹنگ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بڑے پُر وقار لہجے میں کہا۔

"ہم عدالت میں ہر شخص کو مکمل انصاف کی ضمانت دینے کی خاطر بیٹھے ہیں اور اس مقصد کے حصول کی خاطر قوانین کی رکاوٹ کو عارضی طور پر دور کرنے پر بھی تیار رہتے ہیں۔" اس کے چیمبر میں اس وقت ڈپٹی چیف اور جوئیئر وکیل ڈنٹس بَشپ بھی موجود تھے۔ "اور انصاف کی خاطر قوانین کی رکاوٹ کو ہٹا دینا ہماری شاندار جمہوری روایات کا مظہر ہے۔" جج نے بڑے فخر سے کہا۔ پھر اس نے ایک فراموشی خالصہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بَشپ کی طرف دیکھا اور بڑی شفقت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اس نو جوان ذہین وکیل کو فوری طور پر ملزم جارج منڈیز کا وکیل مقرر کر رہا ہوں۔ سینئر کورٹ میں یہی اس کا مقدمہ لڑے گا۔ کیونکہ ملزم کی خواہش

یہی ہے اور میں نے اس کے آنکھیں حق کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے اس کی بات مان لی ہے۔

اب ہر شخص مسکرا رہا تھا۔ جج ڈپٹی چیف اور بشپ۔ جبکہ پریس رپورٹر لکھنے میں اور فوٹو گرافر تصویریں لینے میں مصروف تھے۔ جمہوریت کا بول بالا ہو رہا تھا۔

اسکے روز اخبارات میں شائع ہونے والی پریس کانفرنس کی روداد بڑی متوازن تھی۔ جج کی تصویر بہت اچھی آئی تھی۔ وہ اپنی حقیقی زندگی سے زیادہ خوش مزاج اور عقل مند نظر آ رہا تھا۔ ڈپٹی چیف کی تصویریں بھی اچھی تھیں اور اس کے چہرے پر رحمت کے بجائے شفقت پھیلی ہوئی تھی اور جوئیز وکیل بشپ تو عام زندگی میں بھی خاصی پرکشش شخصیت کا حامل تھا۔ اس لیے اس کی تصویر بہت اچھی آئی تھی۔ تصویر میں اس کے کاندھے بھی جھکے ہوئے نظر آتے تھے۔

”ہوں تو بات بن گئی۔“ ملزم جارج منڈیز نے حوالات کے ملاقاتی کمرے میں اپنے مشیر جوئیز وکیل ڈینس بشپ سے مخاطب ہو کر کہا جو اس کے رو برو بیٹھا ہوا تھا۔ بشپ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کچھ دور کھڑے گارڈ کو مخاطب نظر دے دیکھا جو وہاں اس غرض سے کھڑا تھا کہ ملاقاتی حوالاتیوں کو کوئی ایسی چیز نہ دے سکیں جو قوانین کے تحت ممنوع تھی۔

”اچھا اب آگے کیا ہوگا؟“ جارج منڈیز نے پوچھا۔

”اب سماعت ہوگی تمہارا جرم ثابت ہو جائے گا اور تمہیں جیل بھیج دیا جائے گا۔“

”لیکن یاد رہے بشپ۔ میں دوسرے پہلے

بھی قید بھگت چکا ہوں۔“ جارج منڈیز نے شاید بیاسویں مرتبہ جوئیز وکیل بشپ کو یاد دلایا۔ ”اس لیے مجھ سے کوئی رعایت نہیں تری جائے گی۔ مجھے کم از کم بیس سال قید کی سزا ہوگی۔“

”فکر نہیں۔“ بشپ نے جواب دیا۔ ”قیدی تو ہوگی۔ وہ تمہیں چھائی تو نہیں دے سکتے۔ قید کا جہاں تک تعلق ہے وہ تمہیں عمر قید کی سزا بھی دے ڈالیں تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تم ایک سال کے اندر اندر چھوٹ جاؤ گے۔ کیونکہ عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل تو کی جاسکتی ہے اور یہی مرحلہ ہے جہاں میرا منصوبہ مکمل میں آئے گا۔“ وہ کچھ آگے کو جھپک کر اس سے سرگوشی میں کہنے لگا۔ ”سنو جو نہی تمہیں جیل بھیجا جائے گا میں سپریم کورٹ میں اس فیصلے کے خلاف اپیل کروں گا۔ میرا پہلا موقف یہ ہوگا کہ تمہاری طرف سے اپنی پسند کا وکیل منتخب کرنے کے مطالبے کے باوجود ایملٹ بورڈ نے مجھ جیسے نا تجربہ کار جوئیز وکیل کو تمہارے مقدمے کی پیروی کی منظوری دے کر غلطی کی ہے کیونکہ عدالت کا اولین مقصد کسی ملزم کے مفادات کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس لیے ملزم اگر نادانستگی میں کوئی ایسا مطالبہ کر بیٹھتا ہے جو درحقیقت اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے تو ایسا مطالبہ ماننا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہوتا ہے اور میرا دوسرا موقف یہ ہوگا کہ اس مقدمے میں تمہارے مطالبے کی وجہ سے فاضل جج کو پریس کی بے جا تنقید برداشت کرنا پڑی جس کی وجہ سے فاضل جج کو لاشعوری طور پر تم سے نفرت ہو گئی اور وہ مقدمے کا فیصلہ کرتے وقت تعصب اور جانبداری کا شکار ہو گیا۔ چنانچہ

ہر صورت میں سپریم کورٹ کو اس اپیل پر میرے حق میں فیصلہ کرنا پڑے گا اور تم صاف چھوٹ جاؤ گے مجھ کے میرا منصوبہ؟“

”ہاں۔“ جارج منڈیز نے سیٹ لیجے میں جواب دیا۔ ”خدا کرے کہ یہ منصوبہ کامیاب ہی رہے۔“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ بشپ نے گارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس کی نظر ایک سڈول بدن سنہرے بالوں والی خوب صورت لڑکی پر پڑ گئی جو ملاقاتی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس لڑکی نے بڑی چست پتلون پہن رکھی تھی جس سے اس کا قیامت خیز بدن اور بھی پھان اٹھ رہا تھا۔ ”یہ تو تمہاری بیوی بھی آگئی میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔“

”یہ..... اس کم بخت میرا کو میں نے ہدایت کی تھی کہ اس طرح کی تنگ پتلون پہن کر یہاں نہ آیا کرے۔ ذرا دیکھو اس حرام زنا کے گارڈ کو کہنی جھوکی نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے۔“ جارج منڈیز غراپا۔

”کوئی بات نہیں، تحمل سے کام لو۔“ بشپ نے کہا۔

”ہو جبہ تحمل..... یہ ذلیل لوگ میری بیوی کو ان نظروں سے دیکھیں اور میں.....! منڈیز کا چہرہ غصے سے لال سمجھو کا ہو گیا تھا۔

”میں کہتا ہوں ٹھنڈے رہو۔“ بشپ کے لیجے میں سختی اور حکم تھا۔ ”اس وقت کوئی ہنگامہ کھڑا کرنے کا نتیجہ جانتے ہو کیا ہوگا؟ جب میں اپیل کروں گا تو یہاں سے یہ لوگ ہمارے خلاف رپورٹ دیں گے جس سے اپیل کی منظوری بے حد مشکل ہو جائے گی۔ اس وقت

کسی گارڈ سے بھی دشمنی مت مول لو سمجھے؟“ ”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو بشپ۔“ منڈیز نے کہا۔

”میرا اب قریب آ چکی تھی۔“ ہیلو منڈیز۔ ”بشپ اسے دیکھ کر مسکرایا اور اپنا بریف کیس بند کرتے ہوئے بولا۔ ”بس میں جاتی رہا تھا اچھا منڈیز بائے بائے۔“

بشپ وہاں سے چلا تو سڈول متناسب بدن کی لڑکی اس کی نشست پر بیٹھ گئی۔ بشپ نے راستے میں کھڑے تین چار گارڈوں کی نگاہوں کا زاویہ بدیکھ کر سوچا۔ جارج منڈیز ٹھیک ہی کہتا ہے۔ واقعی یہ سب لوگ اس حسینہ کی تنگ پتلون میں کسا ہوا سڈول جسم دیکھ رہے ہیں اور وہ ہے بھی اسی قاتل دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھو۔

عوام الناس بنام جارج منڈیز کے مقدمے کی سماعت صرف ڈیڑھ دن تک جاری رہی۔ جوئیز وکیل ڈینس بشپ نے اپنی نوعمری اور محدود تجربے کے باوجود ملزم کی طرف سے اس کے مقدمے کی پیروی بڑے موثر انداز میں کی۔ وہ مقدمہ لڑنے کے لیے خوب اچھی طرح تیار ہو کر آیا تھا۔ اس نے سرکاری گواہوں پر جرح کرنے میں بھی بڑی ذہانت اور ہوشیاری کا ثبوت دیا اور خواہ مخواہ ٹھیکریکل انداز اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک منجھا ہوا وکیل لگ رہا تھا۔ فرد جرم کے مبنی بر حقیقت ہونے کے خلاف اس کے دلائل میں خاصا وزن تھا۔ اس نے اپنے موکل کی بے گناہی کے ثبوت میں تمام شاہد بڑی ترتیب سے پیش کیے اور جج اور جیوری کے علاوہ پریس اور تماشا بینوں پر بھی اچھا تاثر ڈالنے میں کامیاب رہا۔

تاہم ہوا وہی جس کی پیش گوئی مٹرم جارج
تذہب نے کی تھی۔ وکیل کی ذہانت اور دلائل
اپنی جگہ درست سہی مگر مٹرم پر جرم ثابت ہو گیا۔
اسے تیس سال کی سزا سنائی گئی۔ شاید سزا دیتے
ہوئے نتائج متعصب ہو گیا تھا یا مجرم کا پہلے سے
سزا یافتہ ہونا اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا
تھا۔ بہر حال مٹرم کو سزا سنائی گئی تو بھی وکیل
ڈینش ہشپ کے چہرے پر گرد ملائی نہ تھی۔ اس
نے تو اپنی ہی گرد بھی تھی۔

”یاد رکھنا ہشپ۔“ جارج منڈر نے جیل کی طرف جانے سے پہلے ہشپ سے کہا۔ ”تم نے ایک سال کہا تھا ایک سال یعنی تین سو پینسٹھ دن اس عرصہ میں مجھے رہا ہو جانا چاہیے۔“

”میں نے تمہارے کہنے پر ہی یہ سب کچھ کیا۔ ورنہ میں کوئی اچھا اور سینئر وکیل بھی حاصل کر سکتا تھا۔ مگر یہ تمہارا منصوبہ تھا میں نے اس پر حرف بحرف عمل کیا ہے۔“

”ہاں، فکر مت کرو۔“

”اب مجھے یہاں سے ایک سال کے اندر اندر نجات ملے تو بات بنتی ہے۔“

جارج منڈیز نے زہر خند کرتے ہوئے کہا۔
 ”ہونہہ فکر مت کرو، فکر مت کرو۔ تمہیں اور میرا
 کو بس یہی الفاظ یاد ہیں۔ فکر مت کرو۔ فکر کیسے
 نہ کروں جیل میں رہنا کوئی شغلوار کام تو نہیں
 ہوتا۔ جتنی جلدی اس ذلیل جگہ سے جان
 چھوٹے اتنا ہی اچھا ہے۔“

بشپ نے پھر اسے تسلی دی۔ اتنے میں ایک اور پولیس کانسٹیبل نے جارج منڈیز کو جیل لے

”جی ہاں سر! اسی لیے میں نے اسے خود تک محدود رکھا تھا۔ کیونکہ اس کیس کے سلسلے میں ہمیں پہلے ہی خواہ مخواہ کی پبلسٹی حاصل ہوئی ہے جو کسی طرح بھی ہمارے لیے اچھی ثابت نہیں ہوگی۔“

”ہاں بپ یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔“ ڈپٹی چیف نے جواب دیا۔

”تم نے واقعی بڑی عقل مندی کی بات کی ہے۔“ وہ تھوڑی کھجھکے ہوئے کہہ رہا تھا۔
”اور ہاں بشپ میں کوشش کروں گا کہ تمہاری نا
تجربے کاری کے باوجود تمہیں جلد از جلد سینئر
وکیل کا درجہ مل جائے کیونکہ تم نے اس کیس میں
خاصی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ بٹشپ نے مسکرا کر کہا۔

جب ایشپ اپنے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں
واپس آیا تو شام بڑ چکی تھی۔ وہ چند لمحوں تک
اپنے مختصر عمر آ راستہ اور صاف ستھرے ڈرائنگ
روم میں کھڑا رہا۔ ریکارڈنگ پلیئر پر ایک
ٹانگ لے ریکارڈ چڑھا ہوا تھا اور نضا میں ایک
بڑی سرگمی و جن بکھوڑے لے دی تھی کھڑکیوں
کے خوش رنگ ویز پر وہ گرے ہوئے تھے اور
نیلے رنگ کا بلب کمرے میں ایک خواب ناک
سے احوال کو جنم دے رہا تھا۔ قالین پر فوم کے
دو گلوے رکھے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک
بڑے گنن میں شراب کی بوتل لگی ہوئی تھی اور دو
بلوریں جام رکھے ہوئے تھے۔

خواب گاہ کی طرف سے شاہد چلنے کی ہلکی
ہلکی آواز آرہی تھی۔ ہشپ آہستہ سے اس
طرف بڑھ گیا اور ہاتھ روم کے بلوریں

دروازے سے منہ لگا کر بولا۔ ”ڈارلنگ دیکھنا اپنی زلفوں پر پانی نہ پڑنے دینا۔“ بلوریں دروازے میں سے شاور کے نیچے ایک ریشمیں جسم کا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نسوانی ہیولے نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور شاور بند کرتے ہوئے کہا۔ ”فکر نہ کرو ڈیئر۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میرے بالوں کو خشک ہی دیکھنا پسند کرتے ہو۔“

باہر آنے سے پہلے سے اس لڑکی نے ایک بڑا سائتولید لپیٹ کر اپنی قیامت خیزیوں کو کچھ حد تک چھپانے کی کوشش کی اور اور پھر اپنی ریشمیں سنہری زلفوں کو ایک ادا کے ساتھ جھٹک کر باہر آ گئی۔

”سناؤ ڈیڑھ کوئی مشکل تو نہیں پیش آئی؟“
 ”نہیں سب ٹھیک ہے۔“ آج اچیل کا
 آخری دن بھی گزر گیا۔ اب وہ بیس سال تک
 اندر رہے گا۔“

”دویری گڈ“ میری اسٹھار میز کے پاس جا کر بالوں میں برش پھیرنے لگی۔ ہنسی پیار جھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ جارج منڈریز کی بیوی تو لیے میں بھی اتنی ہی آفت جاں تھی جتنی ٹائٹ چٹائوں میں۔

”ڈارلنگ! عفریب مجھے سنکر دکیل کا درجہ ملنے والا ہے۔ پھر ہم ایک بڑا ایوارڈمنٹ لے لیں گے۔“ ہشپ نے جارج منڈریکی پیوی اور اپنی محبوبہ سے کہا۔

اے دل سے لہار کا احوال وہ لہار کب تلاش میں در در پہلے رہا تھا۔ ہمراہ روزِ اجالہ اس کا مطلوبہ اس کے سامنے لکھا۔ کمالِ قلم کے کائنات میں جنم لینے والے انوکھے صحت کا احوال۔

تھکے تھکے لوگوں کے لیے ایک نئی پگھلی ٹکڑی تھی

دن بہت اداس تھا سارا شہر جیسے سانس نہیں کر رہا تھا۔ ہر شے بے کیف اور پھکی پھکی محسوس ہو رہی تھی دل کے پھٹنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی وجہ یہ تھی کہ جولی نے میری شادی کی پیش کش ٹھکرا دی تھی اپنے ٹھکرائے جانے کے دوسرے روز میں حسب معمول لٹچ کے دقت سینڈویچ زیر مار کرنے اپنے یار سام کے اسٹیک پختہ کیا۔ سام نے مجھے غور سے دیکھا اور سینڈویچ تیار کرنے کے لیے ٹائمر کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

”کہو عزیزم! کیا رہا؟“ وہ ایک ذہین شخص تھا۔ فوراً معاملہ بھانپ لیا کرتا تھا لہذا اس سے کچھ چھپانا فضول تھا۔

”اس نے صاف انکار کر دیا۔“ میں نے ایک سرد آہ بھری۔

”میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا۔“

”حیرت ہے۔“ اس کے چہرے پر غور و فکر کی پرچھائیاں لہرائے لگیں۔ ”تمہارے جیسے مخلصی اور عمدہ لڑکے کو اس نے کیوں ٹھکرا دیا۔ میں تو اب تک یہی سمجھتا آیا تھا کہ تم کسی بھی لڑکی کے لیے ایک اچھا شکار ثابت ہو سکتے ہو۔“

”جولی کے لیے نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ میں اس کے ٹائپ کا نہیں ہوں اور یہ کہ وہ مجھے اپنے باپ سے متعارف کرانے کی جرأت چیں کر سکتی۔ اس کا باپ بینک کا منیجر ہے۔“

”اس نے ایسی بات کہہ دی؟“ سام حیرت اور افسوس کے ملے جلے جذبات کے تحت میری جانب دیکھ کر بولا۔ ”شاید اس کی وجہ تمہاری ایسی لمبی زنجیر اور رنگ برنگ لباس ہو جسے تم بے حد شوق سے پہنتے ہو۔“

میں نے افسردگی سے سر ہلایا۔ سام نے سینڈویچ میری جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”کافی پیو گے یا چائے؟“

”کافی۔“ میں نے دوبارہ ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ”تیز اور بالکل سیاہ۔“

اس وقت نہ تو مجھے کچھ کھانا پینا اچھا لگ رہا تھا اور نہ کسی سے گفتگو کرنے پر طبیعت آمادہ ہو رہی تھی لہذا جب سام میرے پاس سے ہٹ کر دوسرے گاؤں کی جانب متوجہ ہو گیا تو مجھے کچھ سکون ہوا اور میں سینڈویچ کھاتے ہوئے اپنے خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔

سینڈویچ کا ذائقہ لمبی ریت جیسا تھا لیکن اس وقت میں اس کے ذائقے کے بارے میں

نہیں بلکہ اپنے سیلون کے بارے میں سوچ رہا تھا جہاں میں میئر ڈریسر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ جولی کی نگاہ میں یہ پیشہ نہ صرف گھٹیا بلکہ زہنا تھا۔ ممکن ہے اس کا خیال درست ہو اس نے کہا تھا۔

”اگر تم صرف مردوں کے بالوں کی آرائش ہی کرتے تو کوئی بات بھی تھی۔“

”لیکن میں مردوں کے بالوں کی بھی آرائش کرتا ہوں۔“ میں نے یقین دلاتے ہوئے کہا تھا۔ ”ہمارے سیلون میں زنانہ اور مردانہ دونوں بالوں کی آرائش کی جاتی ہے۔“

”اصلی مردوں کی بات کرو۔“ اس نے لفظ اصلی پر زور دے کر کہا۔ ”شانوں تک لہراتی ہوئی زلفوں والے بھانڈوں کی بات مت کرو۔“

اس کی اس بات نے مجھے برہم کر دیا تھا۔ اس کا اشارہ واضح طور پر میری جانب تھا۔ وہ مجھے بھانڈا سمجھتی تھی کیونکہ میری زلفیں بھی شانوں تک پہنچتی تھیں۔ میرے بارے میں اس کا یہ خیال خاصا تکلیف دہ تھا۔ اس طرح اس نے میری تذلیل کی تھی۔ میں نے سینڈویچ کا آخری ٹکڑا حلق سے اتارتے ہوئے بے خیالی میں اپنی کافی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور گر مار کر کافی کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا لیکن دوسرے ہی لمحے پکڑا گیا۔

”سام۔“ میں چیخا۔ ”تم نے یہ کیسی کافی تھما دی ہے؟“

سام کافی کی مشین کے عقب میں اپنے کام میں مصروف تھا اس نے مشین کے شور میں میری آواز نہیں سنی لیکن جواب کسی اور نے دیا۔

”معاف کیجیے گا۔“ دوسرے ہی لمحے ایک نسوانی آواز میری سماعت سے لگرائی۔ ”آپ نے میری آدھی پیالی چائے پی لی ہے۔“

میں نے گردن موڑ کر اپنی بغل میں براجمان دوشیزہ کو گھورا۔

”تو یہ انتہائی بد مزہ چائے تمہاری تھی۔ اس نے تو میرے گلے میں خراش ڈال دی ہے۔“ میں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

اس نے تیوری پر بل ڈال کر مجھے جواباً گھورا اور اپنی بے ترتیب زلفوں کو غصے سے جھٹک کر بولی۔

”یہ تمہاری سیاہ کافی سے لاکھ درجے خوش ذائقہ تھی اور اگر تم میرے لیے دوسری چائے کا آرڈر دے دو تو مجھے خوشی ہوگی۔“

”سنو۔“ میں نے غصے سے جواب دیا۔

”میں نے ایک کپ کافی کے پیسے ادا کیے ہیں۔“

”لیکن تم نے میری چائے پی لی ہے۔“ وہ کاؤنٹر پر ہاتھ مار کر بولی۔ ”میں یہاں کی انتظامیہ سے شکایت کر دوں گی۔“

”سام۔“ میں دوبارہ چیخا۔

سام نے کاؤنٹر کے عقب سے جھانک کر پہلے اس لڑکی کے گلابی چہرے اور پھر میرے چہرے کی جانب دیکھا جس کی رنگت ازگی تھی۔ اسی لمحہ میں نے پہلی بار اس لڑکی پر بھرپور نظر ڈالی۔ وہ صورت آشنا معلوم ہوئی۔

میں نے اسے ذہن پر زور دے کر اسے پہچاننے کی کوشش کی اور مجھے یاد آ گیا کہ میں

نے اسے پہلے بھی ایک بار لٹچ کے اوقات میں اسی اسٹیک میں دیکھا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ سام ہمارے قریب پہنچتا ہوا بولا۔ ”تم دونوں کس بات پر جھگڑ رہے ہو؟“

”اس نے میری چائے پی لی ہے۔“ لڑکی احتجاجاً چیختی۔

”اس نے میری کافی کی پیالی کہیں چھپا دی ہے۔“ میں بھی احتجاجاً چیختا۔

”صبر۔“ سام ایک ہاتھ بلند کرتا ہوا بولا۔ ”ایک وقت میں ایک ہی فرد ہیانا کرے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے سے واقف ہو۔“

”ہم ہرگز ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔“ لڑکی نے تند لہجے میں کہا۔

”یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔“ سام نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”تم دونوں کی عادات و خصائل اس قدر مشترک ہیں.....“ اس نے رک کر شانے اچکائے۔ ”بہر حال شور مت کرو میرے گاہک پریشان ہو جائیں گے۔ بہتر ہے کہ میں تم دونوں میں تصفیہ کروا دوں۔“ اس نے ٹھنڈی چائے کی وہ پیالی کاؤنٹر سے ہٹا کر دوسری چائے کی پیالی رکھ دی۔

”اور میری سیاہ کافی؟“ میں غرایا۔ سام نے جاتے ہوئے مڑ کر میری جانب دیکھا۔

”اور اس چائے کے پیسے کون ادا کرے گا؟“

”میں ہرگز ادا نہیں کروں گا۔“ میں نے

تیز لہجے میں کہا۔ ”میں نے تو وہ پیالی دیکھی تک نہیں تھی۔“

لڑکی کا گلابی چہرہ غصے سے مزید گلابی ہو گیا۔ ”میری طرف اس طرح مت گھورو۔“ اس نے آنکھیں نکالیں اور چائے کی ایک چسکی لی۔

”عجب لڑکی ہے۔“ میں نے دل میں کہا۔

اپنے جلیبے سے وہ سام کی گاہک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اس نے گرہیں سے آلودہ جنیز بہن رکھی تھی اور اس کے گیسو اتنی بے ترتیبی سے ترشے ہوئے تھے کہ لگتا تھا کسی بچے نے انہیں گھر میں استعمال ہونے والی پینٹی سے تراشا ہوا گالوں پر بھی گرہیں کے دھبے پڑے تھے۔

ایک وہ پیسٹریائی انداز میں زور زور سے قہقہے لگانے لگی اور سارے گاہک مڑ کر اسے حیرت سے گھورنے لگے۔

”معاف کرنا۔“ چند لمحوں کے بعد وہ اپنی ہنسی پر قابو پا کر بول پڑی۔ ”مجھے اس طرح قہقہے نہیں لگانے چاہیے تھے لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس وقت تمہاری صورت سے ویسی ہی بے زاری ٹپک رہی ہے جیسی میرے ڈیڈی کی صورت سے اس وقت چلتی ہے جب میں گیمراج سے گرہیں میں تھڑی ہوئی گھر واپس آئی ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ عورتوں کے لیے ملکینک کی حیثیت سے انجین وغیرہ میں دلچسپی لینا مناسب نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں کسی بینک میں یا بہت بڑے ملو سال اسٹور میں ملازمت کروں۔“

”میں سمجھ گیا کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“ میں نے غرایا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گالوں پر

پڑے ہوئے دھبوں کے باوجود وہ ایک بہت ہی برکش لڑکی تھی اور اگر اس کے بہ ترتیب گیسوؤں کو ترہینے سے تراشا جاتا تو اس کی جج دج دیکھنے کے قابل ہوتی۔ اس نے میری جانب مسکرا کر دیکھا اور میرے دل کی تباہی ڈول گئی۔ مجھے اس کی یہ مسکراہٹ بے حد دل نشین لگی اور میں پہلی بار اپنے دل میں فرحت اور تازگی محسوس کرنے لگا۔ اس کی مسکراہٹ سے دل میں فرحت اور تازگی محسوس کرنے لگا۔

اس کی مسکراہٹ نے میری ساری اداسی گویا نچوڑ دی تھی۔ اسی دوران سام مسکراتا ہوا کاؤنٹر کے دوسرے سرے پر نمودار ہوا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی و شرارت کی چمک تھی۔ اس شے نے مجھے مفلک کر دیا۔

”مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تم دونوں دوستانہ فضا میں گفتگو کر رہے ہو۔“ اس نے

کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ میرے گاہک ہمیشہ اسی طرح دوستانہ ماحول میں گفتگو کیا کریں۔ اس سے کاروبار پر خوش گوار اثر پڑتا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے کافی مشین کے برابر

رکھی ہوئی کافی کی پیالی کی جانب اشارہ کیا۔ ”دیکھو!“ اس کے لہجے میں کھسیاہٹ تھی۔ ”بالکل ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ میرے خیال میں یہ تمہاری کافی ہے“ میں مصروفیت کی وجہ سے اسے وہیں رکھ کر بھول گیا تھا۔ خیر کوئی بات نہیں یہ رہی دوسری گرم کافی۔“

اس نے تازہ کافی کی دوسری پیالی میری جانب بڑھادی اور ساتھ ہی آنکھ ماری۔ وہ لڑکی دوبارہ میری جانب دیکھ کر مسکرائی اور مکمل ہوتے ہوئے رہ گیا۔ کس غضب کی

مسکراہٹ تھی ظالم کی لیکن اس کی یہ مسکراہٹ مجھے معنی خیز محسوس ہوئی اچانک ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ یہ سارا چکر سام کا چلا یا ہوا تھا۔ دراصل اس سے میری اداسی دیکھی نہیں گئی تھی چنانچہ اس نے جان بوجھ کر ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کرانے کی خاطر ہماری پیالیوں کے ساتھ وہ حرکت کی تھی۔

”دھو کے باز۔“ کافی کی چسکی لیتے ہوئے میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”کون؟“ لڑکی مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں چاہت چھلی ہوئی تھی مجھے یہ سوچ کر اطمینان قلب ہوا کہ کوئی تو ہے جسے میری لمبی زلفوں اور رنگ برنگے لباس پر اعتراض نہیں ہے میں نے اس کی جانب دیکھا۔

”میں اس بڑے میاں سام کی بات کر رہا ہوں یہ سب اس کی شرارت ہے۔ ٹھہر ڈرنا یہ اپنے کام سے فارغ ہو جائے پھر میں اس کی وہ خبر لوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔“

”تمہارا مطلب.....؟“ لڑکی نے آنکھیں پٹ پٹائیں۔

”اس کی شان میں چند بڑے ہی خوب صورت الفاظ استعمال کروں گا۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”نا..... نا.....“ لڑکی جلدی سے بول پڑی۔ ”پلیز ایسا نہ کرنا وہ میرے ڈیڈی ہیں۔“



وہ اپنے تئیں اہل علم تاجر اور کاروبار دان تھا اس کا دعویٰ تھا کہ وہ کھانا کھاتا اور ہر بات کہتے ہی حلاوت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دعویٰ پر عمل بھی کیا۔ مگر وہ یہ دعویٰ کیا تھا کہ قدرت نے ہر دور کے لیے دعا ہو رہی ہے۔

اک چالاک کوئے کا حال وہ اپنے خیالی میں خود بخش گیا تھا

اس نے رولٹ ٹیبل کی دوسری طرف کھڑی ہوئی سرخ زلفوں والی پر شباب حسینہ پر پہلی نگاہ ڈالتے ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے حاصل کر کے رہے گا۔ اس کی انگلیاں پچیس سے اور نگاہیں بدستور اس کے توبہ شکن سراپا سے کھیل رہی تھیں اور ان نگاہوں میں ہوس رقصاں تھی اس کی عمر تقریباً بیالیس سال تھی اور وہ اب تک تین مشہور معروف فلم ایکٹرسوں کو طلاق دے چکا تھا۔ اس کی لغت میں محبت نام کو کوئی لفظ سرے سے موجود نہیں تھا۔ وہ اس آفاقی جذبے سے قطعی نا آشنا تھا۔ وہ ایک بھونرا تھا کئی کلی منڈلا تا اور گنگنا تا اس کی فطرت تھی اور اب اس کا دل سرخ زلفوں اور جھیل جیسی گہری سبز آنکھوں والی اس حسینہ کے لیے چل اٹھا تھا۔ ہر بولابوس کی طرح اس کی یہ چاہت تھی چند روزہ تھی اس کے بعد وہ یقیناً اس سے بے زار ہو جاتا اور پھر کسی نئی کلی کے گرد منڈلانے لگتا لیکن اس وقت وہ صرف اور صرف اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے پیسے بے پروائی سے میز پر رکھ دیے۔ حسینہ اس کی جانب دیکھ کر مسکرائی جواباً اس نے بھی مسکراہٹ کی کند چٹنگی۔ اس نے اس حربے کو ہمیشہ کامیاب پایا تھا۔ وہ مسکرا کر حسینہ کو کا دل اچک لیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا۔ ”اگر وہ میری وجاہت سے متاثر نہیں ہوتی تو دولت سے مرعوب ہو جاتی ہیں۔“

محبت اور کاروبار میں اس کا مخصوص طریقہ کار تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس حسینہ کے حصول میں وقت ایک اہم عنصر ہے۔ کوئی بھی شکاری اچانک ہی اپنے شکار پر دھاوا نہیں بولتا بلکہ سب سے پہلے گھات لگا کر بیٹھ جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھتا ہے اور موج پا کر اچانک اسے دبوچ لیتا ہے۔

رولٹ ٹیبل کے پیسوں کی گردش ختم تھی۔ ”معاف کیجیے گا مودیو۔“ جو اٹھلانے والے نے اسے مخاطب کیا۔ ”آپ جیت گئے۔“

کارٹرنے اسے قطعی نظر انداز کر دیا۔ اس کی نگاہیں اس حسینہ پر جمی ہوئی تھیں جو بارہائی تھی۔ لڑکی نے اس پر ایک اچھتی ہوئی نگاہ ڈالی اور مڑ کر ایک جانب چل پڑی۔ کارٹرنے اپنی جیتی ہوئی رقم میز پر ہی چھوڑ کر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ دہری خواروں کا قائل نہیں تھا اس نے لڑکی کا بازو دھری سے تھام لیا۔

”آؤ بار میں چلتے ہیں تمہاری خدمت میں مشروب پیش کرنا چاہتا ہوں۔“ لڑکی ایک لمحے کے لیے ہچکچائی۔

”آؤ ابھی۔۔۔“ اس نے پیار بھرے انداز میں اصرار کیا۔ ”ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں ایک ہفتے تک باریئڈر ٹائی کو اپنے لیے مخصوص کاک ٹیل بنانا سکھاتا رہا ہوں۔“ اس نے باریئڈر ٹائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا اور چند ہی لمحے بعد دونوں بار

میں بیٹھے تھے۔

”مجھے کارٹر کہتے ہیں۔“ اس نے اپنی پشت کرسی سے نیٹکے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔

”کارٹر؟“ لڑکی نے آپ کی مراد لاگ میں کارٹر سے تو نہیں؟“ لڑکی نے حیرت سے اپنی گہری سبز آنکھیں پھیل کر کہا۔

”ہاں! لوگ مجھے ایک زندہ دل کروڑ پتی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔“ اس نے مسکرا کر تصدیق کی۔

”اوہ۔۔۔۔۔۔!“ لڑکی ہٹا ہٹا رہ گئی۔ وہ اس کا قصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

”بریتان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے ملائم اور شیریں لہجے میں کہا۔ اس کی نگاہیں بدستور حسینہ کے چہرے سے کھیل رہی تھیں پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ اس کے نرم دنازک ہاتھ پر رکھ دیا۔ ”گھبراؤ نہیں میں تمہیں کانوں گا نہیں تمہارا کیا نام ہے؟“

لڑکی نے اس کے ہاتھ پر ایک اچھتی ہوئی نگاہ ڈالی جو اس کے ملائم ہاتھ پر دھرا تھا۔

”میرا نام لیزا ہے اور میں کانٹے جانے سے خوف زدہ نہیں ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

اگلے نصف گھنٹے کے دوران زیادہ تر کارٹر گفتگو کرتا رہا اور وہ ایک اچھے سامع کی طرح اس کی گفتگو سنتی رہی۔ کارٹر کو یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ اس سے متاثر ہو چکی ہے۔

”تم نے بڑے کاروباری ہونے کے ناتے یقیناً آپ کو بعض افراد کی زندگی اور موت پر اختیار ہوگا؟“ لیزا نے پوچھا۔

”زندگی اور موت؟“ کارٹر نے جملہ ہرایا۔ ”ہاں میرے خیال میں مجھے یہ اختیار حاصل ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ہیرولڈ کرس کا نام ابھر

آیا۔ ہیرولڈ وہ مقامی تاجر تھا جسے اس نے مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا اور اس تاجر نے اس کی کار کے نیچے آ کر خود کشی کر لی تھی۔ اچانک وہ کاؤنٹر پر ہاتھ مار کر چیخا۔ ”لولی! سیمپن پش کرو آج میں جشن منانے کے موڈ میں ہوں۔“

اس کے ایک گھنٹے بعد وہ لیزا کو اس کے ہوٹل میں چھوڑ کر واپس اپنے ہوٹل کی جانب ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر اس نے نیجر کو طلب کیا۔ نیجر فوراً اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے تمام آمیز لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

”یہ میری خواہش ہے کہ تین درجن سرخ گلاب ہوٹل کنکارڈ میں میں مقیم مس لیزا ایمراؤن کو فوراً ارسال کیے جائیں۔“

”لیکن جناب! رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔“ نیجر نے کمزور احتجاج کیا۔ ”اس وقت کسی گلفروش کی دکان کھلی نہیں ہوگی پھولوں کا انتظام قطعی ناممکن ہے۔“

”ناممکن ہے؟“ اس نے غصے سے میز پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے میرے دوست! اگر تمہیں اپنی نوکری عزیز ہے تو جیسا میں کہتا ہوں ویسا ہی کرو۔“ اس کا لہجہ مکمل آ میز تھا۔

”جناب! میں آپ کا حکم بجالانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔“ نیجر نے خم کھا کر کہا اور اٹنے قدموں چلا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد کارٹر نے خود کو وسیع و عریض اور انتہائی آرام دہ بستر پر گرا دیا اور سکریٹ ساگا کر لیزا کی یاد میں گم ہو گیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لندن لے جانا چاہتا تھا۔

اس لڑکی نے اسے زندگی کے ایک نئے رخ سے روشناس کرایا تھا۔

”ٹوٹی اس لڑکی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“ دروازے پر اس نے لیزا کا انتظار کرنے کے دوران بارشیدہ ٹوٹی سے اس کی رائے معلوم کرنی چاہی۔ اسی لمحے لیزا سیاہ لہاؤں کے ہونٹوں کے دروازے سے داخل ہوئی نظر آئی۔ سیاہ لباس نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ وہی جیسی کمرنگھارنے پوری کر دی تھی۔ کارٹر اور ٹوٹی کی نگاہیں اس سراپا رنگ و نور اور پیکر حسن و لطافت پر جم کر رہ گئیں۔

”جناب! ایک بے حد پُرکشش اور خوش جمال و شیرازہ ہے۔“ ٹوٹی نے پُرستائش لہجے میں کہا۔

کارٹر نے اس کے خیال سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے اثبات میں گردن ہلاتی اور لہروں پر مسکراہٹ بکھیر کر لیزا کے استقبال کے لیے خود کو تیار کر لیا۔

آدھی رات کا وقت تھا دونوں اب ساحل کھلی کار میں بیٹھے سمندر کو دیکھ رہے تھے۔ آسمان پر چاند مسکرا رہا تھا اور سمندر کی لہریں جاندنی میں چل رہی تھیں۔ خوش گوار ہواؤں کے جھونکے مست خرام تھے اور فضا میں پھولوں کی بھنی بھنی مہک رہی ہوئی تھی۔ کارٹر نے چمکتی لہروں کی جانب دیکھتے ہوئے ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ کاروباری دورے پر دو روز کے بعد لندن پرواز کرنے والا تھا اور لیزا کو اپنے ہمراہ لے جانے کا آرزو مند تھا۔ اس کے لیے لیزا کو آمادہ کرنے کی ضرورت تھی اور وہ اسے آمادہ کرنے کے گھر سے واقف تھا۔

اگلی رات اس نے دوبارہ ٹوٹی سے رجوع کیا۔

”میں نے یہ بارشیدہ ہزارا سٹرلنگ پونڈ میں خریدا ہے۔“ اس نے جب سے ایک بے حد خوب صورت جڑاؤ ہار برآمد کر کے ٹوٹی کی نگاہوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہارے خیال میں یہ ہار

لیزا کو پسند آئے گا؟“

”جی ہاں جناب! کیوں نہیں۔ یہ کافی قیمتی ہار ہے۔“ ٹوٹی نے جواب دیا۔

اس کے دس منٹ بعد لیزا کے ہونٹ روانہ ہو رہا تھا کہ کسی نے زری سے اس کا بازو تھام لیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہ ٹوٹی تھا۔

”جناب! ایک منٹ کے لیے رک جائیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں آپ کو کچھ بتائے بغیر جانے نہیں دوں گا۔“

”تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ کارٹر نے پوچھا۔ ٹوٹی کے چہرے پر ناخوش گوار تاثرات بکھر گئے۔

”جناب! کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ وہ آپ کو لوٹنے کے درپے ہے۔ میں اس قماش کی لڑکیوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ صرف امیر و کبیر مردوں کو اپنے حسن کے جال میں پھنساتی ہیں اور جب ان کا کام بن جاتا ہے تو پھر سے اڑ جاتی ہیں۔ آپ لیزا کو یہ بار پیش کریں گے تو وہ آپ کو دوبارہ بھی نظر نہیں آئے گی۔ خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔“

”تم لیزا کے بارے میں ایسے خیالات کا اظہار کر رہے ہو؟“ کارٹر کی توری پر تل پڑ گئے۔ ”یہ کیسے ممکن ہے وہ ایسی لڑکی نظر نہیں آتی۔“

اس کی نگاہ میں کسی کو بے وقوف بنانے سے زیادہ نفرت انگیز کوئی دوسری شے نہیں تھی۔

”ٹوٹی! تم اس کے بارے میں جو کچھ بھی جانتے ہو مجھے آگاہ کرو۔“ دوسرے ہی لمحے اس نے کسی خیال کے تحت ٹوٹی سے فرمائش کی۔

ٹوٹی نے لیزا کے کردار پر بھرپور روشنی ڈالی اور اسے بے شمار واقعات سے آگاہ کیا اور جب خاموش ہوا تو کارٹر کے چہرے پر گہری سوچ کی مہر ثبت ہو گئی تھی۔ اس نے جیب سے وہ جڑاؤ ہار نکالا اور ٹوٹی کی

جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”تم اسے ہونٹ کے سیف میں احتیاط سے رکھ دو۔ اس اثناء میں میں لیزا سے کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

☆ ☆ ☆

لیزا کے حسین اور پُرکشش چہرے پر نگاہ پڑتے ہی اسے احساس ہوا کہ ٹوٹی کا خیال غلط ہے۔ وہ کسی پہلو سے دھوکے باز معلوم نہیں ہوتی تھی۔

”ڈارلنگ! لیزا نے سرگوشی کی۔“ میں سمجھ رہی تھی کہ اب تم کبھی نہیں آؤ گے۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھر انگلیں کیا تم نے وہ تحفہ خرید لیا ہے؟“

”مجھے افسوس ہے میں وہ تحفہ ٹوٹی کے حوالے کر آیا ہوں۔“ میں نے گہری متانت سے کہا اور وہ ساری باتیں شروع سے آ کر تنگ دہراویں جو ٹوٹی نے اسے بتائی تھیں۔

”لیکن ڈارلنگ! یہ جھوٹ ہے بہتان ہے۔“ لیزا چیخی۔ ”میں نے نہیں بلکہ اس نے تمہارے ساتھ چال چلی ہے۔ اس نے تمہیں لوٹ لیا ہے میں نہیں جانتی تھی کہ وہ تمہیں اتنی آسانی سے بے وقوف بنا کر وہاں لے آئے گا۔“

لیزا کے لہجے میں سچائی تھی۔ کارٹر کو یہ سچائی محسوس کرنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے جلدی سے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور ہونٹ کا نمبر ڈائل کرتے کرتے اپنا کمرہ دیکھ گیا۔ اب اس کا کوئی قاعدہ نہیں تھا۔ ٹوٹی یقیناً فرار ہو چکا ہوگا۔ اس نے مایوسی سے ریسیور دوبارہ کریڈل پر رکھا ہی تھا کہ لیزا کی شیریں آواز اس کے سامنے آئی۔

”ڈارلنگ! کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں اس خوب صورت ہار سے ہاتھ دھو لوں؟“

”نہیں! تمہیں تمہارا ہار ضرور ملے گا۔“ اس نے

اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا۔ اس کے چند ہی گھنٹے بعد وہ لیزا کے گلے میں دوسرا جڑاؤ ہار پہنا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

”یہ بہت طفاخیز دو جڑاؤ ہار کے عوض بھی مستی ہے۔“

دوسرے دن لیزا کو اس کے ہمراہ لندن پرواز کرنا تھا لیکن اس کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ کارٹر بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا اور پھر مضطرب ہو کر اس کے ہونٹ پہنچ گیا۔ لیزا کا کمرہ خالی تھا اور اس کے دروازے پر اس کا منہ پڑا ہے تھے معاً اس کی نگاہ سنگھار میز پر رکھے ہوئے ایک پرانے اخبار پر پڑی جو واضح طور پر اس انداز میں رکھا گیا تھا کہ داخل ہونے والے کو پہلی نگاہ میں اپنی جانب متوجہ کر لے۔ کارٹر نے بڑھ کر اخبار اٹھا لیا اور اس کی نگاہیں ایک سرفی پر پھسلنے لگیں، لکھا تھا۔

”مقامی تاجر ہیرولڈ کرس نے کاروبار میں بیس ہزار پونڈ کے زبردست خسارے کے بعد عالم مایوسی میں خودکشی کر لی۔“ اس خبر کے ساتھ ہی ہیرولڈ کی بیوہ اور اس کے دو یتیم بچوں کی تصویر تھی۔ جنہیں کارٹر نے ٹوٹی اور لیزا کی حیثیت سے فوراً پہچان لیا۔ یہ دونوں بچے چند سال میں جوان ہو گئے تھے اور انہوں نے اسے اپنے باپ کا انتقام لینے کے ساتھ ساتھ اپنا خسارہ بھی پورا کر لیا تھا۔

دنیا میں نفاق کا پھیلنا نہایت گہرا زمین رسی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ دنیا سلعہء وارتوں کے لئے موجودہ دور کا ہے، کہانی ہے۔ اس کے پہلے نہ کریم خان ابھی ہی بنا تھا نہ عید۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ابھی کر چکے ہیں۔ جب کہ ہفتے کے حامد میں صرف پچاس ہفتے باقی ہیں اور وہ پچاس گناہوں کا کفارہ ابھی کر چکے ہیں۔ قاتل ہیں۔ وقت کی گرنے لے ان کی حفاظت کو کم کر دی ہے۔

اس حادثہ میں مجاہد اور نثار کے تمام رشتہ داروں پر رحم فرمائیے۔ ان کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں
موجود ہے۔ بعض اور ممالک کی حکومتیں ملوث ہیں تو کہیں چاہیں اور ممالک
مسلمتوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ کہیں قانون اپنے رویوں اور انہماک میں مظلوموں کی عزت و جان
کو بے وقار بناتا ہے تو کہیں چاہیں کہ دیکھ کر ہر مظلوم کیلئے دیکھائی دیتا ہے۔

انی اور ابامیرے بارے میں یہ سوچ رہے تھے کہ میں آنسو آگئے اور میری آواز بھرا گئی۔

”کہاں سے لائی ہے تو یہ چمپے؟“ امی نے
 شیطے برساتی آنکھوں سے میری جانب دیکھا اور تیز
 آواز اور کرحشت لہجے میں بولیں۔

”اُمی یہ نرم مسز ہمدانی نے بطور ایڈوائس دی ہے۔“ میں نے اُمی کو اتنا چراغ چاد کھینچے ہوئے نرم لکھے اور وہ بھی اُفانز میں کہا۔

’تو مجھے یہ بات آج بتائی دے کہ یہ سزا ہمدانی
آ خر ہے کون اور یہ تجھ پر اتنی مہربانیاں کس لیے کرتی
ہے آ خر تو ان کی نفی ہی کیا ہے ان کے بچوں کو
پڑھانے والی ایک معمولی سی ٹیوٹر ہے..... یا پھر وہ تجھ
سے کوئی اور کام بھی لیتی ہیں۔‘ امی نے پہلے سے بھی

زیادہ غصے سے پوچھا۔
چھوٹی بہنوں اور بھائی نے امی کے اشارے

”یہ آپ کی باتیں کر رہی ہیں امی۔ آپ اپنی بیٹی کے بارے میں ایسی گندی بات سوچ بھی کیسے سکتی ہیں۔ میں آپ کی بیٹی ہوں اور میری پرورش آپ نے کی ہے۔“ ای کی بات سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

2013 64

میں سارا وقت روتی رہی اور سوچتی رہی کہ یا اللہ

انے ہو رہے ہیں تو ان سب کی بھلائی کی خاطر

جنگ کا کایف برداشت کر رہی ہوں۔ اب آج کا یہ نکتان کرمان
 سہارا بننے کی کوشش کر رہی ہوں۔ بھریہ لوگ کیوں
 برے بارے میں غلط سوچ رہے ہیں۔ اکی اب آج کو تو
 رش ہوتا ہے پیسے میری حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ الٹا
 لوگوں نے میری کی جھوٹی سبوتوں اور بھائی کو میرے

لاف کر دیا ہے۔ اظہر کا کالج میں ایڈمیشن ہو گیا تھا،
 ہے این ای ڈی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کے لیے

تھے اور اس کے دوسرے - ان سب کا کیا ہوگا۔ یہ

کیسے پڑھیں گے؟ میں نے تو اپنے مستقبل کی اپنے
توابع کی جو ایک ڈاکٹر بننے کی صورت میں میری
آنکھوں میں سجاتا قربانی دی تھی؟ میں نے تو یہ
سوچا تھا کہ اپنی بہنوں کو ڈاکٹر بناؤں گی، بھائی کو انجینئر
بناؤں گی۔ میں نے بھی اگر کام چھوڑ دیا تو سب کچھ
ختم ہو جائے گا۔ اسی کی سلائی کے کام سے اتنی آمدنی
نہوڑ رہی ہے۔

دوسرے دن مجھے خیال آیا کہ مسز ہمدانی نے مجھے کسی پیر صاحب کا ذکر کیا تھا، مجھے ان کے پاس جانا چاہیے اور ان کی کرامات سے فائدہ اٹھانا چاہیے یہ سوچ کر میں نے ہاتھ منہ دھویا اور کپڑے تبدیل کیے اور جب مسز ہمدانی کے گھر جانے لگی تو امی نے آواز دی اور کہا۔

”کہاں جا رہی ہے؟“

”مسز ہمدانی کے ہاں۔“ میں نے رخ پھیرے
بتازک کر جواب دیا۔

”کیوں آج تیری گھاڑی نہیں چلتی ہے گی اور یہ تو

ایم ای نے تکتھے۔ لہجے میں کہا۔

”امی میں پڑھانے نہیں جا رہی میرا ایک کام ہے اس کے لیے جا رہی ہوں۔ ایک دو گھنٹے میں واپس آ جاؤں گی۔“ میں نے کہا اور امی کی حریف کوئی اور بات سے تیزی سے گھر سے نکل آئی اور بس اسٹاپ کی جانب چل دی۔ میں نے فونٹس جانے والی بس کا انتظار کیا پھر اس میں بیٹھ کر ان کے گھر پہنچ گئی۔

مسز ہدائی خلاف توقع مجھے دیکھ کر حیران رہ گئیں اور بولیں۔ ”خیریت تو ہے دو ماہ... تم اس وقت...“

ذکر کیا تھا؟ کیا آپ مجھے وہاں لے جاسکتی ہیں؟
میں نے کہا۔

”اس وقت.....“ انہوں نے حیرت سے کہا پھر کچھ سوچے لگیں اور بولیں۔ ”اچھا ٹھہرو میں ہمارے صاحب سے پوچھتی ہوں کہ پیر صاحب سے محفل کے علاوہ بھی ملاقات ہو سکتی ہے یا نہیں۔“ اور وہ ڈرانگ روم سے چلی گئیں۔

مسٹر ہدائی کے بارے میں مجھے تا معلوم تھا کہ وہ بہت بڑے سرکاری افسر ہیں اور پیر صاحب نے ان

کے بہت سے مشکل اور اٹکے ہوئے کام نکلوائے ہیں۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ کبھی مسز ہمدانی کا اچھا موڈ دیکھ کر ان سے درخواست کروں گی کہ وہ ہمدانی صاحب سے کہہ کر مجھے کہیں نوکری دلاویں کیونکہ میں یہ بات اچھی طرح سے جانتی تھی کہ ایک انٹریس کو کہاں مازمت ملے گی جبکہ کوئی سفارش نہ ہو۔

تھوڑی دیر بعد مسز ہمدانی آئیں اور پولیس۔

”میں نے ہمدانی صاحب کو تمہارے مسئلے کے بارے میں بتایا ہے اور وہ کہہ رہے ہیں کہ میں سرکار حضور سے بات کر لی ہے تم روانہ ہو سرکار حضور کے ڈپٹی سے“

فیرفا پیو والے بنگلے پر لے جاؤ۔ تم تو بہت لکی ہو دعا کرو کہ تمہیں سرکار حضور ملنے کا نام دے رہے ہیں۔ بس ہمیں پانچ منٹ اور انتظار کرنا ہوگا ہمدانی صاحب مجھے دوبارہ لون کر س گئے تپ ہم چلیں گے۔“ میں مطمئن ہو کر بیٹھ گئی اتنی دیر مسز ہمدانی غائب رہیں واپس آئیں تو انہوں نے سازشی تبدیلی کی ہوئی تھی۔ ہلا ہلا میک اپ اور جیوری بھی پہنی ہوئی تھی میں انہیں اتنی تیاری کے ساتھ دیکھ کر حیران رہ گئی اور کہا۔

”آپ پیر صاحب کے پاس اتنی تیار ہو کر جاتی ہیں۔“

”کیا کریں بھی اپنے اسٹیلز کا بھی تو خیال رکھنا پڑتا ہے آخر ہمدانی صاحب کی لوگوں میں ایک عزت ہے اور میں یوں ہی چلی جاؤں۔“ انہوں نے تقاضا بھرے لہجے میں کہا تو میں خاموش ہو گئی۔ میں اور کبہ بھی کیا سکتی تھی۔

اس وقت دن کا ایک بجنا تھا جب میں مسز ہمدانی کے ساتھ ان کی کلاں میں بیٹھ کر پیر صاحب سے ملاقات کے لیے چلی گئی۔ سفر مختصر تھا کیونکہ مسز ہمدانی کی رہائش بھی ڈینٹس ہی میں تھی راستہ میں مسز ہمدانی نے مجھ سے صرف ایک سوال کیا۔

”رومانہ تم اپنے گھر میں بتا کر آئی ہو کم میرے ساتھ پیر صاحب کے پاس جا رہی ہو۔۔۔۔۔؟“

”نہیں!“ میں نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔

”کیوں؟“ انہوں نے پوچھا۔

پھر میں نے انہیں ساری باتیں بتادیں امی ابو اور بہنوں اور بھائی کے رویے کے بارے میں۔

”میں نے تمہارے حالات کے بارے میں ہمدانی کو بتایا تھا تو انہوں نے مجھ سے بہت پہلے ہی کہا تھا کہ تمہیں سرکار صاحب سے ضرور ملنا چاہیے۔“

خصور غیر ملکی دورے پر چلے گئے لیکن اب وہ واپس آ گئے ہیں۔ میں تم سے یہ کہنے ہی والی تھی کہ اتفاق سے خود تم ہی آ گئیں۔“

انہوں نے مسکراتے ہوئے نرم سے لہجے میں کہا۔

میں مسز ہمدانی پر بہت اعتماد کرتی تھی کیونکہ ان کے گھر آتے ہوئے مجھے دو سال ہو گئے تھے اور ان دو سالوں میں میرے ساتھ ان کا رویہ بہت مخلصانہ اور مشفقانہ رہا تھا۔ گا ہے بگا ہے جب بھی ضرورت پڑتی وہ مجھے ایڈوائس کے طور پر رقم بھی دیتی رہی تھیں اس لیے ان کے مشورے پر کسی بھی اجنبی جگہ جاتے ہوئے مجھے ذرا بھی تر دو نہ ہوا۔

مسز ہمدانی کے سل فون پر کسی کا فون آیا تو انہوں نے صرف اتنا کہا ”مجھے پتا ہے کیا کرتا ہے آپ فکر نہ کریں۔ سب ٹھیک ہے۔۔۔۔۔!“

میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا تو وہ بولیں۔ ”ہمدانی کا فون تھا تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“

یہ بات آج سے تقریباً دس سال پرانی ہے اس زمانے میں عام لوگوں کے پاس موبائل فون نہیں ہوتا تھا صرف میسج والے لوگ ہی اسے افورڈ کر سکتے تھے میں بڑی حیرت سے موبائل فون کو دیکھا کرتی تھی لیکن میرے گھر تو بی بی سی ایل فون بھی نہیں تھا۔

ہماری کار جس بنگلے کے سامنے جا کر کئی وہ زیادہ آباد علاقے میں نہیں تھا۔ بنگلے دور دور بنے ہوئے تھے کچھ پر تیسرانی کام جاری تھا میں بوقت ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی پھر پوچھا۔

”پیر صاحب یہاں ہوتے ہیں اتنے ویران علاقے میں۔ یہاں لوگ کیسے آتے ہوں گے یہاں عام لوگ تو آ سکتے ہیں تو کوئی بس بھی

نہیں آتی۔“

”ارے بھئی یہ پیر صاحب کا آستانہ تھوڑی ہے ان کی رہائش گاہ ہے پیر صاحب نے ہمدانی کو تمہارے لیے خصوصی اجازت دی ہے کیونکہ ہمدانی ان کے خاص مرید ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا تو میں تھوڑی سی مطمئن ہو گئی۔

مجھے اس بات کا قطعی احساس نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کتنے اور بے پناہ حسن سے نوازا ہوا ہے اور جن مخالف کے لیے میرے امیر بے پناہ کشش بھری ہوئی ہے میری عمر بھی کم تھی اور عقل بھی۔

میں مسز ہمدانی کے ہمراہ کار سے اتر آئی جبکہ ذرا نیور کا رسمیت باہر ہی موجود رہا انہوں نے تیل بجائی تو ایک پھانچا چوکیدار نے گیٹ کھولا تو مسز ہمدانی نے اس سے کہا۔

”نواب صاحب نے بلایا ہے گیٹ کھولو۔“

”نواب صاحب کون۔۔۔۔۔؟“ میں نے حیرت سے سوال کیا۔

”پیر صاحب کا تعلق نواب خاندان سے ہے اس لیے بعض لوگ انہیں نواب صاحب کہتے ہیں لیکن ہمارے تو وہ پیر ہیں اس لیے ہم انہیں سرکار کہتے ہیں۔“

استنے میں چوکیدار نے بغلی جھونکا گیٹ کھول دیا اور ہم اندر چلے گئے۔ اندر بھی سناتا سا پھیلا ہوا تھا۔ اس لمحے نہ جانے کیوں میرا دل ایک دم سے پریشان ہو گیا اور میرا دل چاہا کہ یہاں سے نکل کر بھاگ جاؤں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی تھی اس لیے نہ کر سکی کاش میں اس روز اپنے دل کا کہا مان لیتی اور آگے نہ بڑھتی بلکہ اپنے قدموں بھاگ جاتی۔

میں مسز ہمدانی کے ہمراہ اندر داخل ہو گئی۔ اندر ملازم نے دروازہ کھولا اور ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا وہ ملازم مجھے بہت غور سے دیکھ رہا تھا لیکن

جب اس کی نگاہیں مسز ہمدانی سے ملیں تو وہ انہیں دیکھ کر مسکرا دیا مسز ہمدانی بھی مسکرائیں اور بولیں۔

”سرکار حضور فارغ تو ہیں کہیں یہ ان کی عبادت کا وقت تو نہیں ہے۔۔۔۔۔!“

”اس وقت تو فارغ ہی ہیں البتہ تھوڑی دیر بعد ان کی عبادت کا وقت شروع ہو جائے گا۔“ ملازم نے مسی خیز لہجے میں کہا پھر اندر چلا گیا۔

بنگلے میں پھیلے ہوئے سناٹے کو دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا کہ پیر صاحب کی فیملی نہیں ہے تو انہوں نے بتایا کہ سب لوگ گاؤں میں رہتے ہیں۔

استنے میں وہی ملازم دو گلاسوں میں شربت لے آیا ایک اس نے اٹھا کر میری جانب بڑھا دیا اور دوسرا مسز ہمدانی کی جانب اور بولا۔ ”آپ لوگ فریش ہو جائیں سرکار ابھی آتے ہیں۔“

”ارے اس کی کیا ضرورت تھی۔۔۔۔۔“ مسز ہمدانی نے تکلف سے کہا۔

”آپ تو جانتی ہیں کہ سرکار کتنے مہمان نواز ہیں۔ دور سے آنے والوں کے لیے تو وہ کھانے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔“ ملازم نے کہا اور چلا گیا۔

میں ہاتھ میں گلاس لیے بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی وہ پیر صاحب کتنے اچھے اور اللہ والے ہیں۔ ورنہ آج کل کون کسی کا خیال رکھتا ہے۔

”کن سوچوں میں کم ہو جلدی سے گلاس خالی کرو۔ اگر پیر صاحب آ گئے اور انہوں نے تمہیں ہاتھ میں گلاس لیے ہوئے دیکھا تو سمجھیں گے کہ تمہیں ان کی میزبانی پسند نہیں آئی اور ایسا کرنا ان کی شان میں گستاخی ہے۔“ مسز ہمدانی نے اپنے گلاس سے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا اور تھوڑی سی لپٹا خالی کرنے لگیں ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی بٹھا دیا وہ گلاس خالی کر لیا اور جلدی جلدی پیئے میں

اس کے ذہن کے پھر بھی غور نہیں کیا۔

میں نے گلاس خالی کر کے رکھا میں کیفور ہو رہی تھی اچانک مجھے چکر آئے گئے پہلے تو ایک کی جگہ دو مسز ہمدانی دکھائی دیں پھر دو ہلنے لگیں اور پھر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا..... اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔

ہوش آنے پر میں نے اپنی آنکھیں کھولیں ذہن بالکل خالی تھا البتہ سر بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ صبح ہو گئی ہے اور میں اپنے گھر میں انہی ہوں۔ سر بھاری ہو رہا تھا اس لیے میرا ہاتھ فوراً سر پر چلا گیا۔ امی کی سچ و ترش باتیں یاد آئے لگیں میں نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں دوبارہ بند کر لیں اور ہاتھ اپنے جسم پر پھیرا۔ تب مجھے ایک بہت ہی خوفناک احساس ہوا..... میں نے گھبرا کر جھٹ آنکھیں کھول دیں۔

لباس کے نام پر میرے جسم پر دھجی بھی موجود نہیں تھی میں نے ہلکا کر اپنے چاروں جانب دیکھا اور اپنے جسم کو سکین کر اپنے بازوؤں ٹخنوں کے گرد لپیٹ لیے۔ یہ جگہ یہ کمرہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا میری آنکھوں سے آنسو سیلاب کی مانند بہہ رہے تھے اور دماغ بالکل باؤف ہو رہا تھا۔ میں نے چاروں سمت نگاہیں دوڑائیں کہ میں اپنے جسم کو کس چیز سے چھپاؤں لیکن مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی میرا لباس وہاں موجود تھا۔

کمرے میں میرے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا لیکن یہ خیال ہی کتنا جان لیوا تھا کہ میں کسی اجنبی جگہ پر بے لباس موجود ہوں..... کیوں ہوں.....؟ یہ سب کرنے والا کون ہے.....؟ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں تو مسز ہمدانی کے ساتھ ان کے پیر صاحب سے دعا کروانے کے لیے آئی تھی پھر میرے ساتھ

کیا ہوا مسز ہمدانی نے میرے ساتھ کتاب بازو دھوکہ کیا وہ خود کہاں ہیں اور میری یہ حالت..... میرا سر بری طرح چکرار ہاتھ اچانک میری نگاہ بیڈ شیٹ پر پڑی میں تیزی سے بیڈ سے اترتی اور بیڈ شیٹ اتار کر اپنے گرد لپیٹ لی صرف میرا چہرہ اس چادر سے باہر تھا۔

اس سے پہلے کہ کوئی اس کمرے میں آئے مجھے دروازہ اندر سے بند کر لینا چاہیے یہ سوچ کر میں چادر سنبھالتی ہوئی بیڈ سے اترتی اور دروازے تک آئی لیکن دروازے میں کوئی کنڈی نہیں تھی۔ لاک بھی چابی والا تھا میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے کھولا چاہا تو ہینڈل گھوم کر رہ گیا۔ دروازہ باہر سے لاک تھا۔

میں پھر بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی اب میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا یہ سب مسز ہمدانی کا کیا دھرا ہے انہوں نے میری کم عقلی سے فائدہ اٹھا اور کسی دھوکے دھوکے میں مجھے کسی غلط جگہ لے آئی ہیں کیا انہوں نے کسی کے ہاتھ مجھے بچ دیا ہے بہت سی سناٹی باتیں میرے ذہن میں گونجنے لگیں۔ میں نے سنا تھا کہ بہت سے لوگ لڑکیوں کو اغوا کر لیتے ہیں پھر انہیں برے لوگوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔

ہاں۔ میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا ہے لیکن مسز ہمدانی نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا ان کے پاس خود اتنا پیسہ ہے پھر انہیں پیسے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ انہوں نے اتنا دھیر سا راہ پیہہ اسی طرح لکھا کیا ہوگا.....

میرے ذہن میں ساری باتیں اُردی تھیں انہوں نے راستے میں مجھ سے بچا ہوا تھا کہ میں اپنے گھر والوں کو بتا کر آئی ہوں باتیں تو میں نے انہیں بتایا تھا کہ میں نے کسی کو ان کے گھر آئے گا نہیں بتایا۔

گھر والوں کا خیال آیا تو میں پوری جان سے لرز گئی۔ میں گھر نہیں پہنچوں گی تو سب کیا سوچیں گے امی اب تو ویسے ہی میری جانب سے بدگمان ہیں اب تو رات ہو گئی ہے۔

ہالڈ میری مدد فرما۔ مجھ سے ایسا کون سا گناہ ہو گیا جس کی اتنی بھیا تک مرنا تو نے مجھے دی ہے کاش میں نے امی اب کی بات مان لی ہوتی۔ گھر سے باہر قدم نہ نکالنا ہوتا۔ مسز ہمدانی کو اپنا خیر خواہ سمجھ کر ان پر اتنا بھروسہ نہ کیا ہوتا تو آج میں اس حال میں نہ ہوتی۔

میں نے بجائے اپنے ماں باپ کے ایک غیر کو اپنا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھا اور مجھے اسی کی سزا ملی ہے اپنے والدین کی نافرمانی کی سزا۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ سوائے روتے اور آنسو بہانے کے۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ میں رو رہی تھی اور ذہن میں مختلف بھیا تک سوچوں نے اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھے اب ہر بھی بالکل سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میرے علاوہ یہاں دور دور تک کسی انسان کا وجود ہی نہیں ہے میں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ آیا یہ وہی بیٹھ ہے جس میں میں آئی تھی یا بے ہوشی کی حالت میں مجھے کہیں اور لے جایا گیا ہے۔

تب ہی رات کے ستارے میں میرے کانوں میں گاڑی کے انجن کی گڑ گڑاہٹ آئی پھر وہ آواز بند ہوئی اور گاڑی کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ حالانکہ میرے سامنے ہی بند کھڑکی موجود تھی جس پر وہیز پردے پڑے ہوئے تھے لیکن بنا لباس کے میری ہمت ہی نہ ہوئی کہ میں اٹھ کے دیکھتی کہ کیا آیا ہے اور جو کوئی بھی آیا ہے اب وہ یہاں ضرور آئے گا۔ میں مارے خوف اور شرم کے تھر تھر کانپ رہی تھی بلکہ ایسے جیسے میں برف زار پر کھڑی ہوں۔ پھر کمرے کے باہر مجھے ایک ساٹھو کنی تھوک کی

آواز سنائی دیں اور باتیں کرنے کی بھین بھیناہٹ سنائی دی۔ میں نے چادر کو مزید مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ لیا میرے جسم کی لرزش میں مزید اضافہ ہو گیا۔ تب دروازے کے لاک میں چابی کی آواز آئی اور لاک کھل گیا۔ میں وحشت زدہ برتی کی مانند دروازے کی جانب دیکھنے لگی جیسے شیر اس دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی مجھے چیر پھاڑ دے گا۔

دروازہ کھلا اور ایک دھیمہ اور ڈھنگ محسوس آیا اس کے چہرے پر ایک نرمی مسکراہٹ تھی اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے دروازہ بند کیا اور مسکراتا ہوا میرے بیڈ کے نزدیک آ گیا۔ شکل سے کسی طور وہ غنڈہ اور بد معاش لگ نہیں رہا تھا بلکہ نہایت معقول صورت اور پرخا لکھا نظر آ رہا تھا وہ بیڈ کے نزدیک آ کر کھڑا ہوا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”ارے کیا ہوا.....؟ تم اسی طرح کانپ رہی ہو جیسے تمہیں بہت سردی لگ رہی ہے اگر زیادہ سردی لگ رہی ہے تو اٹھ کر اے سی آف کرو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

تب میں نے دیوار پر نگاہ ڈالی اے سی آف تھا لیکن مجھے اس کا احساس ہی نہیں تھا میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا بس وحشت زدہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتی رہی۔

”مجھے ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ سنائیں تم نے اے سی آف کرو۔“ اس نے کہا اور میز سے سگار کی ڈبیہ اٹھا کر سگار نکالا اور اسے سلگانے لگا۔ سگار سلگا کر اس نے ایک گہرا کش لیا اور منہ سے اس کا دھواں خارج کرتے ہوئے مجھے دیکھنے لگا۔ میں اب بھی خاموش بیٹھی تھی۔

”اٹھ کے اے سی آف کرو۔“ اس نے بھاری اور حکم نامہ جیسے لہجے میں آنکھیں نکال کر کہا ایک حرکت

اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ تو میں مارے بے بسی کے سرکوفی میں زور زور سے ہلانے لگی۔

”چلو ٹھیک ہے تم آئیے آئیے نہیں کر رہی تو نہ سہی۔ تم کمرے میں تنہا بیدار ہو گئی ہو گی، یہاں لی وی اور وی کی آرموجود ہے اس میں کیسٹ بھی لگی ہے دل بہانے کے لیے تم وہی دیکھ لیتیں تم نے لی وی کھولا تھا.....“ اس نے کہا تو میں نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلادیا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص کون ہے اور مجھ سے اس قسم کی باتیں کیوں کر رہا ہے؟ اپنے بارے میں سوچ سوچ کر مارے شرم کے مری جا رہی تھی۔ ”اچھا چلو میں تمہیں ایک بہت شاندار اور دلچسپ مووی دکھاتا ہوں تمہیں یقیناً پسند آئے گی۔“ اس نے دوستانہ انداز میں کہا اور میرے سرے بیٹھ اٹھا کر لی وی اور لی وی کی آرمیں کیا اور چند لمحوں کے بعد لی وی پر جو کچھ دکھائی دیا اسے دیکھ کر تو مجھے اسی لمحے مر جانا چاہیے تھا لیکن میں اتنی ڈھیٹ اور سخت جان تھی کہ وہ سب کچھ جھیل گئی۔

وہ میری مووی تھی بنا لاس کے۔ میرے ساتھ ایک مرد بھی تھا جس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اس کے ہاتھ میرے جسم کے مختلف حصوں کا جغرافیہ معلوم کر رہے تھے۔

بہن اتنا ہوا کہ میں چکرا کر بندر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ ہوش آنے پر وہ مہربان دکھائی دینے والا شخص بھیڑیا بن گیا۔ جس نے سر سے پاؤں تک مجھے گندگی میں تعمیر دیا۔

موجود ہے۔ اگر میں نے اسے خوش نہیں کیا یا اس کا اور مسز ہمدانی کا نام بھی کسی کے آگے لیا تو میری یہ مووی میرے محلے کے ویڈیو سینٹر میں پہنچادی جائے گی..... آگے کیا ہوگا اس کا انجام مجھے ابھی طرح سے سوچ لینا چاہیے۔

مسلل ایک ہفتہ میں اس شیطان نواب سلطوت کی زندگی کا نشانہ بنتی رہی۔ میں روزانہ اس کے آگے ہاتھ جوڑتی اس کے قدموں میں سر رکھ کر التجا کرتی کہ وہ مجھے چھوڑ دے لیکن وہ یہی کہتا رہا ”چھوڑ دوں گا۔ دل تو بھر جائے دو۔“

اور ایک دن جب میں نے اس کے آگے بہت التجا نہیں کی تو اس نے بڑے مطمئنانہ اور پیار سے کہا۔ ”جاؤ..... لیکن کہاں جاؤ گی اپنے گھر.....؟“ میں مارے خوشی کے ایک دم کھڑی ہو گئی اور مجھے اس کے الفاظ پر یقین نہیں آیا کہ کیا واقعی وہ اتنی آسانی سے مجھے چھوڑ دے گا اس لیے بے یقینی سے کہا۔

”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگا اور نیم وا آنکھوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمہیں تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے تمہیں عزت بخشی ہے کتنے ہی لوگ میری ایک جھٹک دیکھنے کے لیے اور مجھ سے ایک ملاقات کرنے کے لیے مہینوں انتظار کرتے ہیں۔ تم ہمیں پسند آ گئی تھیں تو ہم نے تمہیں عزت بخش دی اور اب تمہاری خواہش پر تمہیں جانے کی اجازت بھی دے رہا ہے ہیں لیکن..... ایک بات تمہارے ذہن سے کبھی نہ نکلے پائے۔“ اتنا کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے رکا اور میری جانب بغور دیکھنے لگا۔ تو میں سمجھ گئی اس نے اپنی ایک انگلی اٹھائی اور میری جانب اس کا رخ کبھوے بولا۔

”تمہاری وہ ناور اور نایاب ویڈیو ہمارے پاس محفوظ ہے اگر تم نے غلطی اور بھولے سے بھی کسی کے آگے میرا ذکر کیا یا مسز ہمدانی کا نام لیا تو پھر تمہاری وہ ویڈیو تمہارے محلے کے اور خاندان کے ہر گھر میں پہنچا دی جائے گی۔ لوگ تمہاری بات کا یقین بھی نہیں کریں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہیں لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اس لیے تمہارے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ تم اپنی زبان بند رکھنا اور ہاں..... اگر پھر بھی تم نے جوش میں کچھ بھی کہنے کی کوشش کی تو تمہاری فرزانہ اور شبانہ۔ یہی نام ہیں ماں تمہاری چھوٹی بہنوں کے۔ وہ ہماری دسترس سے دور نہیں۔ میں جانتا ہوں تمہارے گھر بلیو حالات بہت خراب ہیں والد بیمار ہیں چھوٹا بھائی ابھی فرسٹ ایئر میں پڑھ رہا ہے یہاں سے جاؤ گی تو تمہیں احتیال دے دوں گا کہ تم اپنے گھر بنو حالات سنبھال سکو گی۔ جب کرنا چاہو گی تو جاؤ گی دوادوں گا اور اگر کبھی یاد آئے تو خوش خوش چلی آنا۔ نامراد نہیں رہو گی اور ہاں.....“ اس نے ایک بار پھر تہیہ کالجہ اختیار کیا۔ ”بھولے سے بھی مسز ہمدانی سے رابطہ کرنے کی کوشش مت کرنا۔“

بات ختم کر کے وہ اٹھا اور امارتی سے ایک لفافہ نکال کر میرے آگے پھینکتے ہوئے بولا۔ ”اسے ساتھ لے جانا۔ باہر گاڑی اور ڈرائیور موجود ہے وہ تمہیں تمہارے گھر کے قریب اتار دے گا۔“ یہ کہہ کر وہ سنگ دل شخص تیز قدموں سے کمرے سے نکل گیا۔ نہ جانے کیوں اس کے آگے میری زبان کوتالے آگے جاتے تھے شاید میں اس سے حد درجہ خوف زدہ تھی۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے زمین پر بیٹھ کر پھوٹ کر رونا شروع کر دیا میں دیر تک رونا رہی۔ خوب رو لینے کے بعد میری آنکھوں سے

آنسو نکلتے ہی بند ہو گئے۔ میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ابھی لفافہ دیکھا تو اس میں ڈھیر دن ٹوٹ تھے یہ نہیں کتنے تھے۔ میں نے غصے میں آن کر لفافہ اٹھا کر پھینک دیا۔ اور میرے منہ سے نکلا۔

”کتنے تو مجھے میری عزت کا معاملہ دے کر سمجھ رہا ہے کہ تو مجھ پر بہت بڑا احسان کر رہا ہے اور کیا کہہ رہا تھا تو کہ تو نے مجھے اپنے قدموں تلے روندھ کر مجھے عزت بخشی ہے میں سچ جیج کر دنیا کو تیرے اور اس کمپنی عورت کی حقیقت دکھاؤں گی۔ تمہارے اصل چہرے دنیا کے سامنے لاؤں گی۔ نواب سلطوت دنیا تجھے جبر سائیں مجھ کر اپنے سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے اور تو تو تو نر اشیطان ہے۔ عزتوں سے کھیلنے والا ابن ابلیس.....“

میں غصے اور جنون میں پہنچ کر نہیں کیا کیا بڑبڑائے جا رہی تھی اور تیزی سے اٹھ کھڑی ہو گئی جیسے ابھی جا کر نواب اور مسز ہمدانی کا تپا پانچا کر دوں گی لیکن ایک کرخت آواز آئی۔

”غصہ رو۔“ میں نے ملٹ کر دیکھا یہ کس نے کہا لیکن وہاں میرے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا پھر یہ کس کی آواز تھی۔ میں نے گھبرا کر کمرے میں چاروں جانب اپنی وحشت زدہ نگاہیں دوڑائیں اور پھر مجھے اور اک ہوا کہ یہ تو میرے اندر کی آواز تھی۔ میرے دماغ نے مجھے رکھنے کے لیے کہا۔ عقل جس کا دوسرا نام بریک ہے یعنی جب انسان جوش جذبات میں اندھا ہو کر کوئی غلط قدم اٹھانے لگتا ہے تو عقل بریک کے لیے کہتی ہے یعنی رک جاؤ تم جو کام بھی کرنے جا رہے ہو اس کے بارے میں آگے اور پیچھے کے بارے میں رک کر سوچو اور جو شخص بریک لگا لیتا ہے یعنی عقل کی آواز سن لیتا ہے وہ سچ جاتا ہے ورنہ تیز رفتاری سے زبردست اور خطرناک ایکسیڈنٹ ہو ہی

”باہر گاڑی اور ڈرائیور موجود ہے گاڑی میں جا کر بیٹھ جاؤ جہاں کہیں گی ڈرائیور تمہیں چھوڑ دے گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”یہ بنگلہ کس کا ہے اور یہ کون سی جگہ ہے؟“ میں نے گاڑی سے پوچھا۔

”بل بل تمہیں جانا ہے تو چلی جاؤ۔ نہیں جانا ہے تو واپس اندر چلی جاؤ۔“ بریکار کے سوالات کر کے اپنا اور میرا وقت برباد مت کرو۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا اور اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

”او کا پتھا۔۔۔۔۔ کمینہ۔۔۔۔۔!“ میں نے آنکھیں نکال کر اسے غصے میں کہا، لیکن وہ پتھر بنا کھڑا ہوا۔ جیسے اس نے میرے الفاظ سننے ہی نہیں۔

میں سمجھتی تھی کہ یہ سب نواب کے بندے ہیں اس کی مہارت پر ان کی زبانیں بند ہیں۔ اس نے میرے کنبے بنائی گیٹ کھول دیا اور میں اسے گھورتی ہوئی باہر نکل آئی، باہر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیور باہر کھڑا تھا، میں اس سے کچھ بھی کہہ نہا، گاڑی میں بیٹھ گئی۔ مجھے بیٹھا دیکھ کر وہ بھی ڈرائیورنگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور مڑے بنا ہوا۔

”کہاں جانا ہے؟“

جواب میں میں نے اسے اپنے علاقے کا نام بتا دیا تو اس نے گاڑی اشارت کر دی۔ راستے میں میں بھی خاموش رہی وہ بھی خاموشی سے گاڑی چلا رہا، دل میں خیال بھی آیا کہ اس سے کچھ پوچھوں کہ یہ کون سا علاقہ ہے، کیونکہ میں کراچی کے علاقوں سے واقف بھی نہیں تھی۔ صرف جہاں میں آتی جاتی تھی میں ان ہی علاقوں سے واقف تھی پھر یہ سوچ کر خاموش رہی کہ یہ بھی کچھ نہیں بتائے گا پھر اپنے آپ کو گھر والوں کے ڈھیروں سوالات کے جوابات کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لے گی، میں اندر سے اندر بہت

جاتا ہے پھر کچھ بھی نہیں بچتا سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ اور جب میں نے اپنے دماغ کی سرزنش کو محسوس کیا تو میرے ذہن میں نواب سلطنت عرف پیر سائیں کے خوفناک الفاظ یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ زبان کھولنے کی صورت میں خطرناک نتائج کی دھمکی گونجنے لگی۔

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ میری آواز سنے گا ہی کون۔۔۔۔۔ میری اوقات ہی کیا ہے۔۔۔۔۔؟ ہارے بے بسی کے ایک بار پھر میری آنکھیں اشک بہانے لگیں۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ گھر پہنچ کر اپنے ایک بھتیجے کی غیر حاضری کا میں کیا جواز پیش کروں گی، پھر خیال آیا کہ یہی کہہ دوں گی کہ میں اپنی دوست کے گھر جا رہی تھی کہ میرا ایک سیڈنٹ ہو گیا، میں ہاسپٹل میں بے ہوش پڑی تھی۔

یہ سوچ کر میں مطمئن ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ گھر والے میرے اس جھوٹ پر یقین کر لیں گے۔ چلتے چلتے میری نگاہ نواب سلطنت کے دیئے ہوئے لفافے پر پڑی جو میں نے غصے میں پھینک دیا تھا۔ یہ سوچ کر واپس اٹھایا کہ میں یہ رقم اپنے بہن بھائی اور ابا کے علاج پر خرچ کروں گی کہ میں نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے۔۔۔۔۔ میرے پاس تو ویسے بھی کچھ نہیں باقی بچا، پھر یہ رقم کیوں چھوڑ دوں۔

میرا بیگ، میرے کپڑے اور چادر سب کچھ اسی کمرے میں موجود تھا، میں نے اپنے کپڑے تبدیل کئے اور لفافہ بیگ میں رکھا چادر اور بھی اور باہر نکل آئی۔

باہر آ کر دیکھا یہ وہ بنگلہ نہیں تھا جس میں میں آئی تھی، یہ نہیں کون سی جگہ تھی۔ بلکہ یہ اس سے بھی زیادہ بڑا بنگلہ تھا، باہر گیٹ پر ایک گاڑی موجود تھا، میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ”مجھے اپنے گھر جانا ہے۔“

گھبرا بھی رہی تھی لیکن کیا کرتی اس سچویشن کا تو مجھے سامنا کرنا ہی تھا۔

میرے گھر کے نزدیک اسٹاپ آیا تو میں نے اس سے کہا کہ یہاں گاڑی روک دو تو اس نے بربیک لگا دیا میں اتر کر خاموشی سے اپنے گھر کی جانب چل دی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو گاڑی تیزی سے واپس جا رہی تھی۔ گھر کی جانب جاتے ہوئے میرے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی اس کی وجہ یہی تھی کہ میں اب وہ رومانہ نہیں تھی جو اس گھر سے لگی تھی۔ یہ رومانہ جو جاری تھی وہ تو ایک لٹی پٹی لڑکی تھی۔

گھر کا دروازہ بند تھا میں نے نکل بھاگی تو دروازہ بعد دروازہ کھلا اور ای کی شکل دکھائی دی میرے اوپر نگاہ پڑے ہی وہ سکتے ہی کی کیفیت میں آ گئیں پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری جانب دیکھنے لگیں۔ ان کے لبوں پر لرزش اور آنکھوں میں آنسو تھے ہم دونوں بالکل ساکت حالت میں کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

”ای۔۔۔۔۔“ میں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور لرزتے ہوئے لبوں سے بمشکل کہا تو وہ ایک جھرجھری لے کر جیسے ہوش میں آ گئیں۔

میرا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ امی کے گلے لگ جاؤں اور پھوٹ پھوٹ کر اور چچیں مار مار کر اپنی بربادی اور لٹ جانے کا ماتم کروں۔

”سک۔۔۔۔۔ کون ہوتی۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔؟“ امی نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں رومانہ امی۔۔۔۔۔ آپ کی بیٹی۔۔۔۔۔!“ یہ کہہ کر میں نے امی کے گلے لگنا چاہا تو امی تیزی سے واپس پلٹ گئیں اور اپنا ہاتھ پیچھے کر کے زور زور سے ہلاتے ہوئے بولیں۔

”کون رومانہ۔۔۔۔۔ میں کسی رومانہ کو نہیں

جانتی۔۔۔۔۔ میری کسی بیٹی کا نام رومانہ نہیں ہے۔ جاؤ واپس چلی جاؤ۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں امی۔۔۔۔۔ پہلے میری بات سنیں۔۔۔۔۔ میں کہاں تھی مجھ پہ کیا لڑائی؟“ میرے بھاگ کر امی کے سامنے آ گئی اور بری طرح روتے ہوئے کہا۔

”ہش۔۔۔۔۔!“ امی نے کھوئے کھوئے انداز میں منہ پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کے لیے کہا۔ ”سو رہے ہیں۔۔۔۔۔ انہیں بڑے عرصے کے بعد اتنی اچھی نیند آتی ہے۔۔۔۔۔ تو آگئی انہیں بے چین کرنے کے لیے۔۔۔۔۔!“ امی کا انداز مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہوش و حواس کی کیفیت میں نہیں ہیں۔

”ابا۔۔۔۔۔ کہاں ہیں ابا۔۔۔۔۔“ یہ کہہ کر میں کمرے کی جانب بھاگی۔ لیکن ابا کا خالی بیڈ میرا مزہ چڑا رہا تھا۔

”ابا کہاں گئے۔۔۔۔۔؟“ میں نے چیخ کر کہا۔

اور اتنے میں گھر میں موجود میری چھوٹی بہنیں آ گئیں اور وہ سب بھائے میرے سوال کا جواب دینے کے امی کے ارد گرد کھڑی ہو گئیں اور انہیں سنبھالنے لگیں۔

”بتاؤ ناں تم سب خاموش کیوں کھڑی ہو۔۔۔۔۔ ابا کہاں ہیں۔۔۔۔۔؟“ میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

اس کے ساتھ ہی دھڑکتی آواز کے ساتھ اظہر اندر آیا اور میرے منہ پر ایک لٹے ہاتھ کا زور دار پھیر مارتے ہوئے بولا۔

”مجھ سے پوچھ کر ابا کہاں گئے۔۔۔۔۔؟“ وہ شعلہ بار نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا اور میں حیرت سے منہ کھولے اپنے چھوٹے اور لاڈلے بھائی کو دیکھ رہی تھی جس کے لیے میں نے اتنی

لٹائیں اٹھائی تھیں جو مجھ سے چھوٹا تھا آپنی آپنی کہہ کر اپنی ہر فرمائش مجھ سے کیا کرتا تھا۔

”ایسے کیا آنکھیں بھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہو۔۔۔۔۔ تم میں ذرا بھی غیرت اور شرم ہوئی تو دوبارہ اس طرف آنے کی جرات نہ کرتیں۔۔۔۔۔ مار دیا ناں تم نے انہیں۔۔۔۔۔ وہ تمہارا نام لیتے لیتے اس دنیا سے چلے گئے۔۔۔۔۔ امی اپنے حواسوں میں نہیں رہیں۔ عزت یعنی۔۔۔۔۔ لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کر دیا۔۔۔۔۔ آج ہر نگاہ مجھ سے یہ سوال کرتی ہے۔۔۔۔۔ تیری بہن اپنے کسی بار کے ساتھ بھاگی ہے۔۔۔۔۔ بتاؤ ہم کیا جواب دیں لوگوں کو۔۔۔۔۔ ان جوان بہنوں کو کہاں لے کر جاؤں۔ کون ہمیں عزت کی نگاہ سے دیکھے گا۔۔۔۔۔ کون ان بہنوں کو بیاہنے کے لیے اس گھر کا رخ کرے گا۔۔۔۔۔“

آج ہر زبان ایک ہی بات کہہ رہی ہے۔ ”وہ تو پہلے ہی آوارگی میں پڑ گئی تھی۔ آخر کار بھاگ ہی گئی۔۔۔۔۔“

اظہر کی زبان سے الفاظ نہیں انگارے نکل رہے تھے۔ تیرے جو میری روح کو چھیڑے جارہے تھے۔ اس کے ہر لفظ کے انگارے نے میرے جسم اور روح میں چھالے ڈال دیئے تھے۔

اظہر کا ہر جملہ کوڑا بن کر میری روح کو زخمی کر رہا تھا۔ ”مار دیا تم نے انہیں۔۔۔۔۔“

”تو کیا۔۔۔۔۔ تو کیا۔۔۔۔۔ ابا نہیں رہے۔۔۔۔۔“ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور نیچے پیٹھ چلی گئی اور چچیں مار مار کر رونے لگی۔۔۔۔۔ میں چیخ چیخ کر ابا۔۔۔۔۔ ابا۔۔۔۔۔ پکار رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ کہہ رہی تھی۔۔۔۔۔ ”ابا مجھے معاف کر دیں۔۔۔۔۔ ابا میں کسی کے ساتھ نہیں بھاگی تھی۔۔۔۔۔ ابا واپس آ جائیں۔“

میری چچیں سن کر بہت سے محلے والے جمع ہو گئے۔ بالکل ساکت بیٹھ بیٹھ گاہوں سے

مجھے دیکھ رہی تھیں جب کہ چھوٹی بہنوں کی نگاہوں میں میرے لیے نفرت اور حقارت تھی۔ تب ہی اظہر میرے قریب آیا اگر میرا ہاتھ پکڑ کر جھٹکے سے مجھے کھڑا کرتے ہوئے بولا۔

”بند کرو اپنا یہ ڈرامہ۔۔۔۔۔ تم یہاں آئی کیوں ہو مزید ہمارا تماشا نہ بناؤ۔ پہلے کوئی کسر رہ گئی تھی جو تم پوری کرنے کے لیے آئی ہو۔۔۔۔۔ جاؤ ہمیشہ کے لیے اسی کے پاس چلی جاؤ جس کے ساتھ تم اب تک تھیں۔ ابا نے سرتے وقت تمہیں معاف نہیں کیا تھا اور نہ ہی ہم میں سے کوئی تمہیں معاف کرے گا۔۔۔۔۔ جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔“ اس نے مجھے زور سے دھکا دیا تو میں نیچے گر پڑی۔

میں نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی اور زمین پر پڑے پڑے کہا۔ ”میرے بھائی پہلے میری بات تو سن لو۔۔۔۔۔ مجھے بھی اپنی بے گناہی کے سلسلے میں کچھ بولنے کا موقع دو۔۔۔۔۔“

اظہر نے میری بات نہیں سنی وہ ہار مارتا ہوا گھر میں جھانکنے والوں کی جانب بڑھا اور بولا۔

”دفع ہو جاؤ ساروں۔۔۔۔۔ یہاں کیا تمہاری ماں ناچ رہی ہے جو تماشا دیکھ رہے ہو۔“

اس کی ڈانٹ سن کر سب لوگ دروازے سے ہٹ گئے وہ پھر میری جانب پلٹا اور سفاک لہجے میں بولا۔

”چلو اٹھو۔۔۔۔۔ کھڑی ہو۔“ وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ ”ایک سیکنڈ کے اندر دفع ہو جاؤ۔ میں تمہارا غلط سا یہ بھی اس گھر پر دیکھنا نہیں چاہتا۔“

”اظہر میرا سیکسٹنٹ۔۔۔۔۔“ میں اتھنی بولی تھی کہ وہ پھر دہاڑا۔

”زیادہ چھوٹی بکواس کہانیاں سنانے کی کوشش نہ کرو۔۔۔۔۔ تم نے کیا سوچا تھا کہ اپنی چھوٹی بکواس کہانی سن کر وہیں اپنی پارسائی کا یقین دلا لوگی۔۔۔۔۔ میں

میں بیکل اسٹور پر کھڑا تھا تب شاہد (محلے کا ایک لڑکا) نے مجھے اشارہ کر کے دکھایا کہ وہ دیکھو تمہاری بہن اپنے پیار کی بڑی سی کار سے اتر رہی ہے۔ ایک سیڈنٹ ہو گیا..... باسٹل والوں نے تمہیں اسٹیشنل کار میں گھر بکھوایا ہے۔“ اس نے گھر سے طنزیہ لہجے میں کہا پھر بولا۔ ”تمہیں کہاں کہاں تلاش نہیں کیا..... سارے باسٹل جھان مارے ایک ایک کیلنک دیکھا سارے رشتہ دار تمہاری سہیلیاں سب جگہ پتہ کیا تھا لیکن تم کہیں نہیں تھیں! اب تمہارا غم لے کر اس دنیا سے چلے گئے۔ اب ہمیں تمہاری ضرورت نہیں ہے.....“

ہمارے لیے تم اسی روز مرنے تھیں جس روز لہا کرے تھے تب جاؤ اور آئندہ کبھی ہمیں اپنی شکل نہ دکھانا۔“

”میں کہیں نہیں جاؤں گی..... میں یہیں رہوں گی..... یہ میرے ابا کا گھر ہے.....“ میں روتے ہوئے اٹھی اور تیزی سے اندر کمرے میں آ گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

”دروازہ کھولو۔۔۔۔۔ نکلو اس گھر سے۔۔۔۔۔ دروازہ میں
دروازہ توڑ ڈالوں گا۔“ اظہر نے زور زور سے دروازہ
پینتے ہوئے کہا لیکن میں نے دروازہ نہیں کھولا۔

اطہر تھوڑی دیر تک دروازہ چھینا رہا پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ میں رات تک اندر بند رہی، یہی سوچ کر کہ اظہر کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو وہ میری بات ضرور سنے گا، اس کا رویہ ایکشن فطری تھا۔۔۔۔۔

میری غیر موجودگی میں میرا گھر انہ برباد ہو گیا۔ ابا چلے گئے امی کو اس کھوئے عینیں امی ابا کے وہ سارے خواب جو انہوں نے ہمارے لیے دیکھے تھے سب بکھر گئے۔ مجھے یقین تھا کہ اب اظہر اپنی تعلیم جاری نہیں رکھے گا وہ مکائے گا۔ نوکری بھی چھوٹے سے چھوٹا کام کرے گا لیکن کمائے گا۔۔۔۔۔ بہنوں کی تعلیم کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ میں تو بچی تھی

اظہار کو بچہ ہی سمجھ رہی تھی لیکن اس ایک جھٹسے میں وہ اپنی عمر کی کئی منزلیں ایک ساتھ طے کر گیا تھا وہ ایک جوان اور غیر مت مند بھائی اور بیٹا بن گیا تھا۔ اس نے دنیا والوں کی کسی کسی نگاہیں اور زبانیں پرواشت کی ہوں گی..... مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اظہار کے اندر بابا کی روح جوں رہی ہے۔

میری سمجھ میں اب ہر بات آ رہی تھی..... محلے والوں نے اس وقت ہی میرے خلاف باتیں بنانی شروع کر دی تھیں جب مسز بھانی کی کار مجھے لینے اور چھوڑنے کے لیے آتی تھی۔ وہی لوگ گھر آ کر امی اور ابا سے میرے متعلق اپنی سیدی باتیں کرتے تھے اس لیے ابا اور امی میرے ٹیوشن پڑھانے کے اتنے خلاف تھے اور میں نے بھی جوش چذبات میں کچھ بھی نہیں سوچا..... اتنی عقل ہی نہیں تھی میں تو ابا کا بیٹا بننا چاہ رہی تھی لیکن یہ بھول گئی کہ میں بیٹی ہوں..... بیٹا نہیں بن سکتی اور دنیا مجھے اسی نگاہ سے دیکھ رہی ہے اور میرے گھر نہ لوٹنے کی صورت میں سب کو یہی خیال آیا کہ میں کسی کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہوں میری تلاش شروع ہوئی ہوگی تو سب کو میرے غائب ہونے کا علم ہوا ہوگا اور پھر لوگوں کو باتیں بتانے کا موقع مل گیا۔ میرے غیرت مند ابا اتنا بڑا صدمہ برداشت نہیں کر سکے اور انہوں نے زمین کی گود میں اپنا منہ چھپا لیا۔

میری گمشدگی اور ابا کی موت نے اسی پر ہوا
صد مہ ڈالا اور وہ اپنے حواس کھو بیٹھیں۔ اظہر بھیک تھا
تو کہہ رہا تھا کہ اس گھر کی بیٹی کا کوئی بھی رشتہ مانگنے
کے لیے نہیں آتا۔ جس گھر کی ایک بیٹی آوارہ
ہو جائے یا پھر گھر سے ہی بھاگ جائے۔

میں کیا کہہ کر اپنی بے گناہی کا کسی کو یقین دلانے میں کس طرح جتاؤں کہ میرے ساتھ کیا ظلم ہوا

میں اگر اس گھر میں رہی تو کوئی مجھ سے بات نہیں کرے گا میں سب کی نگاہوں سے گر چکی ہوں' پھر محلہ والے ضرور آئیں گے مجھ سے طرح طرح کے سوالات کریں گے اور اگر..... اور اگر..... میرے ساتھ ہوئی اس سختے بھری بدکاری کا کوئی نتیجہ ظاہر ہو گا تو پھر میں کیا کروں گی.....؟

زندگی مجھ پر تنگ ہو چکی ہے مجھے جیسے نہیں دیا
جائے گا..... میں کیا کروں..... میرا اس گھر سے چلے
جانا ہی بہتر ہے..... لیکن اس پناہ گاہ سے نکل کر میں
کہاں جاؤں گی..... کیا واپس نواب سبطوت کے
ہاں!.....؟

”نہیں نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی..... میں جی چکی
مجھے جتنا جینا تھا اب میرا مرجانا ہی بہتر ہے.....“

پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اپنی زندگی اپنے
ہاتھوں ختم کروں گی روز بروز نشتے اور زلت آئیں زندگی
گزارنے سے بہتر ہے کہ میں موت کو گلے لگا لوں۔
میں نے کمرے میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی کہ میں
کس طرح مر سکتی ہوں، نیچے سے لٹک کر یا اپنے ہاتھ
کی رگ کاٹ کے..... پھر سوچا کہ اپنی خودکشی کی
صورت میں میں اپنے معصوم بھائی کو ایک اور مصیبت
میں ڈال دوں گی..... میں سمندر میں کود کر جان دے
داؤں گی..... سمندر میں ڈوب کر بہت سے لوگ
مر جاتے ہیں میں بھی مر جاؤں گی.....

میں نے خودکشی کا مقصد ارادہ کر لیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے میں بند اور سوچوں میں غم مجھے کئی گھنٹے گزار چکے تھے رات اتر آئی تھی، گھر میں بیٹوز سناٹا تھا، باوجود اچھا میرا روزہ بھی کسی نے نہیں کھلکھاتا تھا۔

میں نے پرس اٹھایا اور اس میں سے کمرائے کے
پچھلے ٹکڑے چاہئے تو صرف پانچ کانوٹ پڑا تھا میں
سے نواب کا درجہ بالا خافہ اٹھایا اور اس میں کچھ سیسے

نکال کر گئے..... پچیس ہزار روپے تھے یہ اچھی خاصی بڑی رقم تھی ہم نے تو بھی اکٹھی اتنی رقم کے بارے میں دیکھنا تو دور کنارہ سوجا بھی نہیں تھا۔

یہ رقم ہے میری عزت کا معاوضہ..... میری اور
میرے گھر والوں کی تباہی اور بربادی کا معاوضہ اور
ایک ابنِ املیس کی عیاشی کا صدقہ.....!

میراجی چاہا کہ ان تمام نونوں کو آگ لگا دوں.....
لیکن میں مرتد رہی ہوں یہ رقم میرے گھر میں کام
آئے گی میں نے سو کاٹھ نکالا اور باقی رقم الساری
میں کپڑوں کی تہہ کے نیچے رکھ دی کہ کبھی نہ کبھی تو کسی
کی نگاہ میں یہ یغافہ آجائے گا۔

میں مزید رات گزرنے کا انتظار کرنے لگی۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھولا۔ سب سو رہے تھے۔ لبا کے پیڈ پر امی اور ساری بہنیں مڑی مڑی حالت میں ایک دوسرے سے جڑی اس طرح لپٹی تھیں جیسے وہ کسی سے خوف زدہ ہوں۔ وہیں زمین پر بستر بچھا کر اظہر سو رہا تھا۔ میں تیزی اور خاموشی کے ساتھ صحن میں نکل آئی ہمارے گھر میں دو ہی کمرے تھے آگے برآمدہ اور صحن تھا صحن میں باہر گلی کا دروازہ کھلتا تھا دروازے میں آئوینک لاک لگتا تھا جو باہر سے چابی سے کھلتا تھا اور اندر سے بغیر چابی کے لاک دبا کے بند ہو جاتا تھا۔

میں نے نہایت آجستگی سے دروازہ کھولا لاک دیا
کر اندر کیا پھر دروازہ بند کر دیا دروازہ لاک ہو گیا تھا۔
میں نے چادر سے اچھی طرح اپنا چہرہ چھپایا اور
تیز تیز قدموں سے بس اسٹاپ کی جانب چلی دی
وہاں کئی ٹیکسیاں کھڑی تھیں میں نے ایک ٹیکسی
والے سے پچھنچن سی سا نڈ چلنے کے لیے کہا تو اس نے
حیرت سے مجھ دیکھا پھر اس کے لبوں پر ایک عجیب
سی مسکراہٹ آگئی بولا: ”بھئیچھن چن“

میں جلدی سے دروازہ کھول کر بیٹھ گئی اس نے سامنے لگا مر مر میرے چہرے پر سیٹ کیا اور ٹیکسی اسٹارٹ کر دی..... تھوڑا چلنے کے بعد بولا۔
”آپ اگلی اس وقت سی سائڈ پر کیا کرنے جا رہی ہیں؟“

جواب میں میں خاموش رہی تو اس نے کہا۔
”آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔“
”تمہیں اس سے کیا مطلب میں اگلی جاؤں یا دو کیلے تم ٹیکسی چلاؤ۔“ میں نے جھٹکا کر جواب دیا۔
”اچھا اچھا میں سمجھ گیا..... گا بک کی تلاش ہے..... اپنا معاوضہ بتائیں..... آج رات مجھے بھی بہت پوریت ہو رہی ہے۔“ اس نے بیک مر میں میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
”جو اس مت کرو تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہے۔ کیا تم نے مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھا ہوا ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”ایسی ویسی نہیں تو..... تو کیا شریف زادیوں رات کے اس وقت تمہاری سائڈ پر تفریح کرنے کے لیے جاتی ہیں۔“ اس نے کہا۔
”جو اس مت کرو ٹیکسی روکو..... مجھے اتار دو.....“
مجھے نہیں جانا تمہارے ساتھ۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے کہا۔
”ناراض کیوں ہوتی ہیں تو نہ سہی۔“ اس نے کندھے اچکا کر کہا اور بدستور ٹیکسی چلا تاربا۔

اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ رات کے اس وقت گھر سے نکل کر میں نے دوسری بڑی غلطی کی ہے۔ یہ ٹیکسی والا بھی مجھے کال گرل سمجھ رہا ہے تب میں نے کہا۔
”تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو رات کے اس وقت تمہا میں سمندر پر گا بک کی تلاش میں نہیں جا رہی بلکہ

خودکشی کرنے جا رہی ہوں۔ میں مر جانا چاہتی ہوں۔“
”کیوں.....؟“ اس نے کہا اور ایک جھٹکے سے بیک لگا دیے۔
”بس میں مرنا چاہتی ہوں تمہیں اس سے کیا تم ٹیکسی چلاتے ہو اور تمہارا کام مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچانا ہے تم مجھ سے کراؤ اور مجھے سی سائڈ پر لے جا کر اتار دو.....“ میں نے کہا۔

”میں ایسا نہیں کر سکتا..... تم مجھ سے کہہ رہی ہو کہ تم اپنی زندگی اپنے ہاتھوں ختم کرنا چاہتی ہو اور میں تمہیں یوں آسانی سے مرنے دوں۔“ اس نے بغور میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
تب میں نے بھی اس کے چہرے کی جانب دیکھا وہ ایک نوجوان آدمی تھا اس کی عمر اٹھائیس سے تیس سال کے درمیان ہوگی..... سانولہ رنگ تھا آنکھیں بڑی اور روشن تھیں گھنی مونچھیں تھیں بظاہر دیکھنے میں وہ ٹھیک ٹھاک دکھائی دے رہا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو میری جان کیا نظر لگاؤ گی..... میری اماں کہا کرتی تھیں مجھے بچپن میں بہت جلدی نظر لگ جایا کرتی تھی۔“ اس نے مجھے اپنی جانب غور سے دیکھتے ہوئے پا کر شوخ اور دستانہ لہجے میں کہا تو میں نے جلدی سے لگائیں جھکا لیں۔
”اچھا ہاں تاؤ کہ تم خودکشی کیوں کرنا چاہتی ہو؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔
”تمہیں کیوں بتاؤں تم میرے کون ہو۔“ میں نے کہا۔
”میں تو انسانیت کے نام سے پوچھ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔
”نہیں مجھے کسی کو کچھ بھی نہیں بتانا..... بس تم مجھے سمندر پر لے چلو ورنہ میں نہیں تمہاری ٹیکسی سے اتار جاتی ہوں اور کسی دوسری سواری سے چل جاتی

ہوں۔“ اتنا کہہ کر میں نے دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو اس نے تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میری نقل اتارتے ہوئے بولا۔
”مجھے نہیں اتار دو میں دوسری سواری سے چل جاتی ہوں۔“ میری نگاہ میں تم ایک انتہائی احمق لڑکی ہو..... اس نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

”تم ہوتے کون ہو میرے ساتھ زبردستی کرنے والے..... میری مرضی مجھے نہیں جانا تمہارے ساتھ۔“ میں نے رومانے لہجے میں کہا۔
”میں تمہارا کچھ بھی نہیں لگتا لیکن پھر بھی تمہارے ہی خیال سے کہہ رہا ہوں رات کے اس وقت ایک جوان اور تمہا لڑکی..... تمہیں پتہ ہے رات میں بھڑے شکار کی تلاش میں کھلے ہوتے ہیں پڑھ جاؤ کی کسی بھیڑیے کے ہتھے..... شکر کرو کہ تم میری ٹیکسی میں بیٹھی ہو میں تو ایک شریف نوجوان ہوں۔“ اس نے کہا۔

”کوئی شریف نہیں ہوتا یہاں سب ہی بھیڑیے ہوتے ہیں۔ میں تم پر یقین کیوں کر کروں۔“ میں نے تنگ لہجے میں کہا۔
”اچھا ایک بات بتاؤ بالکل سچ بتانا..... کیا واقعی تم خودکشی کرنے جا رہی ہو..... یا خودکشی کا نام لے کر خود کو مظلوم ثابت کرنا چاہ رہی ہو سچ سچ بتاؤ تم کون ہو.....؟“ اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا تو میری آنکھوں میں آنسو اگلے اور میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
”میں ایک شریف لڑکی ہوں اور سچ سچ خودکشی کرنے جا رہی ہوں۔“

”مجھے بتاؤ کہ تم خودکشی کیوں کرنا چاہتی ہو مجھے بتاؤ کہ تمہاری کوئی مدد کر سکیں۔“ اس نے کہا۔
”میں ایک شریف لڑکی ہوں اور سچ سچ خودکشی کرنے جا رہی ہوں۔“

”مجھے بتاؤ کہ تم خودکشی کیوں کرنا چاہتی ہو مجھے بتاؤ کہ تمہاری کوئی مدد کر سکیں۔“ اس نے کہا۔
”میں ایک شریف لڑکی ہوں اور سچ سچ خودکشی کرنے جا رہی ہوں۔“

”اگر مدد ہی کرنا چاہتے ہو تو مجھے سمندر میں دھکا دے دو میں جینا نہیں چاہتی اس دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔
”ابھی تم نے بتایا ہے کہ تم ایک شریف لڑکی ہو تو کیا کسی نے زبردستی تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔“ اس نے کہا تو میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
”تمہیں کیسے پتہ چلا.....؟“

”ٹھیک ہے چلو.....“ اتنا کہہ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھا اور ٹیکسی دوبارہ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی میں سر جھکائے آنسو بہائے جا رہی تھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ آیا وہ مجھے سمندر پر ہی لے جا رہا ہے یا کہیں اور..... شاید اس وقت میں ایک بہت ہی احمق اور کم عقل لڑکی تھی..... میں نے سراسر اس وقت اٹھایا جب ٹیکسی رکی۔

میں نے دیکھا کہ وہ سمندر کے بجائے کسی محلے میں آیا ہے یہاں لائن سے قطار میں مکانات بنے تھے۔ یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو..... میں نے متوجہ لگا ہوں اس کی جانب دیکھا اور پوچھا۔
”یہ میرا گھر ہے..... گھبراؤ مت..... تمہیں مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ میں ایک شریف آدمی ہوں..... اتنا بھی شریف نہیں ہوں تھوڑی بد معاشی ہے میرے اندر لیکن اس قسم کے کام نہ کرتا ہوں اور نہ پسند کرتا ہوں..... تم بلا کھٹکے چلی آؤ۔“

اتنا کہہ کر وہ سامنے والے گھر کے دروازے کی جانب بڑھا اور جیب سے چابی نکال کر تالا کھولنے لگا..... تالا کھول کر وہ دوبارہ آیا اور بولا۔
”جلدی اترو..... مجھے ٹیکسی کو سائڈ میں لگانا ہے سچ گلی میں کھڑی ہے۔“

میں یہ سوچ کر اس کے گھر میں چلی گئی کہ اب میں کوئی عفت ماب لڑکی تو رہی نہیں مگر میرے پاس کھودینے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

یہ کمرہ تھا جس میں ایک بیڈ، الماری اور کرسیوں کا ایک سیٹ رکھا تھا، میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور کمرے کا جائزہ لینے لگی اس کمرے میں زیادہ سامان نہیں تھا اس لیے اس کا جائزہ لینے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا پھر میں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی ٹیکسی ڈرائیور مجھے جس کا نام بھی معلوم نہیں تھا ابھی ٹیکسی سائڈ میں لگا رہا تھا اور اندر نہیں آیا تھا کمرے کے باہر اندھیرا تھا لیکن کمرے سے باہر جانے والی مدھم روشنی میں میں نے یہ دیکھ لیا کہ اس کمرے کے برابر میں بھی ایک کمرہ ہے آگے سارا صحن ہے اور صحن کے سامنے میں غسل خانہ اور باورچی خانہ بنا ہوا ہے میں نے کمرے کے دروازے پر کھڑے کھڑے یہ سارا جائزہ لیا، وہاں پلیٹ رہی تھی تو وہ اندر آ گیا۔ اس نے اندر آ کر کمرے کے باہر کھڑے والا دروازہ بند کیا، کٹڈی چڑھائی اور بولا۔

”اے تم ابھی تک کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔۔۔۔۔ اور ہاں میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ مجھے سے ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ ہم کچھ باتیں کریں گے پھر تم برابر دالے کمرے میں جا کر سو جانا۔“

میں نے صرف اثبات میں سر ہلایا میں اس وقت اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ میں کہاں سے کہاں آئی صرف ایک ہفتے میں میری زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آ گیا۔

”جیاس لگی ہے پانی پیو گی۔۔۔۔۔؟“ میرے بیٹھتے ہی اس نے پوچھا تو میں نے ایک بار پھر سر ہلانے ہی پر اکتفا کیا سارا دن گزر گیا تھا میں نے نہ تو پانی پیا

تھا اور نہ ہی کچھ کھایا تھا اسے میرے چہرے پر نہ جانے کیا دکھائی دیا بولا۔
”لگتا ہے تم بھوکے بھی ہو کچھ کھاؤ گی؟“ میں نے پھر سر ہلادیا میرے بازو صرف سر ہلانے پر وہ جھنجھلا گیا اور بولا۔

”اے کیا بات ہے اپنی زبان کیا نیکی میں چھوڑ آئی ہو کہاں رکھی تھی سیٹ کے اوپر یا نیچے کو تو لا دوں۔۔۔۔۔“

اس کی بات سن کر میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی تو اس نے ایک گہرا سانس لیا اور بولا۔ ”شکرا اللہ کا کہ تم مسکرائیں تو۔۔۔۔۔ گڈ کرل۔۔۔۔۔ ویسے ایک بات بتاؤں تمہاری مسکراہٹ بہت خوب صورت ہے۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس نے صحن کی لائٹ چلائی اور پھر کچن میں چلا گیا۔ میں نے جھانک کر دیکھا کہ وہ کیا کر رہا ہے کچن سے کھڑ پٹری کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ذرا دیر بعد وہ باہر آیا اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی اور پلیٹ میں سیب اور کیلے رکھے تھے پلیٹ میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”دراصل میں تجہار بتا ہوں ناں اس لیے کھانا کم ہی پکا تا ہوں، مجھے کچھار موڈ ہوتا۔۔۔۔۔ ورنہ باہر ہی سے کھا لیتا ہوں۔“ فرج میں یہ پھل پڑے تھے فی الحال تو ان پر گڑا رہ کر دھانے کا پانی میں نے چوہے پر رکھ دیا ہے تم اتنے میں کھاؤ میں جانے بنا کر لاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پھر کچن میں چلا گیا اور میں بے تابی کے ساتھ سیب اور کیلے کھانے لگی۔

پھر وہ چائے کے دھگ ایک چھوٹی ٹرے میں رکھ کر لے آیا اور بولا۔ ”تھوڑی بھوک تو مٹ گئی ہوگی فکر نہ کرو صبح تمہیں حلوہ پوری کا شاندار ناشتہ کراؤں گا یہاں قریب ہی سٹھائی کی دکان پر حلوہ پوری بنتا ہے۔“

”تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟“ میں نے پہلا سوال کیا۔
”ہاں فی الحال تو اکیلا ہی ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور ایک گنگ اٹھا لیا اور دوسرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا کہ وہ میں نے لوں نہ جانے مجھے کیا خیال آیا کہ میں نے اس کے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے گنگ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”میں یہ یوں کی۔“
”کیوں اس میں کیا خاص بات ہے تمہیں یہ لینا ہے یہ لے لو۔“ اس نے اپنا کپ میری جانب بڑھادیا اور ٹرے میں رکھا ہوا دوسرا گنگ اٹھا کر اسے پینے لگا چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ”تمہیں منجانے میں کسی چیز میں نشا اور چیز پلا کر بے ہوش کیا گیا تھا۔“ میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا۔ ”تمہیں کیسے پتہ چلا۔“

”تم نے احتیاطاً دھگ نہیں لیا جس کا میں نے تمہیں اشارہ کیا۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔“

میں اس کی عقل پر حیران رہ گئی دیسے بھی وہ عمر میں مجھ سے زیادہ تھا اور دن رات اس کا مختلف قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہوگا۔۔۔۔۔ زمانہ انسان کا سب سے بڑا استاد ہے وہ سب کچھ سکھا دیتا ہے۔

”چلو اب اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتاؤ۔۔۔۔۔ لیکن شہر و پہلے میں تمہیں اپنے بارے میں بتاؤں گا۔ میرا نام رضوان ہے میں پنجاب کے ایک گاؤں سے کراچی پیسہ کمانے کے لیے آیا ہوا ہوں۔ گاؤں میں میرا بھائی تھا ایک چھوٹی بہن، بھائی اور ایک بیوہ ماں نے باپ کا انتقال ہو گیا تھا میں اسکول میں پڑھ رہا تھا گاؤں میں تھوڑی سی

زمین تھی جس پر میرے بابا بھتی بازی کرتے تھے پھر ان کا انتقال سانپ کے ڈسنے سے ہو گیا۔ میں چھوٹا تھا یہ کام نہیں کر سکتا تھا اس لیے میرے چاچا کے مشورے پر ماں نے زمین بٹائی پر وہ دی۔ میں نے گاؤں کے ہائی اسکول سے میٹرک پاس کر لیا تو چاچا نے اپنے ایک جاننے والے سے کہہ کر مجھے شہر بھجوا دیا اور اس نے مجھے یہاں ایک درکشاپ پر کام سیکھنے کے لیے رکھوا دیا۔

مجھے تیل اور گریس کا کام کرنا پسند نہیں تھا میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا اس لیے یہاں شام کے کان میں ریڈیشن لیا۔

میں نے چار سال درکشاپ میں کام کیا اور گریجویٹیشن مکمل کر لی پھر موٹر مکینک کا کام چھوڑ کر جاب کی تلاش شروع کی۔ لیکن اس سلسلے میں بری طرح ناکامی ہوئی تنگ آ کر میں نے ٹیکسی قسطوں پر حاصل کی اور ٹیکسی چلانا شروع کر دیا۔ یہ مکان کرائے کا ہے۔

میں جب گاؤں سے آیا تھا تو نہایت سیدھا اور شریف تھا لیکن یہاں میرا بہت سے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا جو غلط کام کرتے ہیں۔ میری کہانی بہت لمبی ہے، کیا کیا بتاؤں، بس اپنے من کی پوری سچائی کے ساتھ تمہیں بتا رہا ہوں کہ میں ہلکا پھلکا ہاتھ ادھر ادھر مار لیتا ہوں۔۔۔۔۔ کوئی اور برا کام نہیں کیا نہ شراب کو ہاتھ لگایا اور نہ ہی عورت کو۔۔۔۔۔

اپنی حلالی کی کمی گھر بھیج دیتا ہوں، بہن کی شادی کر دی ہے بھائی لاہور میں پڑھ رہا ہے ناں گاؤں ہی میں سے۔۔۔۔۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا اور میری جانب دیکھنے لگا۔

”تم نے ابھی بتایا کہ چھوٹا موٹا ہاتھ مار لیتا ہوں اس کا کیا مطلب ہے۔۔۔۔۔؟“

www.pdfbooksfree.pk

برا لگ رہا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے پوری توڑی اور ایک بڑا سا ٹولہ منہ میں رکھ لیا۔
تو یہ تھی رضوان کے گھر میں گزری میری پہلی رات۔

میں نے رضوان کے ساتھ اس کے گھر میں رہنے کا فیصلہ کر لیا اس نے بہت مہارت کے ساتھ میرا پرین واٹ کیا اور مجھے اپنے ڈھب میں لے آیا اور قائل کر لیا کہ رے کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے برائی کو اپنا ہواگا اگر ایک چھوٹی برائی اپنا کر بڑی برائی کو ختم کیا جاسکتا ہے تو برائی اپنانے میں کیا ہرج ہے۔

گاہے بگاہے وہ میرے حسن کے قصیدے ضرور پڑھتا رہتا تھا لیکن اس نے کبھی بات کرتے ہوئے میرا ہاتھ بھی پکڑنے کی کوشش نہیں کی لیکن جب کبھی میں گھبرا کر رو پڑتی تو مجھے بچوں کی طرح اپنے سینے سے بھی لگا لیتا تھا لیکن اس وقت اس کے انداز میں شفقت ہوتی تھی ہوں نہیں۔

میں اس کی شخصیت کے بارے میں سوچتی تو حیران ہوتی کہ یہ کس قسم کا جوان مرد ہے میرے بارے میں میرے حسن کی بے پناہ تحریف کرتے ہوئے بھی اس کے جذبات نہیں بھڑکے ایک دن یہی بات میں نے اس سے پوچھی تو وہ اداس لہجے میں بولا۔
”جب دل بچھ جائے تو شہر تنہا کے چراغاں سے روشنی نہیں ہوتی۔“

”کیا مطلب؟“ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا اور میں نے لہجہ کر اس سے پوچھا۔

”یاد ایک تو تمہاری سمجھ والی چھوٹی بہت ہے میری پیاری دوستی اپنی عقل کے بند دروازوں پر کبھی دستک بھی دے لیا کرو۔“

”کیا ہے تم ہر وقت مجھے ڈانٹتے کیوں ہو؟“ میں

نے رو ہنسی ہو کر کہا۔

”تو کیا کروں.....! یا آج کل کی لڑکیاں آؤ تیز طرار ہیں اور تم بونگی کی بونگی رہیں۔“ اس نے جھجھکا کر کہا۔

”تو تم کس لیے ہوتم بنا دونوں مجھے تیز طرار..... میں نے شوخ لہجے میں کہا۔

”یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے آج سے تمہارا سبق شروع.....“ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے پر جوش لہجے میں کہا۔
”نہیں نہیں رکو..... پہلے اپنے جملے کا مطلب سمجھاؤ کیا تمہارے شہر تنہا..... چراغاں وغیرہ.....“

میں نے ہاتھ کے اشارے سے تیزی سے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ میرا دل ایک مرتبہ نور چکا ہے میں نے کسی کو دل دیا اس نے توڑ کے ڈسٹ بن میں پھینک دیا اس بات ختم..... میں نے بھی عورت کا نام اپنے دل سے کھرچ ڈالا۔“ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا تو میرا دل دکھ سا گیا اور اس نے اتنی تکلف و بات تھی آسانی سے ہنسی میں اڑا دی۔
”تمہیں کسی سے پیار ہوا تھا؟“ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”ہاں یاد ہوا تھا لیکن یہ کہانی اب پرانی ہو چکی ہے پرانے دشمنوں کو اگر کریدو تو دوبارہ تکلیف دینے لگتے ہیں۔“ اس نے اداس لہجے میں کہا تو میں خاموش ہو گئی۔
پھر اس نے آہستہ آہستہ مجھے مختلف چیزنا سکھانی شروع کیں بہت سے فن سکھائے وہ ایک استاد کی طرح میری تربیت کر رہا تھا۔

ایک دن مجھے اپنے گھر والوں کا خیال آیا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ اس مکان نمبر کے رہنے والوں کے بارے میں معلومات کرائے میں

اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ میرا گھر ہے تب اس نے ایک بات کہہ کر مجھے حیران کر دیا۔
”یہ تمہارا گھر ہے نا.....!“
”تمہیں کیسے معلوم.....؟“ ہمیشہ کی طرح میں نے اہقانہ سوال کیا۔

”اب بھی تم یہ سوال پوچھو گی..... رضوان کو سب پتہ ہوتا ہے۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔

میرے بہت پوچھنے پر اس نے مجھے یہ بتایا تھا کہ اس کا اپنا ایک گروہ ہے اور وہ اپنے گروہ کا ہیڈ ہے لیکن اس کے گروہ کا کوئی بھی شخص آج تک اس گھر میں نہیں آیا تھا شاید اس نے منع کر دیا تھا۔

”ہاں وہ میرا گھر ہے۔“ میں نے اداس لہجے میں کہا۔
”ہاں میں اپنے گھر کے حالات جاننا چاہ رہی تھی تم معلوم کر دادو۔“

”مجھے پتہ ہے۔“ اس نے مجھ سے نگاہیں چرا کر آہستہ سے کہا۔

”کیا پتہ ہے تمہیں.....؟“ میں نے تابی سے اٹھ کر اس کے نزدیک چلی گئی۔

”وہ لوگ یہاں سے چلے گئے ہیں۔ یہ مکان بیچ کر کہاں گئے ہیں یہ نہیں معلوم۔“

”اچھا.....“ میں نے زیر لب کہا اور ایک گہری سانس لی۔

رضوان کی ٹیپنگ جاری تھی اب مجھ میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی تھی مجھ میں جو تبدیلی آئی تھی اس کی رفتار سست تھی لیکن مستحکم تھی میری نشوونما کا عمل بتدریج جاری تھا اب میں دو درپوک احسن اور مسکین چھوٹی کنڑا کی نہیں رہی تھی رضوان نے مجھے سارے داؤ بیج سکھادیے تھے ہاتھ کی صفائی میں اس نے مجھے طاق کر دیا تھا۔

لوگوں کی جھپیں صاف کرتا دکانوں سے مال

اڑانا دس میں خواتین کے پرس سے رقم اور چوہری اڑانا ہمارا کام تھا۔ میں بن سنور کر شادی ہالوں میں بھی گھس جاتی اور وہاں موجود سونے کے زیورات سے لدی خواتین سے ٹکرا کر ان کی ایک آدھ چوہری یا آسانی اڑا لیتی اور مزے سے نکل آتی۔ شادی ہال کے باہر رضوان اپنی ٹیکسی کے ساتھ موجود ہوتا۔

ایک دن رضوان کہنے لگا۔ ”یار ان چھوٹی موٹی وارداتوں میں مزہ نہیں آ رہا“ ہمیں کوئی بڑا ہاتھ مارنا ہوگا۔

”تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں ایک فانیو اسٹار ہوٹل میں دوستی کے ایک چوہر کی بیوی آرہی ہے وہ خالص بیروں کا ٹیکس پینے رہتی ہے اگر تم وہ اڑالو تو ایک ہی جھکے میں وارے تیار سے ہو جائیں۔“ رضوان نے کہا۔

”اچھا کب آرہی ہے وہ.....؟“ میں نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔

میں تیار ہو گئی کیونکہ میں بہت جلد ڈھیر ساری دولت اکٹھی کرنا چاہ رہی تھی مجھے اپنے دشمنوں سے مقابلہ جو کرنا تھا۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ رضوان نے اپنے گروہ کے دوسرے لوگوں سے بھی میری دوستی کرادی تھی۔ وہ سب رضوان کے حکم پر مجھے میڈم روزی کہتے تھے۔

بعد میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ رضوان ٹیکسی ڈرائیور نہیں ہے بلکہ سچ تھا کہ اس کا گھر ہاں بھائی بہن گاؤں میں تھے لیکن اس کا تعلق جرائم کی دنیا سے تھا اور لوگ اسے گلوبا دشاہ کے نام سے جانتے تھے۔

اس گھر کے علاوہ رضوان کے ایک دوڑاے بھی تھے جہاں اس کے ساتھی نادان کی غرض سے لوگوں کو اغوا کر کے رکھتے تھے۔

یہ ساری باتیں آہستہ آہستہ مجھے رضوان نے خود بتائی تھیں اس رات جب میں رضوان کی ٹیکسی میں بیٹھی تھی رضوان وہاں کسی اور ہی کام کے سلسلے میں آیا تھا میری وجہ سے اس کا کام بھی اوجھڑ رہ گیا اور میرے بارے میں جان کر اسے یہی خیال آیا کہ میں اس کے گروہ میں ایک کارآمد اضافہ ثابت ہو سکتی ہوں اس نے مجھ پر محنت کی اور مجھے پتھر سے پیرا بنا دیا۔

اچانک مجھے ہٹھے ہٹھے خیال آیا تو میں نے کہا۔
”رضوان تم تاوان کی غرض سے لوگوں کو اغواء کرتے ہو اور پھر تاوان لے کر چھوڑ دیتے ہو ایک اغواء میرے لیے بھی کرو.....!“

”کس کو؟“ اس نے چونک کر کہا۔
”ڈیفنس فیرفائو میں ایک شخص ہمدانی رہتا ہے اس کی دس سالہ بیٹی کو اغواء کرنا ہے اور نہ صرف اغوا کرنا ہے بلکہ اس کی امروزی بھی کرنی ہے اور پھر زندہ حالت میں اس کے ماں باپ کے پاس واپس بھیجنا ہے پورے ایک ہفتے کے بعد.....“

”بچہ کی نشاندہی میں کروں گی۔“ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔
”اچھا تو وہ شخص یہی ہمدانی تھا جس نے تمہیں تھکے طور پر اپنے پیر کے پاس بھیجا تھا۔“ ہوشیار اور متعل مندر رضوان فوراً سمجھ گیا۔
”بولو کرو گے یہ کام.....!“ میرے لہجے میں خود بخود دشمنی اور جھوکی شہرٹی کی ہی غراہٹ اتر آئی۔
”کوئی مشکل ہی نہیں لیکن جو دوسرا کام تم میرے بندوں سے کروانا چاہ رہی ہو وہ آج تک میں نے نہیں کروایا۔“ رضوان نے کہا۔
”ابھی تک نہیں ہوا تو اب ہوگا.....“ جب میں پاک باز نہیں رہتی تو میں کسی کو بھی رہنے نہیں دوں گی..... اب سارے دولت مندوں کی بیٹیوں کی

جا ہے تاکہ یہ اپنی زبان سے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی داستان اپنے ماں باپ کو سنا سکے اور پھر دوسرے سے کہ انہیں یاد آ جائے کہ انہوں نے کسی اور کی بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا شاید اپنے گناہ اور جرم کا احساس ہو جائے۔

میں نے رضوان کے چہرے کی جانب دیکھا تو مجھے عجیب سے تاثرات نظر آئے مجھے غصہ آ گیا اور میں نے غصے میں چلا تے ہوئے کہا۔

”تجہیں کیوں اس پر ترس آ رہا ہے میرے ساتھ کام کرنا ہے تو رحم نام کی کسی بھی شے کو ان کے اندر سے کھرچ کھرچ کر پھینک دو۔۔۔۔۔ اس ظالم اور سنگ دل زمانے سے سب کچھ چھین لو اس کی عزت اس کی خوشیاں اس کا چین و آرام۔۔۔۔۔!“

”رینکس ڈیز۔۔۔۔۔ آؤ اب چلتے ہیں۔ کل اس کو واپس بھی کرنا ہے اور پھر ہمیں فائینڈسٹار ہوٹل میں بھی جانا ہے۔“ رضوان نے مجھے ہاتھوں میں بھر لیا اور میرا سر سہلانے لگا اور میں پرسکون ہو گئی۔ ایسا کیا تھا اس شخص کی ذات میں مجھے نہیں۔۔۔۔۔ شاید وہ مجھے اچھا لگنے لگا تھا، لیکن میں جانتی تھی کہ اس کے دل میں میرے لیے ایسے پیار و محبت کے جذبات نہیں ہیں۔ دوسری شام رضوان مسلسل اپنے بندوں کے ساتھ رابطے میں تھا آج تناؤ ان کی رقم لے کر عرشہ کو ان کے حوالے کرنا تھا ان لوگوں نے ناتھ کراچی کی ایک زرتیگر عمارت میں انہیں بلایا تھا اور انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ بچی ہے ہوش ہوگی اور یہ کام احتیاطاً کیا گیا ہے۔

میں لاؤنج میں ٹی وی آن کیے بیٹھی تھی اور بے دلی سے چینل تبدیل کر رہی تھی میرا پورا دھیان رضوان کی جانب تھا جو بالکونی میں اپنا موبائل فون ہاتھ میں لیے کھڑا تھا اس کے پاس ایک نہیں دو تین

موبائل فون تھے۔ مختلف نمبروں پر اس کے میسر اور کالز آ رہی تھیں۔ یہ سارے فون اور اس کی سمر ایسے لوگوں کے ناموں پر ایڈسٹرکٹ کی گئی تھیں جو اب اس دنیا ہی میں نہیں تھے۔

اچانک ہی ایک کال آئی اسے سن کر رضوان میری جانب آیا اور بولا۔

”یاد روزی ہمارا آج کا ٹائٹ پروگرام کینسل ہو گیا ہے اس لیے آج ہم لوگ ہوٹل نہیں جائیں گے۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ابھی میرے بندے کا فون آیا ہے وہ بتا رہا ہے کہ آج وہ عورت نہیں آ رہی شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اب کل یا پرسوں وہ پارٹی ہوگی۔ چلو اچھا ہی ہے ابھی دیکھیں میرا دماغ سالے اس مسئلے میں الجھا ہوا ہے۔“ اس نے میری جانب دیکھے مینا موبائل فون پر لگا نہیں جھاتے ہوئے کہا اور دوبارہ بالکونی کی جانب چلا گیا۔ تو میں بھی ٹی وی آف کر کے رضوان کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اس کے چہرے پر بے پناہ فکر کے تاثرات تھے۔

”کیا بات ہے رضوان سب ٹھیک تو ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے اس کے چہرے پر پریشانی ہو یاد دیکھی تو پوچھا۔

”کچھ نہیں یاد آ رہا ہے۔۔۔۔۔ میرا پورا دھیان ان لوگوں کی جانب ڈسٹرٹ کر دیا۔۔۔۔۔“

دوسری جانب سے وہ لوگ رضوان کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے اور اسے ہر لمحے کی خبر دے رہے تھے۔ رضوان کہیں سے انہیں گائیڈ بھی کر رہا تھا۔

میں نے کندھے اچکائے اور اندر آ گئی۔ اس

بات کا مجھے پورا اطمینان تھا کہ ہمدانی نے پولیس کو اس کیس میں شامل نہیں کیا تھا وہ تنہا پیسے لے کر آ رہا تھا اور ان لوگوں کا پلان بھی یہی تھا کہ وہ مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھال کر اسے نگاہ میں رکھے ہوئے تھے عرشہ کو ان لوگوں نے بے ہوشی کی حالت میں اس عمارت کے ایک کمرے میں لٹایا ہوا تھا اور ہمدانی کو مسلسل فون پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا کہہ رہے تھے۔ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ہمدانی اکیلا ہی ہے ایک ہندو ایک مزدور کی صورت میں نیچے موجود تھا جب ہمدانی کی کار اس کے قریب سے گزری تو اس نے دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ ہمدانی اکیلا ہے اور کوئی دوسرا فرد اس کی گاڑی میں نہیں ہے۔

بعد میں رضوان نے مجھے مزید تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ جب اس بات کا اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ ہمدانی تنہا آیا ہے تو اس سے کہا کہ وہ رقم کا بیگ یہاں رکھ کر چپ چاپ چلا جائے رقم دیکھ کر اطمینان ہو جانے کے بعد ہمیں اس جگہ کا پتہ بتا دیا جائے گا جہاں تمہاری بیٹی موجود ہے۔ ہمدانی نے گھبرا کر کہا کہ یہ غلط بات ہے ایک ہاتھ دے دوسرے ہاتھ لے دالا معاملہ ہونا چاہیے تب رضوان کے بندے نے کہا کہ سالے تم جیسے حرامیوں سے ہمیں شرافت کی قطعی امید نہیں ہے حالانکہ تم لوگ شریف کہلاتے ہو اس کے برعکس ہم بد معاش ہیں لیکن معاملہ ایماندار سے کرتے ہیں اور زبان کے کھرے ہیں اس لیے تمہیں ہماری جانب سے کوئی فکر نہیں کرنی چاہیے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا ہمدانی نے رقم والا بیگ اس عمارت میں شریف کی لنگڑیوں کے پاس رکھ دیا اور خود تیزی سے وہاں سے چلا گیا اور اس سے زیادہ پھرتی سے رضوان کے بندوں نے وہ بیگ اٹھایا اور مخالف

سمت روان ہو گیا۔ رات کے گیارہ بجے وہ بندہ رقم والا بیگ لے کر گھر آ گیا اور فون کر دیا کہ بچی اس عمارت کی تیسری منزل کے ایک کمرے میں موجود ہے۔

رقم پوری تھی اس رات ہم نے جشن منایا۔۔۔۔۔ میں بہت زیادہ خوش تھی۔ وہ سارے لڑکے جنہوں نے میرے دل کی بھڑاس ہمدانی کی بیٹی کی عزت کی دھجیاں کھیر کر نکالی تھی سب کے منہ چوم لیے۔

رضوان نے سب کے حصے کی رقم انہیں دی تب میں نے اپنے حصے کی رقم سے انہیں انعام بھی دیا۔ رضوان مجھے یہ سب کرتے ہوئے عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کہا۔

”مرد کیوں نہیں بنتا ہے تجھے صرف باتیں کرنی ہی آتی ہیں۔۔۔۔۔ حیوان کیوں نہیں بن جاتا۔۔۔۔۔!“ اور پھر نہ جانے اسے کیا ہوا۔۔۔۔۔ وہ حیوان بن گیا۔۔۔۔۔ اور پہلی بار مجھے ایک انسان کا حیوان بننا بہت اچھا لگا۔ دوسرے دن رضوان کہنے لگا۔ ”روزی یہ تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میرا خود سے کیا ہوا عہد خود مجھ سے ہی تو دیا۔“

”پاگل ہو گئے ہو۔۔۔۔۔ ایسے بھی بھلا عہد کیے جاتے ہیں۔ یہ تو باندھے ہی توڑنے کے لیے جاتے ہیں۔ آج پھر سے ایک عہد کر لو کہ آئندہ میرے علاوہ کسی اور عورت کو ہاتھ بھی لگاؤ گے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اور ہاں جب تم سے زیادہ حسین اور جی دار عورت ملے گی تو اس عہد کو توڑ ڈالوں گا۔“ اس نے ایک گہری اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”جان سے مار دوں گی تمہیں بھی اور اسے بھی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

ابھی ہم دونوں باتیں ہی کر رہے تھے کہ کام کرنے والی مانی آگئی۔۔۔۔۔ وہ ہمیں میاں بیوی سمجھتی تھی۔ اور ہم نے غلط بھی یہی کیا تھا۔

ناشتہ لگا کے بعد وہ بولی۔ ”بیگم صاحبہ آپ نے آج فی دی دیکھا۔۔۔۔۔ تو بے توبہ کسی خبر آئی ہے میرا تو کیا جو بی کاپ کر دیا۔“

”کیوں کیا ہوا؟ کیسی خبر؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے فی دی کا ریموٹ اٹھا ہارٹی وی آں کر دیا۔

”خبروں والا چینل لگا میں جی۔۔۔۔۔ ایک دن گیارہ سال کی بچی کو ظالموں نے اغوا کیا اور اس کے ساتھ۔۔۔۔۔! وہ اپنے گال پیٹتے ہوئے بولی۔ ”بڑا ظلم کیا ہے جی۔۔۔۔۔ خدا غارت کرے ان ظالموں کو۔۔۔۔۔“

اس کے ماں باپ کی بہت بری حالت ہے بار بار فی دی پر دکھا رہے ہیں۔ سنا ہے وہ بہت بڑا آدمی ہے پولیس اب ان لوگوں کو تلاش کر رہی ہے اللہ کرے پکڑے جائیں اور پولیس انہیں پھانسی چڑھا دے۔۔۔۔۔“ کریمیاں کو بڑی ہمدردی ہو رہی تھی ہمدانی اور اس کی بیوی سے وہ اغوا کنندگان کو خوب گالیاں اور کوسنے دے رہی تھی۔

”چل چل جا یہاں سے ایسی دردناک خبریں سنا کر میرا دل نہ ہلایا کر۔۔۔۔۔ اپنا کام ختم کر اور جا۔“ میں نے تپ کر کریمیاں کو ڈانٹا تو وہ چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

میں نے نیوز چینل لگایا ہمدانی کو دکھایا جا رہا تھا وہ نیوز چینل اور اخباری نمائندوں سے بات کر رہا تھا پھر دکھایا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ پولیس اسٹیشن سے باہر آیا تھا وہ زیرِ تعمیر عمارت بھی دکھائی جا رہی تھی جہاں سے بچی بازیاب ہوئی تھی۔ البتہ عرشہ کوئٹہ دکھایا گیا صرف اتنا بتایا گیا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ پھر فی دی کا نیوز کا سٹر ایجنٹ رپورٹ میں کہنے لگا

کہ ہمارے معاشرے میں آج کسی کی بھی عزت اور جان و مال محفوظ نہیں ہے لوگ ایسے کاموں کے لیے پولیس سے رجوع نہیں کرتے اور خود اکیلے سارے معاملے سے نمٹتے ہیں اور بعد میں پولیس کے پاس جاتے ہیں پولیس اب اندیسرے ملوثیاں مار رہی ہے اس لیے کہ چالاک ملزمان نے کوئی معمولی سا ثبوت بھی نہیں چھوڑا ہے بچی بھی کسی کو چرے سے نہیں بچا سکتی کیونکہ جو بھی اس کی پاس آتا تھا اس کے چہرے پر سیاہ نقاب ہوتا تھا پولیس سوبائیں نمبر سے بھی مجرموں کو ٹریس کرنے کی کوشش کی تھی وہ بھی بند ملا دوسرے وہ سزا ایسے اشخاص کے شہابی کارڈ رالیٹو کرانی گئی تھیں جو مردہ ہیں سب دیکھتے ہیں پولیس کیا کارنامہ کرے دکھائی ہے آیا وہ مجرموں کو پکڑنے میں کامیاب ہوئی ہے یا نہیں۔“

میں نے ہنستے ہوئے فی دی بند کیا اور رضوان کے سامنے روٹی کی صورت بنا کر کہا۔

”چہ چہ۔۔۔۔۔ یہ دنیا بڑی خراب ہو چکی ہے لوگ بہت سنگ دل اور ظالم ہو گئے ہیں۔ محبت امن اور بھائی چارہ محض کتابی اور افسانوی باتیں ہو کر رہی ہیں۔“

رضوان نے ایک بار پھر مجھے شوخ لگا ہوں سے دیکھا تو میں نے کہا۔ ”ہائے بھارہ ہمدانی اور اس کی بیوی۔۔۔۔۔! اور رضوان نے لپک کر اپنے لبوں سے میرا منہ بند کر دیا اس رات میں بہت سکون سے سوئی۔

دوسرے دن ہمیں اطلاع ملی کہ آج رات پارٹی ہے۔ اس میں بہت سے ملکی اور غیر ملکی مہمان بھی آ رہے ہیں یہاں زیادہ تر بزنس مین بزنس میٹنگ اور ڈیننگ کے لیے آتے تھے۔ میرے نام اس پارٹی کے لیے جو کارڈ الیٹو کروایا گیا تھا وہ ایک بزنس دوکن میڈم روزی کے نام تھا۔ جس کے کئی بزنس تھے۔ اس کارڈ کو حاصل کرنے کے لیے خاصی بڑی رقم خرچ کرنا پڑی

تھی۔ مجھے اس پارٹی میں بزنس دوکن کی حیثیت سے جانا تھا رضوان کو میرے ساتھ ہی جانا تھا اور اسے میرے منیجر کی حیثیت سے جانا تھا۔ پارٹی رات گیارہ بجے شروع ہوئی تھی اور آخر رات تک جاری رہتی تھی۔ رضوان نے نہ جانے کہاں سے ان لوگوں کی لسٹ بھی حاصل کر لی تھی جو پارٹی میں آ رہے تھے۔ بقول اس کے کہ بہت موٹی موٹی اسامیاں آ رہی ہیں۔ تمہیں اپنے کام کی تمام تر مہارت سے کام لیتے ہوئے خوب سارا مال میٹنا ہے اس کے علاوہ اگر کسی کو اپنے حسن کے جال میں پھنسا کر اور الو بنا کر مال سمیٹ لو تو کیا بی بات ہے۔

میں نے دن میں خوب سو کر اچھی طرح اپنی فینڈ پری کر لی شام کو بائٹل فریش بیدار ہوئی میرا لباس اور پیوری پہلے سے تیار تھی۔

بیتو کر کے ایک کار لے آیا تھا میں تک سب سے تیار ہو کر رضوان کے ساتھ فائو اسٹار ہوٹل کی جانب چل دی فی کار رضوان چلا رہا تھا اور میں بیگم صاحبہ بن کر چھپٹی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

ہوٹل پہنچ کر کار سے اترنے سے پہلے میں نے ایک بار پھر غیر ملکی منیجر پر لیوم کا اپنے جنس پر چیخ کا ڈ کیا اور اپنا چھونا سا گولڈن پرس ہاتھ میں تمام کر مورنی کی کی چال چلتے ہوئے ہوٹل میں داخل ہو گئی۔

رضوان میرے ساتھ موبد انداز میں چل رہا تھا۔ ہال کے بندروازے کے پاس پہنچ کر رضوان نے گاڑی کو کارڈ دکھایا اس دوران میں نے نیازی سے اپنے گلے میں پڑی مصنوعی پتھروں کی بڑی سی ڈالنے کی تیاری کی۔

گاڑی دیکھ کر گاڑی نے جھک کر ہال کا بڑا سا دروازہ کھول دیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر قدرے جھک کر ایک ہاتھ سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔

”تھینکس۔۔۔۔۔! میں نے ایک ادا سے مسکرا کر کہا اور ہائی ہیل کی دھیمی آواز سے ٹھک ٹھک کرتی ہوئی اٹھلائی اور مل کھاتی ہوئی اندر کی جانب بڑھتی چلی گئی۔“

دستج بال طرح طرح کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا یہاں مقامی نہیں بہت سے غیر ملکی بھی نظر آ رہے تھے۔ جن میں اکثریت ہلڈ ایسٹ کے لوگوں کی تھی۔ ہال میں بہت سے ٹیبل اور چیئر بھی تھیں کچھ لوگ ان چیئر پر بیٹھے ضروری باتوں میں مصروف تھے تو کچھ لوگ سامنے رقص کر رہے تھے کچھ خواتین تنہا رقص کر رہی تھیں تو کچھ لوگ جوڑوں کی شکل میں رقص کر رہے تھے اور بعض لوگ اس نیم روش ہال میں ان لوگوں کا رقص دیکھنے میں محو تھے۔ ہال میں اگرچہ تمام میز پر بھری ہوئی تھیں اور مزید کسی کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی تاہم میرے داخل ہونے کے بعد ایک نوجوان جوڑا وہاں سے اٹھ کر ایک دوسری میز کے پاس چلا گیا۔

رضوان نے فوراً اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور لپک کر اس خالی میز پر قبضہ کر لیا اور ہمیں وہاں بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔

میرے قریب کی میز پر دو افراد بیٹھے تھے ان میں سے ایک عمر رسیدہ تھا اور دوسری ایک نوجوان لڑکی تھی۔ دونوں کا تعلق کسی یورپی ملک سے دکھائی دے رہا تھا۔ کس ملک سے ہے یہ میں نہیں جان سکی۔ لڑکی بہت خوب صورت تھی جس کی آنکھیں براؤن اور بڑی بڑی تھیں۔ قد بھی درمیانہ تھا۔ سفیدی مائل رنگت تھی۔ بحیثیت مجموعی وہ ایک دلکش شخصیت کی مالک دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں خاص دلچسپی سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ اس لڑکی نے میری

جانب دیکھ کر انگریزی میں اس مرد سے کہا۔
”مجھے لگتا ہے پاکستانی ہے کیوں نہ اس سے
بات چیت کی جائے۔“

مرد نے جواب میں کچھ کہا وہ میری سمجھ میں نہیں
آیا۔ کیوں کہ میری توجہ اپنے ہائیں جانب والی ٹیبل
پر بیٹھے جوان اور خوش گل آدمی پر پڑی جو اپنے ٹھاٹ
ہاٹ سے خاصا مال دار دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے
بہترین ترش خراش کا سوٹ پہنا ہوا تھا اور اپنی ٹانگیں
میں سوئے کا ٹائیٹن لگا ہوا تھا جس میں ایک عدد
چھوٹا سا ہیرا بھی جڑا ہوا تھا۔

وہ شخص تنہا بیٹھا میز سے شغل کر رہا تھا تب ہی
رضوان نے میری جانب جھٹکے ہوئے کہا۔
”روزی تمہیں اس شخص کو جھانسنے میرے
خیال کے مطابق یہ خاصا دولت مند لگتا ہے۔“
میں نے اس مرد کی جانب سے لگا ہوا ہٹا لیں اور
ڈانٹنگ فلور پر مرکوز کر دیں اور آہستہ سے ہال کے
انداز میں ہٹا کر باہر گئی۔

انچ پر مزید بیس پچیس منٹ تک قرض ہوتا رہا میں
اور رضوان مزید لوگوں کو ہٹاتے رہے میں نے دیکھا
کہ ایک طرح دار اور حسین لڑکی اس کی ٹیبل پر گئی اور
جھک کر کوئی بات کی لیکن اس نے مسکراتے ہوئے
محذرت کے انداز میں سر کوٹھکی میں ہلا دیا۔
”مشکل بندہ لگتا ہے۔“ اسے ایسا کرتے کن
اکیوں سے دیکھتے ہوئے میں نے زیر لب رضوان
سے کہا۔

”تمہارے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے ڈیئر۔۔۔۔۔
تم اس حرافہ سے نہیں زیادہ دلکش اور حسین ہو۔
رضوان نے دوسری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
”رضف قسم ہو گیا۔ سارے جوڑے تھک گئے تھے
اور نیم تار یک ہال میں ایک دم روشنیاں جل اٹھیں۔

اتنی ساری روشنیاں ایک ساتھ جلیں کہ سارا ہال بھو
نور بن گیا۔

اور میں اس ہال میں جھگڑنے ہوئے دیکھتے
ہوئے صاف و شفاف اور روشن چہروں کو دیکھ رہی
تھی۔ چہرے جن پر مسکراہٹیں تھیں جو اپنے اندر
زندگی کا ایک خاص مقبوم رکھتے تھے اسی دوران اس
جوان آدمی کی نگاہ میرے اوپر آئی اور ٹھہری۔

مجھے اپنے حسن کا اور اس کی قدر و قیمت کا بھی
طرح سے اندازہ تھا۔ آج میں نے غیر معمولی حسین
نظر آنے کے لیے سارے جھکنڈے استعمال
کر لیے تھے۔ حالانکہ حسین نظر آنے کے لیے مجھے
میک اپ کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اوپر اٹھ
لگا ہوا گھماتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تو ہماری
نگاہیں آپس میں ٹکرائیں۔ کیونکہ ابھی تک اس کی
نگاہیں مجھ ہی پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا
جیسے وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا ہو جو اب ایک نرم اور حوصلہ افزا
مسکراہٹ میں نے بھی پاس کر دی۔

مجھے خوشی ہوئی کہ مجھے اس کی جانب پیش قدمی
نہیں کرنی پڑے گی اور امید کر رہی تھی کہ وہ خود آٹھ کر
میرے پاس آئے گا۔

دس منٹ کے وقفے کے بعد ہال میں جوڑوں کا
قرص پھر شروع ہو گیا۔ موسیقی کی وجہ سے تھیل ہو گئی
روشنیاں پھر سے آدھی بجھا دی گئیں بہت سے مردانہ
عورتیں ایک دوسرے سے لٹل گیر ہو کر ہال کے
ڈانٹنگ فلور کی جانب بڑھنے لگی۔

”ایکسکیوز می!“ اچانک وہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور
میرے پاس آ کر بولا۔ ”کیا آپ میرے ساتھ قرض
کرنا پسند کریں گی؟“

مجھے قرض قرض کرنا تو خاک آتا تھا، بس یوں تو
کبھی کبھار لٹے سیدھے ہاتھ پاؤں چلا لیتی تھی۔

”وائے ناٹ! مجھے آپ کی خواہش کے احترام
میں ایسا کرنا اچھا لگے گا۔“ میں نے بڑے نرم اور
شائستہ لہجے میں کہا۔ ”اور آپ جیسے ہندسہ اور
بہرہ مزد کے ساتھ قرض کرنا میرے لیے خوشی کا
باعث ہوگا۔ لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ مجھے زیادہ
اچھا قرض کرنا نہیں آتا کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے پانسو بیٹا
کر آپ کو مایوسی ہو۔“ میں نے سوچا کہ اسے یہ بات
صاف بتا دوں۔ میری بات سن کر وہ مزید مجھ سے
متاثر ہو گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں بھی اچھا قرض کرنا نہیں جانتا، بس آپ
جیسی حسین خاتون کے ساتھ وقت گزارنے کا یہ تو
ایک خوب صورت بہانہ ہے۔“

اس کی بات سن کر میں نے ایک ہانکا سا ہتھکڑ لگایا۔
تو وہ میری جانب حیرت سے دیکھنے لگا اور بولا۔
”مائی گاڈ لیڈی آپ کی ہنسی بہت دلکش ہے
بالکل آپ کی طرح۔۔۔۔۔ بالکل ایسا لگا جیسے کوئی نرم
جھرنہ آہستہ روی کے ساتھ بہہ رہا ہو۔“

”آپ کو تو شاعری بھی آتی ہے مسٹر۔۔۔؟“ میں
نے اس کا نام جاننے کے لیے اپنا فقرہ اٹھوا چھوڑ دیا۔
”خرم!“ اس نے میرا سوال سمجھ لیا اور نام بتا دیا۔
”اور میں روزی۔۔۔۔۔ میڈم روزی کہتے ہیں سب
مجھے۔۔۔۔۔ میں نے اپنا تعارف کر دیا۔

”آپ نے ابھی مجھ سے کہا کہ مجھے شاعری بھی
آتی ہے تو بانی گاڈ میں تو شاعری کی الف ب سے بھی
واقف نہیں ہوں۔ وہ تو جب آپ کا جہاں سوز حسن
سانے ہو تو مجھ جیسا ابد ذوق بھی خود بخود شاعر بن جاتا
ہے۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا
اور میرا ہاتھ تمام کر مجھے کرسی سے اٹھا لیا۔

ہم دونوں ڈانٹنگ فلور پر چلے گئے اور قرض
کرنے والے جوڑوں میں شامل ہو گئے۔ خرم کے

ہدایت اور اصلاح کا روشن چراغ
ملک کے معنوی و دینی و اصلاحی رسالہ



تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

ممتاز مفکر و دانشور مشتاق احمد قریشی کی زیر ادارت

قیمت: 20 روپے

دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری

روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد



دنیا کے تمام مسالک متعلق
علماء کا ان نگارشات اور آراء پر مشتمل

ادب و تحقیق کا ایک جامع اور پرجوش پتھر

پاکستان 7 فروری

فون: 12

alislamkhi@gmail.com

لباس سے جتنی پر فہم کی بہترین مہک اٹھ رہی تھی اور اس خوشبو نے مجھ پر ایک عجیب غنودگی آمیز کیف دوسرے ساطاری کر دیا خود اس کی کیفیت بھی اسی قسم کی تھی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھال رکھا تھا اور میں کچھ بھر کے لیے بھی غافل نہیں ہوئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔

میں نے اپنے پورے جسم کا بوجھ اس کے اوپر ڈال دیا تھا وہ مزید بے خود ہونے لگا جذبات اور شراب کی سرخی اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگی وہ خواب ناک لہجے میں میرے سراپا کی تعریف کر رہا تھا اور میں بہکنے کی بہترین اداکاری کر رہی تھی۔

میں نے اپنا ہاتھ بہت غیر محسوس طریقے سے اپنی جگہ سے ہٹایا اور انتہائی مشاطی اور ہنرمندی کے ساتھ اس کی کوٹ کی اندرونی جیب کی جانب بڑھا دیا میں پہلے ہی تاثر چکی تھی کہ اس کا پرس کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا ہے۔ میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتی رہی پھر تیزی کے ساتھ میں نے اس کا پرس اپنے اسکرٹ کی جیب میں منتقل کر لیا اور اپنا ہاتھ دوبارہ اپنی جگہ پر واپس لے آئی۔

پھر میں نے تھک جانے کا اظہار کیا اور واپس اپنی میز تک جانے لگی میرے اچانک اس طرح چھوڑنے پر وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا پھر ایک اس نے دوبارہ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا اور مختصر لہجے میں بولا۔

”اتنی جلدی تھک گئیں جانے من! تھوڑی دیر تو اور پلینے!“

میں اپنا کام ہو جانے کے بعد وہاں سے فوراً کھسک جانا چاہتی تھی لیکن میری نگاہ دوتنی کے رخ کی اس بیوی پر پڑی جس کا ہیروں کا ٹیکس اڑانے کے لیے ہم آج یہاں اس پارٹی میں آئے تھے۔ وہ ایک

چالیس یا پچاس سال کی عورت تھی اور اپنے سے آدھی عمر کے جوان لڑکے کے ساتھ کھسک کر رہی تھی۔ میں دوبارہ خرم کے ساتھ کھسک کر رہی تھی۔ میری نگاہیں رخ کی بیوی پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک میں نے اپنا رخ تبدیل کیا اور کھسک کر تھوڑے ہونے بالکل اس کے قریب پہنچ گئی اور ایک چکر دے کر میں نے خرم کو اس عورت سے ٹکرایا۔

یہ تصادم چند لمحوں کا تھا اور اس کا ٹیکس میرے ہاتھ سے ہوتا ہوا سیدھا میرے اسکرٹ کی جیب میں منتقل ہو چکا تھا۔

خرم اس عورت سے معذرت کرنے لگا اس نے بھی بڑی خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ڈونٹ وری۔“ اور اپنے ہاتھ کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

اس عورت کو ابھی تک اپنے ٹیکس کی کشیدگی کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن اسے یہ احساس کسی بھی وقت ہو سکتا تھا تب کیا ہوتا؟ وہ شور مچا دیتی اور ہال میں ایک بھلکھڑیج جانی عین ممکن تھا کہ سکوری والے ہال کے دروازے بند کر دے اور تمام لوگوں کی تلاشی لینے تب وہ ٹیکس میرے قبضے سے ہٹا دے ہو سکتا تھا۔

اب میں بے دلی سے کھسک کر رہی تھی اور اس چپ سے پیچھا چھڑا کر جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی اس لیے میں نے ایک بار پھر اپنے چہرے پر ٹھنک کے آثار ظاہر کرنا شروع کر دیے، لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی آ کر سٹرا خاموش ہو گیا اور کھسک کر اور سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر واپس جانے لگے۔

میں نے کچھ زیادہ ہی تیزی دکھائی اور رضوان کے پاس پہنچ کر سرگوشی میں کہا۔

”رضوان نکل چلو۔ کام ہو گیا ہے۔“
”واقی۔“ رضوان کی آنکھوں میں خاصی چمک اُبھرائی۔
میں نے مڑ کر خرم کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس کے

ساتھ میرا وقت اچھا گزرا۔

”آئیے بیٹھتے ہیں اب کچھ کاروباری باتیں ہو جائیں، کچھ اپنے کاروبار کے بارے میں بتائیے۔“ اس نے بہت ہی معنی خیز لہجے میں کہا تو میں چونک گئی۔ اور میرے دل میں ایک شک سا اُبھرایا۔

اسے میں رضوان میرے پاس آیا اور بولا۔ ”میم ہمیں فوراً واپس چلنا ہے جاپان والا ڈیلی کیٹن ہول میں آپ کا وٹ کر رہا ہے۔“

”اوہ! میں تو بھول ہی گئی۔“ میں نے اپنے ہاتھ پر ہلکے سے ہاتھ مارا اور اس کو۔۔۔۔۔۔ پھر ملیں گے۔“ کا اوداعی قضائی یومہ اچھالتے ہوئے تیزی سے رضوان کے ساتھ ہال کے دروازے کی جانب لپکی میں نے تیز تیز چلتے ہوئے رضوان سے کہا۔

”ہمارا آج کا کام مکمل ہو گیا ہے اور قبل اس کے کہ ان لوگوں کو اپنی گمشدہ چیزوں کا احساس ہو سکے ہمیں یہاں سے فوراً نکل جانا چاہیے۔“

میں اور رضوان تیزی سے کارڈ بور سے گزر رہے تھے تب میں نے خرم کو وہاں کھڑے ہوئے پایا۔ جیسے وہ وہاں میرا ہی انتظار کر رہا ہو اسے وہاں دیکھ کر رضوان اور میں شپشگئے، لیکن میں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

”گڈ نائٹ مسٹر خرم۔۔۔ آپ کے ساتھ بہت ہی رولف وقت گزرا میں آپ سے دوبارہ یقین دلانا چاہوں گی ہم پھر ملیں گے اسی جگہ۔۔۔ اب میں چلتی ہوں۔“

”ضرور ملیں گے تم ضرور جاؤ لیکن جانے سے پہلے میرا ایک کام کرنی چاہو۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”کام۔۔۔؟“ میرے چہرے پر شک کا گہرا سایہ سا اُبھرا گیا۔ ”کون سا کام۔۔۔؟“

”مہربانی کر کے میرا پرس مجھے واپس کرتی جاؤ۔“ اس نے اپنا منہ میرے کان کے قریب

لاتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

”کیا۔۔۔؟! یہ جان کر کہ اسے اس بات کا علم ہے کہ میں نے اس کا پرس اڑایا ہے میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھنے لگی اور میں نے کانپتے ہوئے کیوں سے کہا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مسٹر خرم۔۔۔۔۔۔ یہ کس قسم کا مذاق ہے؟“

”اوں ہوں! میڈم روزی!“ اس نے بدستور سرگوشی میں کہا۔ ”یہ مذاق نہیں ہے۔ میں نے تو تم سے صرف اپنا پرس واپس مانگا ہے جو تم نے کھسک کے دوران بڑی مہارت اور ہوشیاری سے میرے کوٹ کی اندرونی جیب سے نکال لیا ہے۔“

رضوان جو اتنی دیر سے چپ چاپ ہماری گفتگو سن رہا تھا پہلی بار بولا۔

”مسٹر آپ میڈم روزی پر بہت ہی گھٹیا الزام لگا رہے ہیں۔“ خوف کی ہلکی سی لہر اس کی آنکھوں میں مجھے دکھائی دی۔

”نہیں دوست!“ خرم نے مسکراتے ہوئے رضوان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”میں تمہاری میڈم روزی کی مشاطی اور ہنرمندی کی داد دیتا ہوں اس مختصر عرصے میں اس نے دو کمالات دکھائے ہیں

ایک تو میرا پرس اڑایا ہے اور دوسرے اس عورت کے کھلے سے ہیروں کا ٹیکس پار کیا ہے تمہیں وہ ٹیکس مبارک ہو کیونکہ وہ تمہارا حق ہے تمہاری محنت ہے، لیکن میرا پرس مجھے واپس ملنا چاہیے۔

اپنوں پر ہاتھ صاف نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ مسکرا مسکرا کر بول رہا تھا اور ہمارا یہ حال کہ کون تو بدن میں اپنی ہمت ہم نکالیں جو کائے چپ چاپ کھڑے تھے کہ اس کی اس بات کے جواب میں اب کیا کہیں یا کریں۔

تب ہی چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”ہم

ایک ہی لائن کے آدمی ہیں۔“ اس نے ایک آنکھ دبا کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”اور ایک ہی لائن کے آدمی اپنے ہی آدمیوں پر ہاتھ صاف نہیں کرتے۔“

اتنی دیر میں رضوان اپنے آپ کو پوری طرح سے سنبھال چکا تھا اور اس نے بہتر بیبی سمجھا کہ اس کی جانب دوتی کا ہاتھ بڑھا دے اس لیے بولا۔

”آؤ باہر چلو..... جلدی کرو..... کم از کم یہاں سے تو نکلو کہیں باہر چل کر آرام سے بات کرتے ہیں۔“

ہم تینوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس ہوٹل سے باہر آ گئے۔ رضوان نے خرم سے کہا کہ فی الحال وہ اپنی کاروباریں چھوڑ دے اور ہمارے ساتھ چلے وہ فوراً راضی ہو گیا اور ہمارے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

راستے میں ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی پھر اس ہوٹل سے بہت دور ایک شاندار سے ریسٹورنٹ کے سامنے رضوان نے کار روک دی ہم لوگ اس ریسٹوران میں داخل ہوئے اور ایک پرائیویٹ کیمین میں داخل ہو گئے تاکہ یہاں بیٹھ کر ہم اطمینان سے بات چیت کر سکیں۔

وہاں بیٹھ کر میں نے سب سے پہلے خاموشی سے خرم کا پرس نکالا اور اس کی جانب بڑھا دیا۔

”نیکلس کی مالیت میں سے کتنا کمیشن چاہتے ہو؟“ رضوان نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سنجیدگی سے خرم سے پوچھا۔

”کمیشن.....!“ خرم نے حیرت سے کہا۔ ”وہ کس لیے؟ میرا کیا حق بنتا ہے؟“

”کوئی لائن کے آدمی ہو۔“ رضوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم نے روزی کو واردات کرتے ہوئے دیکھ لیا اور خاموش رہے تو آخر تمہارا کمیشن بھی تو بنتا ہے۔“

”نہیں دوست!“ خرم نے اتنا کہہ کر سوالیہ نگاہوں سے رضوان کو دیکھا۔

”رضوان!“ رضوان نے اس کی نگاہوں میں پھلتا ہوا سوال سمجھ کر پٹانا م بتایا۔

”ہاں تو بھی رضوان یہ محنت اور کامیابی تو روزی کی ہے اس کا حق بنتا ہے میں کوئی کمیشن نہیں لوں گا۔“

اور پھر ذرا سی دیر میں ہم تینوں میں خاصی دوستی ہو گئی اور پھر کچھ بتائے کا وعدہ کیے ہوئے ہم نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے بارے میں بتایا خرم نے بتایا کہ ان کا ایک باقاعدہ گروہ ہے جس کے اور بھی کئی دھندے ہیں۔ ہم نے بھی اپنے بارے میں یہی بتایا ہم نے ایک دوسرے سے ان کے دھندوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔

خرم نے صرف اتنا پوچھا کہ تمہارے گروہ کا پاس کوئی اور ہے یا تم باس ہو تو رضوان نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہماری پاس تو میڈم روزی ہیں۔ ہم تو ان کے معمولی کارندے ہیں۔“

خرم نے توصیفی نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور پھر چند لمحوں کے لیے کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔

”تمہارا گروہ میرے خیال میں بہت چھوٹا ہے جبکہ میرا تعلق ایک بہت بڑے گروہ سے ہے ہمارا پاس کوئی اور ہے فی الحال میں تمہیں اس کا نام نہیں بتا سکتا، لیکن تم لوگوں کو اپنے ساتھ مل کر کام کرنے کی پیشکش ضرور کر سکتا ہوں۔ ہمارا گروہ کافی پھیلا ہوا ہے اور ہمارے پاس کافی سوزر بھی ہیں میری یہ خلاصہ پیشکش ہے کھلے دل سے اس پر غور ضرور کرنا..... بلکہ روزی جیسی ماہر عورت تو ہمارے ساتھ کام کر کے کندن بن جائے گی اس کو تو بہت آگے تک جانا ہے میں تمہارے بارے میں بات کروں گا“

اس نے تم لوگ بھی اچھی طرح سے سوچ لو۔“

پھر ہم لوگوں نے ایک دوسرے کے متبادل فون

نمبروں کا تبادلہ کیا اور دوستانہ انداز میں ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔

شمر دم حیران ہو رہے ہو گئے کہ ہم نے اتنی جلدی ایک دوسرے پر اعتبار کیسے کر لیا تو ڈیز میں اپنے طویل تجربے سے ایک بات بخوبی جانتی ہوں اور وہ یہ کہ زیر زمین خفیہ دھندے کرنے والے لوگ عام طور پر دوستوں کے دوست ہوتے ہیں اور ان پر اعتبار کیا جاسکتا ہے اور یہ لوگ آپس میں بالعموم دغا بازی نہیں کرتے اور پولیس وغیرہ کی خبری تو بالکل بھی نہیں کرتے۔

اس رات میں دیر تک خرم اور اس کی پیشکش کے بارے میں غور کرتی رہی اور میرا دل بار بار مجھے اس بات پر اکسارتا تھا کہ مجھے یعنی میں اس کی پیشکش قبول کر لینی چاہیے۔ یہ بات بھی حقیقت پر مبنی کہ جیسا کہ خرم نے کہا تھا کہ ہمارا گروہ بہت چھوٹا ہے برائی کی اس راہ پر میں بہت آگے تک جانا چاہتی تھی اس لیے میں نے ایک فیصلہ کر لیا اور مطمئن ہو کر سو گئی۔

اور اسی مسئلے کو لے کر میرے اور رضوان کے درمیان بہت بحث و فکر ہوئی میری مرضی یہ تھی کہ ہمیں خرم کی اس پیشکش آفر سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے جبکہ اس کے برعکس رضوان اس بات کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بے شک ہمارا گروہ چھوٹا ہے ہمارا کام بھی محدود پیمانے پر ہوتا ہے اور پھر ہم کسی کے ماتحت بھی نہیں ہیں کوئی ہمارا پاس بن کر ہم پر حکم چلانے والا نہیں ہے ہم سب مل کر ایک دوسرے کے باہم مشورے اور رضامندی کے ساتھ کام کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ کسی کے حکم میں رہیں۔“

اس بات کی وجہ سے ہمارے اندر ایک کھچاؤ سا پیدا ہو گیا اس رات رضوان دیر سے گھر لوٹا اور کر

نئے سال کی آمد پر خدا کرے کہ نئے سال میں ہم سے وابستہ تمام چیزوں پر رنگ بہا رہا تھا۔ تمام آنکھوں میں خوش رنگ شاپتیں اتریں تمام منظر سبزہ زاروں میں محبتوں کی کھڑکی فصل اہلپاتی رہے تمام شہروں میں ہلچل مچ گئی تھی کہ چہروں کی لالی سدا بہا رہے۔ آمین (صدقہ ہاشمی..... ملتان)

چپ چاپ لیٹ گیا اس کے کمرے کی لائٹ بھی آف تھی میں جاگ رہی تھی پھر بھی رضوان نے مجھ سے بات نہیں کی۔ میرا دل دکھ گیا۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا کہ رضوان اب آئے گا اب آئے گا لیکن ایک گھنٹہ گزر گیا اور وہ نہیں آیا تب میں اپنے دل سے مجبور ہو کر دے پاؤں اس کے کمرے کی جانب بڑھی دیکھا تو کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے کی ہول سے جھانک کر دیکھا تو گھپ اندھیرے میں مجھے روشنی کی چنگاری سی دکھائی دی۔

رضوان جاگ رہا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ رضوان مجھ سے شدید ناراض ہے اس لیے وہ مجھ سے بات بھی نہیں کر رہا ہے اور فیصلہ کرنے کے باوجود وہ کمرے میں اندھیرا کئے تباہ لینا سگریٹیں پھونک رہا ہے میں نے کچھ دیر دک کر سوچا پھر بند دروازے پر دستک دے ڈالی۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا میں نے دوبارہ اور پھر بار بار دستک دی لیکن رضوان ہنوز خاموش تھا تب میں نے کہا۔

”میں جانتی ہوں رضوان کہ تم جاگ رہے ہو چلیز دروازہ کھولو مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ چلیز.....!“

”میں سو رہا ہوں مجھے ڈسٹرب مت کرو.....“ رضوان نے کہا۔

”تم بالکل بھی نہیں سو رہے..... دیکھو پلینز دروازہ کھولو.....“ میں نے لاجت بھرے لہجے میں کہا تو اس نے دروازہ کھول دیا اور میری جانب دیکھے بنا پلٹ کر دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

میں نے کمرے کی لائٹ آن نہیں کی لاؤنج کی لائٹ آن تھی اور وہاں سے ملکی ملکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں اس کے پاس بیڈ پر جا کر بیٹھ گئی اور کہا۔

”اگلی بھی مجھ سے کیا خطا ہوگی جو تم اتنے زیادہ ناراض ہو اور میرے ساتھ اس طرح سے پیش آ رہے ہو۔“

”میں نے کیا کیا ہے تمہارے ساتھ..... کچھ بھی تو نہیں! میں تمہارا لگتا ہی کیا ہوں..... تم آزاد اور خود مختار ہو اپنی مرضی کی مالک ہو..... جہاں جانا چاہو جا سکتی ہو جس کے ساتھ کام کرنا چاہو کر سکتی ہو..... تمہیں خرم پسند آ گیا ہے تو تم جاؤ..... اب میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا..... میں تمہیں ایک خواب سمجھ کر بھلا دوں گا.....“ وہ کہتا رہا اور میں چپ چاپ سنتی رہی جب اس نے آخری فقرہ کہہ کر کمرہ بدلی تو میرا بارہ ہائی ہو گیا اور میں بیڈ پر چڑھ گئی پھر اس کا بازو ہٹا کر اسے سیدھا کیا اور اس کے سینے پر مکوں کی بارش کرتے ہوئے کہا۔

”کیا کہا تم نے..... کہ تم مجھے ایک خواب سمجھ کر بھلا دو گے..... بس اتنی حیثیت تھی تمہاری نگاہ میں میری..... ہاں غلطی میری ہی تھی کہ میں نے ہی تمہیں دوسرے تمام مردوں سے مختلف سمجھا تھا۔“

”کیا کر رہی ہو..... اس طرح سینے پر زور زور سے مکے مارو گی تو میرا دل بند ہو جائے گا.....“

بھئی ایسا نہ کرو..... دل پر چوٹ پڑ رہی ہے۔“ وہ میرے ہاتھوں کو اپنے جگر کے ساتھ کر بیٹھ گیا۔

”اور جو چوٹ تم نے میرے دل پر ماری ہے اس

کے بارے میں کیا خیال ہے تم نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ میں تمہیں چھوڑ کر اس خرم کے ساتھ چل جاؤں گی۔ تم ہی تو وہ انسان ہو میرے محسن ہو جس نے میری زندگی بچائی ہے اگر اس رات تم مجھے نہ ملنے اور اپنے ساتھ اپنے گھر لا کر پناہ نہ دیتے تو میں یہ سوچ کر کانپ جاتی ہوں کہ آج میرا انجام کیا ہوتا۔ کل وہ ایک مجھے اس بات کی عقل نہیں تھی لیکن آج سمجھتی ہوں اور یہ عقل دگر بھی تو تم نے مجھے سکھائی ہے میرے ہاتھ میں ہنر دیا میں ایک دیوی لڑکی تھی تم نے مجھے زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا سلیقہ سکھایا میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتی ہوں تم نے مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی میں تو صرف اس لیے خرم کے ساتھ شامل ہونا چاہ رہی تھی کہ اس کا پاس کوئی بہت بڑا آدمی ہے اس کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ سنا ہے حکومت میں بھی اس کے بندے شامل ہیں۔ اس کا تعلق سیاست سے بھی ہے..... اور میرا سب سے بڑا دشمن.....“ میں نام لیتے لیتے ایک دم رک گئی۔

”ہاں ہاں بولو..... تمہارا سب سے بڑا دشمن کون ہے اب تو اس کا نام بتاؤ.....“ انتظار عرصہ گزر گیا ہمیں ساتھ کام کرتے ہوئے اور تم نے مجھے اس کا نام نہیں بتایا اور جب تم بتاؤ گی نہیں تو میں تمہارا مسئلہ سمجھوں گا کیسے.....“ رضوان نے بے تابی سے پوچھا تو میں ایک گہری سانس لے کر رو گئی اور سوچا کہ اب تو رضوان کو بتانا ہی ہوگا اور میرے خیال میں اب بتا دینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے اس لیے میں نے کہا۔

”میرا سب سے بڑا دشمن نواب سلطوت ہے عام لوگوں کے لیے پیر سائیں روحانی پیشوا عبادہ نشین شاداب پور کا مالک کہتے ہی سیاسی جماعتوں کے لیڈران اپنی جماعت میں شامل کرنے لگے ایک لکھ اس کی خوشامد کرتے ہیں۔ (یہ

ساری معلومات میں نے نواب کے بارے میں ان تین سالوں میں اکٹھی کی تھیں)

”کیا.....؟“ رضوان کے منہ سے حیرت سے نکلا۔ ”نواب سلطوت ارے باپ ارے باپ..... میں بھی اس کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ایک بہت بڑا ویر ہے لیکن وہ اتنا بدمعاش ہے کہ مجھے نہیں معلوم تھا ساتھ ہی رضوان نے نواب کو ایک خوش خطاب دے ڈالا۔

”تو اس سے ٹکر لینے کے لیے تو مجھے کسی بڑے کا سہارا ہی چاہیے ناں..... بات صرف اتنی ہی تھی اور تم نہ جانے کیا مجھ بیٹھے مجھے خرم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اس کے بڑے گروہ کی بڑی طاقت سے ہے۔“ میں نے کہا تو رضوان نے سواری کہتے ہوئے ہمیشہ کی طرح مجھے اپنے گلے سے لگالیا..... اور ہمارے دل صاف ہو گئے اور اس وقت میرے سواکل فون کی بیل بہت دھیمی دھیمی مجھے سنائی دی میرا فون میرے کمرے میں تھا میں نے جا کر فون اٹھا کر نمبر دیکھا تو خرم کی کال آرہی تھی۔ میں نے رضوان کو آ کر بتایا کہ خرم کی کال آرہی ہے کیا کروں؟

”ریسیو کر لو اور کیا کر دو گی.....!“ رضوان نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے ریسیو کر لیا دبا کر فون کان سے لگایا تو وہ بولا۔

”آئی ایم سو ری! شاید تم سو رہی تھیں۔ چلو سو جاؤ پھر بات کر س گے.....!“

”ارے نہیں نہیں میں تو جاگ رہی تھی فون دراصل دوسرے کمرے میں تھا ہاں بولو کیا بات ہے.....؟“ میں نے جلدی سے کہا۔

”میرے پاس اس وقت ٹائم تھا تو سوچا کہ تم لوگوں سے ملاقات کروں۔ میں نے ہاس سے تم لوگوں کے متعلق بات کی ہے میں نے اس تم لوگوں

کے لیے بہت اچھی آفر ہے۔ میرے خیال میں سن لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

خرم نے کہا تو میں نے اسے ایک منٹ توقف کرنے کے لیے کہا اور رضوان کو ساری بات بتا کر پوچھا کہ کیا جواب دوں تو رضوان نے کہہ دیا اسے بلاؤ۔

رضوان کے رومے میں اتنی بڑی تبدیلی دیکھ کر میں خوشی سے جھوم اٹھی اور خرم سے کہا کہ وہ آ جائے ہم اس کا انتظار کر رہے ہیں۔

”میں منٹ کے بعد خرم ہمارے فلیٹ پر موجود تھا اور اچھر کی ایک دو باتیں کرنے کے بعد وہ اصل موضوع پر آ گیا اور پھر۔

وہ بول رہا تھا اور میں اور خرم آنکھیں میاڑے سن رہے تھے..... ہم دل ہی دل میں قائل ہو چکے تھے کہ ہم اور ہمارا گروہ خرم کے گروہ کے آگے چہ پدی چہ پدی کا شور بے والا حال ہے۔

اس کے ساتھ ہی خرم نے ایک ایسا نام لیا..... جسے سنتے ہی میرے اور رضوان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

”ہم تمہارے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہیں.....!“

(باقی آئندہ ماہ)



انتہا قیامت

محترم مدبر اعلیٰ نے اللہ
تعالیٰ سے دعا کی کہ

یہ کہانی ہماری دیگر کہانیوں سے قدرے مختلف نظر آئے گی لیکن یہ اس
سلسلے کی کہانی ہے کہ کہانی کے حیران کن اور دلچسپ پہلو ہمارے
ایک نوجوان نے ہوائی تھمے۔ جب میں نے اسے قلم کار کے ہونے کی بات کہی تو مجھے
مجھے لگا کہ وہ غلط کھا کر ہے۔ پتا چلتا ہے کہ وہ غلط ہے۔ اس کے انچارج
ہے بہت کم عمر کے اس کا اندازہ کرنا جو کہانی کے صورت میں آج کے سامنے
ہے۔ اس کہانی میں ہم کو جاگہ بہ جاگہ معاشرے کا ایک خوبہ نظر آئے گا۔

والسلام
خلیل جبار
محرر اہل

مجھے شروع ہی سے اپنے ساتھیوں میں نمایاں
ہونے کا شوق تھا۔ اسکول میں بھی میری کوشش ہوتی
تھی ماسٹر صاحب جو سبق دیتے ہیں اس سے آگے
سبق پڑھ کر سناؤں۔ استاد جب بھی دیے ہوئے
سبق سے آگے پڑھنے پر مجھے شاباش دیتا اس وقت
میرا سیروں خون بڑھ جاتا اور میں احساس برتری
سے اپنے دوستوں کی طرف دیکھتا۔ میرا انہیں دیکھنے
کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ ”ہے کوئی اور جو مجھ سے زیادہ
سبق پڑھ سکے۔“
میری بڑی خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر ڈاکٹر
ہوں جب میں اپنی بڑی سی کار میں گاؤں آؤں
لوگ مجھے دیکھیں۔ ہم گاؤں کے لوگوں کو ایک
دوسرے پر رعب جمانے کے لیے بڑی قربانی دینی
پڑتی ہے جھوٹی تعریف کرانے کے لیے پیسہ پانی کی
طرح بہاتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ہمارے
علاقے میں ایک لڑکا اشرف رہتا تھا۔ وہ اپنے نام
سے زیادہ اپنی عرفیت ٹیٹو کے نام سے مشہور تھا۔
گاؤں میں پیلے ویلے اور لمبے لڑکے کو ٹیٹو کہا جاتا
ہے۔ اس کو ایک بار کسی اخبار میں چراسی کی نوکری
مل گئی۔ تنخواہ ملنے پر جب گاؤں آیا۔ وہ بس میں
سوار ہو کر شہر سے آیا تھا لیکن گاؤں کے لوگوں پر

ایک روز میں نہر کے کنارے درخت کے نیچے
بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ایک چھوٹا سا پتھر کتاب پر
آ کر لگا۔ کتاب چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ میں
کتاب ہاتھ سے چھوٹ جانے پر گھبرا کر ادھر ادھر
دیکھنے لگا کہ یہ کسی کی شرارت ہے لیکن یہاں دور دور
تک کوئی نہیں تھا۔ میں ابھی حیران و پریشانی کے
عالم میں غم صم تھا کہ نہر سے پانی فضا میں بلند ہوا اور
پانی کے چھینے میرے بدن پر آ کر گر گئے۔ ایسا محسوس
ہوا کہ جیسے پانی میں کسی نے پتھر پھینکا ہے جس کی
وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ویران
جگہ پر آسب ہوتا ہے یہ خیال آتے ہی میں نے
دوڑ لگا دی۔ کتابیں بھی اٹھانے کی زحمت نہ کی۔
میں خوفزدہ حالت میں دوڑتا ہوا گھر کو جا رہا تھا کہ
میری نگر ذوالفقار سے ہو گئی میں گرتے گرتے بچا۔
”آہستہ آہستہ نعمان“ کیا بات ہے اتنے
گھبرائے اور پوچھائے ہوئے کیوں ہو؟“ اس نے
پوچھا۔

میں نے اپنی بے ترتیب سانسوں کو درست کیا
اور اپنے خوف پر قابو پانے کی کوشش کی۔
”کچھ نہیں کچھ بھی تو نہیں ہے۔“ میں نے
بات بنائی۔
میں ذوالفقار کو یہ واقعہ بتانا نہیں چاہتا تھا ورنہ وہ
میرے دوستوں کو میری بزدلی کا واقعہ بڑھا چڑھا کر
پیش کرتا۔
”پھر تیری یہ سانس کیوں پھولی ہوئی ہیں
جہر سے یہ خوف کیسا ہے؟“ اس نے مسکراتے
ہوئے مجھے دیکھا۔
”میں دراصل گھر جانا چاہ رہا تھا اس لیے بھاگ
رہا تھا انسان جب بھاگتا ہے سانس پھول ہی جاتی
ہے۔“ میں نے بات بنائی۔
”کسی بھی کیا جلدی ہے آدھری کی محفل لگی

ہوئی ہے تم بھی اس محفل میں شامل ہو جاؤ۔“ اس
نے ہول کے اندر کی طرف اشارہ کیا۔
ہول میں واقعی میرے کئی دوست عبدالجید، نصیر
الدین اسحاق، فوجی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ
ذوالفقار کا مجھے اس وقت روکنے کا مقصد یہی ہے کہ
مجھ سے اصل واقعہ اگلوں اور میرا مذاق بنا سکے۔
میں بھی اس معاملے میں پکا تھا اس کو کوئی بات بتانے
کو تیار نہ تھا۔ ان کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر گھر آ گیا۔
سارے راستے میں یہی سوچتا ہوا آیا تھا کہ جب
ماں مجھ سے کتابوں کے بارے میں پوچھیں گی تو
انہیں کیا جواب دوں گا لیکن میری کچھ سمجھ میں نہیں
داخل ہو گیا کہ انہیں صاف صاف بتا دوں گا کہ آج
میرے ساتھ کیا واقعہ ہوا ہے۔ جیسے ہی گھر میں داخل
ہوا ہے اختیار میری نظریں ان کتابوں پر پڑی جو
میں نہر کے کنارے چھوڑ آیا تھا۔
”یہ۔۔۔۔۔ یہ کتابیں کیسے آئیں۔“ میں نے ماں
سے پوچھا۔
”جس نے تمہیں ڈرایا ہے اس نے ہی یہ
کتابیں پہنچائی ہیں۔“ ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔
”ای آپ اسے جانتی ہیں جس نے مجھے ڈرایا
ہے۔“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔
”بھولے تم ایسے کہہ رہے ہو کہ جیسے تم جانتے
نہیں۔“ ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
”آپ یقین کریں میں اسے نہیں جانتا۔“
میں نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔
”اچھا ٹھیک ہے آئندہ اس سے ڈر کر مت
بھاگنا بلکہ تم اس کو روادینا۔“ ماں نے ہنستے ہوئے
کہا۔
ماں بتانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس لیے میں
خاموش رہ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دوسرے دن اس

درخت کے کنارے نہیں جاؤں گا لیکن اب کتابیں گھر آنے اور ماں کے ہنسنے پر میرا حوصلہ بلند ہو گیا تھا اور میں نے وہاں جا کر نہ ڈرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

دوسرے دن مجھے پڑھتے ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ نہر میں زور سے ایک پتھر آ کر گر کر پتھر کے نہرے میں گرنے سے پانی کے جھینٹے اچھل کر باہر کو آئے لیکن میں بے فکر ہو کر خاموشی سے کتاب پڑھتا رہا۔ میرے سر اٹھا کر نہ دیکھنے پر ایک پتھر میری کتاب پر آ کر گر کر کتاب چھوٹ کر زمین پر گر پڑی۔ میں نے دوبارہ کتاب ہاتھوں میں لے کر پڑھنا شروع کر دی۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ کل میں اس سے پریشان تھا اور آج یہ جو بھی ہے پریشان ہو رہا ہوگا کہ میں گھبرا کیوں نہیں رہا۔

اچانک کسی خاتون کی پائل کی جھکا سنائی دی ایک لمحے کو دل میں خوف سا آیا کہیں کوئی چڑیل نہ آگئی ہو لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا اور ہمت کر کے ڈرتے ڈرتے آواز کی سمت میں درخت پر دیکھا کہ خاتون نے خود کو درخت کے پتوں میں چھپایا ہوا تھا۔ صرف اس کے پاؤں ہی نظر آ رہے تھے۔ میں ڈرتے ڈرتے درخت پر چڑھنے لگا مجھے درخت پر چڑھتا دیکھ کر اس خاتون نے نیچے کھیت میں جھلانگ لگا دی۔ اس کی قسمت اچھی تھی کھیت میں گھاس پھوس کے ڈھیر بڑے ہونے کی وجہ سے اس کو چوٹ نہیں آئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے وہ اٹھ کر وہاں سے فرار ہوئی میں بھی کھیت میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ وہ جیسے ہی کھیت میں اٹھ کر کھڑی ہوئی میں اس سے زور سے نکل آیا اور وہ چاروں شانوں جیت دوبارہ کھیت میں گر پڑی اور میں جان بوجھ کر اس کے اوپر گر پڑا۔ اس لیے وہ میرے جسم کے نیچے دبی تھی۔ اس نے گھاس کے ڈھیر پر پڑے پڑے

اپنے چہرہ گھما کر مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ میری ہنسی چھوٹ گئی۔

”فاطمہ کی بچی یہ تم ہو جو مجھے ڈرانا چاہتی تھی۔“ میں نے کہا۔

”بھئی بات یہ ہے کہ میں فاطمہ ہوں فاطمہ کی بچی نہیں دوسری بات یہ کہ تم میرے اوپر سے ہٹ جاؤ مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔“ فاطمہ نے کہا۔

”بھئی بات یہ کہ تم نے کل مجھے ڈرایا کیوں دوسری بات یہ کہ تمہاری سزا ہے کہ تمہیں روزانہ مجھ سے ملاقات کرنا پڑے گی۔ اس شرط پر ہی تمہیں آزادی مل سکتی ہے۔ ورنہ میں تم کو اپنی ہاتھوں کی قید سے آزاد نہیں کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”زبردستی ہے۔“ فاطمہ نے کہا۔

”ہاں زبردستی ہے اب بولو۔“ میں نے اپنے گال اس کے گالوں سے مس کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا میں غور کروں گی۔“ فاطمہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”غور نہیں مجھے ہاں میں جواب دو۔“ میں نے کہا۔

فاطمہ ہمارے گاؤں کے کریم جی کی لڑکی تھی دوسرے نوجوانوں کی طرح میں بھی اس کے حسن پر مہمڑا تھا۔ لیکن ابھی اظہار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ بس دیکھنے کی حد تک ہی محدود رہا۔ آج اس نے خود ہی قربت حاصل کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا میری کوشش بھی کم زیادہ دیر تک میں اس کے جسم سے لپٹا رہوں۔ اس کی سانسوں سے مہکتی خوشبو کو دماغ بسا رہا ہوں وہ بھی چالاک تھی اس لیے میری چالاک کو بھانپ گئی اور موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کہ کہیں میں آخری حد کو عبور نہ کر جاؤں روز ملنے کا وعدہ کر لیا۔ میرے پاس اب اسے آزاد کر دینے کا کوئی چارہ نہیں تھا۔ فاطمہ کے قاصد پر جا

کردہ زور سے چنکی۔

”نہیں آؤں گی نہیں جو کرنا ہے کر لو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں اس کی چالاک کی پر حیران رہ گیا ابھی سے اس کو بھاگ کر پکڑنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے دور سے دینو چاچا آتا دکھائی دیا اس کو دیکھ کر میں رک گیا اور سبھل کر کتابیں ہاتھ میں لے کر ایسے بیٹھ گیا جیسے میں بہت دیر سے پڑھنے میں غرق ہوں۔

آج کی فاطمہ سے ملاقات نے میری چھپی ہوئی محبت کو جگا دیا تھا۔ فاطمہ گھر کے پالتو جانوروں کے لیے چارہ لینے کو آئی تھی اور اس سے اس طرح میری ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ دو مجھے بہت چاہتی تھی لیکن میری طرح اظہار نہ کر سکتی تھی۔ صرف دیکھنے تک یہ سلسلہ جاری تھا۔ اس نے مجھے اپنی طرف راغب کرنے کو یہ شرارت کی تھی اور اس کی یہ شرارت کامیاب ہوئی اور میں اس میں بھرپور طریقے سے دلچسپی لینے لگا تھا۔

میں نے اکثر بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا۔ میرا ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کو میڈیکل میں آسانی سے انڈمیشن ہو سکتا تھا۔ میں نے جب یہ خوشخبری فاطمہ کو سنائی وہ بھی خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ ہم دونوں کے خواب جدا نہیں تھے۔ اس لیے ہم دونوں ہی اس کا سامانی پر خوش تھے۔ لیکن قسمت کچھ اور ہی ہمارے ساتھ ٹھیل چیلنے والی تھی۔

ڈیڑہ رجم ڈنو کے بیٹے کریم ڈنو سے میری دوستی ہونے کے سبب میں ڈیڑہ کے اوطاق میں جاتا رہتا تھا۔ ایک دن گاؤں کی اوطاق میں ڈیڑہ کے پاس ایک چوری کے مقدمے کا فیصلہ آیا تھا۔ چوری کا الزام اس کے اپنے باری پر آ رہا تھا لیکن ڈیڑہ رجم ڈنو اپنے بھائی کو بچانے کی خاطر چوری کا الزام

غریب فقیر محمد پر ڈال دینا چاہتا تھا۔ وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ اس نے چوری نہیں کی جس وقت فقیر محمد عبدالسلام کے ہونٹ پر بیٹھا ہوا تھا اس دوران وہ چوری ہوئی تھی۔ یہ حقیقت بھی تھی کہ واقعی اس دن ہونٹ پر فقیر محمد اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا میں نے خود اس کو دیکھا تھا۔ اس دن میری پسندیدہ فلم چل رہی تھی اور فقیر محمد میری براہ روائی کر رہے تھے۔ وہ اچھا۔ دو دفعہ اس نے اسحاق سے سگریٹ جلائے کو چاچا بھی مانگی تھی۔ جب مجھ سے نہ رہا گیا تو بول اٹھا۔

”سامیں فقیر محمد سچ کہتا ہے جس وقت چوری ہوئی اس وقت یہ ہمارے ساتھ ہونٹ میں بیٹھا ہوا تھا یہ بالکل بے قصور ہے۔“

میرا بولنا شاید ڈیڑہ کو بہت برا لگا تھا۔ اسی لیے اس کا غصے سے چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے مقدمے کی کارروائی اگلے روز تک ملتوی کر دی۔ جب لوگ اوطاق سے اٹھ کر چلے گئے۔ ڈیڑہ نے مجھے اپنے پاس بلایا اور غصے سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھے کس نے کہا تھا کہ اس فیصلے میں ٹانگ اڑانے کو۔“

”سامیں یہ حقیقت ہے فقیر محمد واقعی ہمارے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور میرے نہ بولنے سے اس پر چوری کا الزام لگ جاتا۔“ میں نے بڑے ادب سے ڈیڑہ سے کہا۔

”آج جو بھی ہوا ہے وہ اچھا نہیں ہوا جاؤ تم بھی گھر جاؤ۔“ ڈیڑہ نے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے گھر چلا آیا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ ڈیڑہ کو میری کون سی بات بری لگ رہی ہے جو وہ ناراض ہو گیا ہے۔ حالانکہ میں چنے جو بھی بات کی تھی سچ پر مبنی تھی۔ میں نے

جب ابابکر اور واقعہ سنایا اس نے اپنا سر تھام لیا۔
 ”اس دن کے لیے میں تم کو ڈیرے کے بیٹے
 سے دوستی کرنے کو منع کرتا تھا۔ تم نے سچ بول کر
 خواجہ اور دشمنی مول لے لی۔“ ابانے کہا۔
 ”لیکن میں نے جو کچھ بھی بولا وہ حقیقت
 ہے۔“

”تمہارے سچ سے ڈیرے کی توہین ہوگئی ہے
 وہ کسی صورت یہ برداشت نہیں کرے گا اس کے
 باری پر چوری کا الزام لگے۔“

”اس کے باری نے چوری کی ہے پھر وہ اس کو
 کیوں بچانا چاہتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ بات تمہاری ابھی سمجھ میں نہیں آئے گی تم
 ابھی نا سمجھ ہو۔ جس باری کو تم چور کہہ رہے ہو اس
 کے گھر کی ساری خواتین وڈیرے کی خدمت پر
 مامور ہیں۔ وہ ان خواتین سے ہر طرح کی خدمت
 لیتا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ وہ باری
 وڈیرے کا کتنا چہیتا ہے تم دیکھ لینا کل جس نے بھی
 باری پر چوری کا الزام لگایا ہے وہ خود ہاتھ جوڑ کر اپنا
 مقدمہ وڈیرے کی اوطاق سے ماصرف واپس لے گا
 بلکہ معافیوں بھی مانگے گا۔“ ابانے کہا۔

دوسرے دن میں وڈیرے کی اوطاق پر نہیں گیا
 لیکن تیسرے دن جب اپنے دوستوں کے ساتھ
 ہونے پر خوش گلیوں میں مصروف تھا۔ مجھے وڈیرے
 کی اوطاق کے فیصلے کی اطلاع مل گئی۔ چوری کا
 الزام لگانے والے رحمت علی نے مقدمہ ماصرف
 واپس لے لیا تھا بلکہ باری پر چوری کا الزام لگانے پر
 معافی بھی مانگ رہی تھی۔ رحمت علی کیوں نہ معافی مانگتا
 رات کی تاریکی میں وڈیرے نے اپنے آدمیوں
 سے اس کی جوان بیٹی نوشین کو اغوا کر لیا تھا اور کہیں
 چھپا دیا تھا رحمت علی مقدمہ واپس لینے اور معافی
 مانگنے پر مجبور تھا۔ معافی مانگنا اور بڑی منت سماجت

کرنے پر وڈیرے نے اس کی جوان بیٹی رحمت علی
 کے حوالے کی۔ یہ بھی وڈیرے کا اس پر احسان تھا
 کہ اس نے اس کی بیٹی سے حوالے میں چند ماہ کے
 لیے خدمات نہیں لی تھیں۔ ورنہ ایسے مقدمات میں
 لڑکی کو وڈیرے کے گھر میں 6 ماہ تک بلا معاوضہ
 خدمات ادا کرنی پڑی تھیں۔

چند روز گزرنے پر میں اس واقعے کو بھول گیا۔
 میڈیکل میں میرا ایڈمیشن ہو جانے پر میں خوش خوش
 شام گئے شہر سے گھروں پہنچا تھا۔ ایڈمیشن ہو جانے پر
 امی اور بابا بہت خوش تھے۔ ان کی بھی بڑی خواہش تھی
 کہ میں ڈاکٹر بن کر غریب عوام کی خدمت کروں۔

رات جب میں سونے کو چار پانی پر لینا اچانک زور
 زور سے دروازہ بجایا جانے لگا۔ دروازہ کھلنے پر
 پولیس تیزی سے گھر میں داخل ہوئی اور پولیس انسپکٹر
 نے مجھے گریبان سے پکڑ کر چار پانی سے اٹھالیا۔
 میں اس کی اس حرکت پر ہلکا سا راہ گیا۔

”انسپکٹر صاحب یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“
 میرے بازو سے پیچھے۔

”چھوڑو میرے بیٹے کو۔“ ماں نے مجھے انسپکٹر
 سے چھڑانے کی کوشش کی۔

”ہٹ پرے بڑھیا۔“ انسپکٹر نے میری والدہ کو
 زور سے دھکا دیا۔

”میرا کیا قصور ہے جو تم مجھے اس طرح پکڑ رہے
 ہو۔“ میں اپنی والدہ کی بے عزتی برداشت نہ کر سکا
 اور زور سے چیخا۔

میرے اس طرح چیخنے پر انسپکٹر نے زوردار چھپر
 گال پر رسید کیا۔

”انسان کی قیمتی جان لیتے ہو پھر پوچھتے ہو میرا
 قصور کیا ہے۔“

”میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ آپ لوگوں کو ضرور
 کوئی غلطی ہوئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تجھے تھانے میں جب چھتر لگیں گے نا پھر
 تیری عقل ٹھکانے آئے گی ابھی گھر والوں کے
 سامنے بڑا مصہوم بن رہا ہے۔ بول فوج نے تیرا کیا
 بگاڑا تھا جو تو نے اس کو زخمی کیا بول۔“ انسپکٹر نے
 میری کمر پر زور وار پھینکا۔

”کیا ہوا ہے فوج کو؟“ میں نے اپنی تکلیف کو
 برداشت کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس کے بیٹا ہوا ہے نا لائق کہیں کا ایک تو اس کو
 بری طرح زخمی کر دیا ہے پھر مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ
 کیا ہوا اس کو۔“ انسپکٹر نے میرے ہاتھوں میں زنجیر
 پہنا کر گھینٹا اور موہاں میں ڈال دیا۔

میرے ابابورانی چیختے چلاتے رہ گئے۔

فوج کو نا معلوم افراد نے رات کی تاریکی میں
 کباڑی مار کر زخمی کر دیا تھا لیکن خود غائب ہو گئے
 تھے۔ انہوں نے چہروں پر نقاب لگائے ہوئے
 تھے۔ وڈیرے نے ایف آئی آر میں چار نامعلوم
 اور پانچویں نمبر پر میرا نام ڈلوادیا تھا۔ اس طرح میں
 وڈیرے کے انتقام کے بھجائے ہوئے جال میں
 بری طرح پھنس کر رہ گیا تھا۔ میں قیدی پرندے کی
 طرح پھڑ پھڑاتا رہا لیکن قید سے رہائی نہیں پاسکتا
 تھا جس طرح ایف آئی آر میں میرا نام فٹ کیا گیا
 تھا اسی طرح جھوٹے گواہان بھی پیدا کر لیے گئے
 تھے۔ گواہوں کے بیانات کی روشنی میں مجھے اقامت
 نامہ کے مقدمے میں سات سال قید اور 50 ہزار
 روپے جرمانے کی سزا سنائی گئی میرا سنہری کیرئیر
 شروع ہونے سے پہلے ہی تباہ ہو گیا تھا۔ میں نے
 سنا تھا لوگوں کے مقدمات سالوں چلتے ہیں پھر
 انہیں قید اور جرمانے کی سزا ملتی ہے لیکن پولیس کی
 کارروائی مکمل ہونے کے فوراً بعد مجھے نین ماہ کے
 اندر قیام سزا ہوگئی تھی۔

میرے والدین کو میرے کیرئیر کے تباہ ہونے کا

بڑا دکھ تھا لیکن وہ میرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکے۔
 میری والدہ نے سن رکھا تھا کہ پرندوں کو دانہ پانی
 ڈالنے سے اللہ خوش ہوتا ہے اور انسان کی آزمائش کو
 ختم کر دیتا ہے اس لیے میری والدہ نے کڑے وقت
 میں پرندوں کو دانہ پانی ڈالنا شروع کر دیا کسی چڑی
 مار کو پرندوں کو قید کرتا دیکھ کر وہ بیسے دے کر انہیں
 آزاد کرادی تھی۔ ان کے اس عمل سے اللہ راضی
 ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فوج کو زخمی کرنے والے
 ملزمان ایک واردات کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں
 پکڑے گئے۔ دوران تفتیش انہوں نے یہ بات اگل
 دی کہ اس سے پہلے بھی وہ ایسی وارداتیں کرتے
 رہے ہیں اور فوج کو بھی انہوں نے زخمی کیا تھا۔ بیسے
 چھیننے پر اس نے مزاحمت کی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم
 ہوا کہ اس دوران وڈیرے کو فوج کا ایک ہوا اور وہ
 شہر کے اسپتال میں ایڈمٹ ہو گیا تھا۔ اس کو ان
 ملزمان کی گرفتاری اور عدالت میں پیش کیے جانے
 کی اطلاع مل سکی اور دل بھی جاتی تو وہ اس پوزیشن
 میں نہیں تھا کہ کوئی ہدایت دے سکے۔ ملزمان نے
 مجھے اپنا سا بھی ماننے اور واردات میں ملوث ہونے
 کے خلاف گواہی دے کر آزادی کا پروانہ دلا دیا تھا۔
 اب میں آزاد تھا میری والدہ کے ایک چھوٹے سے
 عمل سے میرا شاندار مستقبل بھی تاریک ہونے
 سے بچ گیا تھا۔ وڈیرہ اسپتال سے صحت یاب ہو کر
 آ گیا ہے۔ اس کی حالت ایسی ہوگئی ہے جیسے وہ کوئی
 مجنوں یا دیوانہ ہو۔ وہ خود ہی خود ہنستا ہنستا ہے اور
 اعمالوں کی سزا دنیا میں ہی دے دی ہے۔

انسانی فرض

محققہ عمران احمد
مدیر ذلے افق سماجی
الذیلا علیکم

خاتون جسد میں کیا تھوڑا اور وجود مغربہ ہو یا مشرق ہر جگہ اور ہر معاشرہ میں پایا جاتا ہے۔ جو یہیں ہر جگہ کو انصاف فراہم کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کو ہماری شان سلطنتہ خاکوں پہونڈ دیوگہ اور مغربہ میں رازن ہڈ کھا جاتا ہے ایسے لوگ ہر دور میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ کہانت بھی اپنے اپنے وقت انصاف میں ہے۔ امید ہے کہ یہاں پر پورا اثر ہوگا۔

والذیلا
محاذہ حسین حاجد
ہور کوٹہ

معدوف فوج داری وکیل رانا گلزار نے ناشتے کے دوران اخبار کے پہلے صفحے پر نظر دوڑاتے ہوئے اُسوں سے چیخ... چیخ کی آوازیں نکالیں اور سر اوپر کیے بغیر مزید کافی لینے کے لیے اپنا خالی کپ ملازمہ کی طرف بڑھایا۔ ملازمہ ناہید نے پاس آ کر اس کے کپ میں کافی انڈلی۔ اس دوران اس کی نظر اخبار کی ایک شہ سرخی پر پڑ گئی اور اسے گویا اپنا مکمل مباحثہ ایک بار پھر شروع کرنے کا بہانہ مل گیا۔

”یہ سرخی دیکھی آپ نے جناب!“ اس نے ہاتھ آگے کر کے اس نمائیں سرخی پر اپنی خوب صورت خنجر طی انگلی رکھی۔ رانا گلزار نے وہ سرخی پڑھی۔

”یہ اسرار خدا ترس علی ایک بار پھر حرکت میں آ گیا۔“

ناہید اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”اس خبر میں بتایا گیا ہے تاکہ اس نامعلوم شخص نے ایک بار پھر پانچ خیراتی اداروں کو کئی آرڈر کے ذریعے دس دس لاکھ روپے دیئے ہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ رانا گلزار کی طرف دیکھ کر شفقانہ انداز میں مسکرائی۔

”دیکھا جناب! میں ٹھیک کہتی ہوں کہ اس دنیا میں اچھے لوگ تعداد میں زیادہ ہیں۔ نیکی پی پی پر غالب

ہے۔“ وہ خاموش ہوئی تو رانا گلزار نے بد مزگی کی حالت میں تیزی سے وہ خبر پڑھی۔ تاہم اس کی بوسن کی وجہ ملازمہ ناہید کی بحث اور دلائل نہیں تھے جسے وہ اکثر سمجھایا کرتا تھا کہ نیکی اور بدی اس دنیا کے ترازو کے دو پلڑے ہیں اور اکثر اس کے نیچے میں توازن قائم رہتا ہے۔ یوں دنیاوی نظام چلتا ہے دونوں طاقتیں لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں ہی اس دنیا کا حصہ ہیں۔ یوں شاید رانا گلزار اپنے پیشے کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا کیوں کہ وہ ایسے ملزموں کے وکیل صفائی کی حیثیت سے مقدمات لڑنے میں خصوصی شہرت رکھتا تھا جن کے بارے میں قوی تاثر پایا جاتا تھا کہ وہ واقعی مجرم ہیں اور انہیں ضرور سزا ہو جائے گی لیکن رانا گلزار انہیں صاف بیچتا تھا۔ وہ کافی کا کپ میز پر رکھتے ہوئے ناہید سے مخاطب ہوا۔

”تھیں کبھی یہ خیال آیا کہ یہ اسرار خدا ترس اور نئی انسان جس کی نیکی اور دیادگی کی تم اتنی معترف با حقیقت میں شاید کچھ اور مقاصد رکھتا ہو؟ اس کی فرمائے دلانہ خیرات کا مقصد شخص غریبوں کی مدد کرنا نہ ہو؟“

”کچھ اور مقاصد...؟“ ناہید نے حیرت سے دہرایا۔ ”یوں رقم خرچ کرنے کے لیے تو مقاصد بھلا

ہو سکتے ہیں؟“

”شاید اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ ہو شاید کوئی احساس جرم ہو جو اسے یوں برم لٹانے پر مجبور کرتا ہو۔“ گلزار نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ ”شاید یوں وہ اصل میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہو۔“

”آپ متنی انداز میں ہی کیوں سوچتے ہیں؟“ ناہید نے ترحم آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ کوئی نیک انسان بھی تو ہو سکتا ہے جو واقعی خلوص دل سے غریبوں کی مدد کرنا چاہتا ہو یا ان خبیثوں جیسا نہیں ہے۔“ اس نے ایک اور خبر کی طرف اشارہ کیا۔ ”آپ نے یہ خبر پڑھی؟ اس میں ایک خاتون اور اس کے بچوں کے شفا کا نمل کے بارے میں بتایا گیا ہے۔“ اس نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا اور رانا گلزار کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ ”میری تو خواہش ہے کہ پولیس اگر اس نوجوان خاتون اور اس کے معصوم بچوں کے قاتل کو گرفتار کر لے تو اسے وہ بھرے بازار میں کھڑا کر کے گولی مار دیں اور پھر اس کی لاش کو یوں نذر آتش کریں کہ جس طرح سے ہندو لوگ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں۔“

”یہ بھی تو ممکن ہے کہ پولیس جس شخص کو پکڑے وہ اصل میں بے گناہ ہو؟“ رانا گلزار نرمی سے بولا۔

”قانون کے مطابق جب تک کسی کا جرم ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک اسے بے گناہ ہی سمجھا جاتا ہے بے گناہوں کو سزا سے بچانے کے لیے ہی شک کا فائدہ دینے کا قانون بنایا گیا ہے۔ سزا صرف اسی وقت دی جاتی ہے جب ہر شک و شبہ سے بالاتر ہو کر جرم ثابت ہو جائے اور نشانہ کے شہری اور انسانی حقوق متاثر ہوتے ہیں انسانی حقوق کی پامالی ہوتی ہے۔“

”آپ کون سے انسانی حقوق کی بات کر رہے ہیں؟“ ناہید نے الجھن سے پوچھا۔ ”یہ تو انسانی حقوق کو یہ

حق دے دیا جائے کہ وہ دوسرے انسانوں کو قتل کر سکیں، خواتین کی عزت لوٹ سکیں، اکثر مجرم جب پکڑے جاتے ہیں تو سب کو پتا ہوتا ہے کہ یہ مجرم ہیں لیکن چند شاطر وکیل عدالت میں ایسے ایسے چکر چلاتے ہیں ایسے قانونی نقطے نکالتے ہیں متعلق کو یوں تو زمر مرد کر پیش کرتے ہیں کہ عدالت مجبور ہو کر انہیں رہا کر دیتی ہے۔“ پھر گویا اچانک اسے یاد آیا کہ اس کا مالک بھی تو ایک وکیل ہے اس کا لہجہ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ وہ معدرت خواہانہ لہجے میں بولی۔ ”معاف کیجئے گا جناب! میرا خیال ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی بولنے لگی ہوں؟“

رانا گلزار نے پردائی سے کندھے اچکا کر رہ گیا۔ وہ یہ بات پہلی بار نہیں سن رہا تھا بارہا اس سے یہ بات کہنی لگی تھی سب سے زیادہ بار تو اس نے یہ بات اپنی بیوی کے منہ سے سنی تھی۔ وہ اپنی بیوی کو کافی عرصہ پہلے طلاق دے چکا تھا۔ وہ تو جانے کتنی بار اس کی پشتہ دارانہ قابلیت پر بڑی بے رحمانہ تنقید کر چکی تھی۔ وہ موت کے منہ میں جاتے ہوئے مجرموں کو قانون کی گرفت سے یوں نکال لیتا تھا جیسے مکن میں سے پال نکالا جاتا ہے۔ اسے اس کی بیوی اس کی قابلیت نہیں بلکہ خباثت اور شیطانت قرار دیتی تھی۔ وہ اس کی کمائی کو حرام کی کمائی سمجھتی تھی۔ اپنے بچے کا خرچہ دہ باتا عدگی سے بچ رہا تھا اور اسے اس کی سابقہ بیوی نے کبھی بھی قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا وہ ناہید کو خیانت زدہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں تمہیں ایک بات بتاؤں اگر تمہارا یہ پراسرار خفی کبھی سامنے آ گیا اور معلوم ہوا کہ وہ اصل میں ایک ایسا شقی القلب قاتل ہے جو بیڑی سفاکی سے کئی آخر کو موت کے گھاٹ اتار چکا ہے تو ضرورت پڑنے پر میں عدالت میں اس کی وکالت کروں گا اگر اس نے

میری خدمات حاصل کرنا چاہیں تو میں اس کا بھی وکیل صفائی بن جاؤں گا۔“



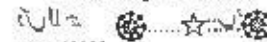
رانا گلزار ایک پوش علاقے کی شان دار عمارت میں واقع اپنے دفتر میں داخل ہوا تو اس کی سیکرٹری نے فون پر موصول ہونے والے ایک پیغام کو تحریری صورت میں اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”یہ شخص متوقع موکل گلتا ہے غالباً اسے آپ کی خدمات کی ضرورت ہے پولیس نے اس کے ساتھی کو آج اس ادارات کے الزام میں گرفتار کیا ہے جو پچھلی رات کو قتل کی بیوی خان کی بیوی اور دو بچوں کو قتل کر دیا گیا تھا بچوں کی عمریں سات اور چار سال تھیں۔“

رانا گلزار نے کاغذ دیکھا فون کرنے والے کا نام دیکھا۔ اسے اپنے ساتھی منظور حسین کے لیے اس کی قانونی خدمات کی ضرورت تھی۔ ذہن پر زور دینے کے بعد وہ گلزار کو یاد نہ آیا کہ وہ اس نام کے کسی شخص کو جانتا ہے۔ اس نے اپنا سر جھٹکا اور خود کو سمجھایا کہ وہ یقیناً ایک کامیاب وکیل صفائی ہے لیکن شہر کے سارے مجرموں سے واقف تو نہیں ہو سکتا پھر اس نے دل ہی دل میں صبح کی کراہ سے سوچتے وقت بھی ان کے لیے مبینہ مجرموں کی اصطلاح استعمال کرنی چاہیے کیونکہ اس کے اپنے فلسفے کے مطابق جب تک کسی کو تمام شکوک و شبہات سے بالاتر ہو کر مجرم ثابت نہ کر دیا جائے اس وقت تک اسے مجرم نہیں کہا جاسکتا۔

یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنی سیکرٹری مس نشا کو دیکھ کر سر ہلایا اور جی آواز میں بولا۔

”ٹھیک ہے میں اس سے رابطہ کر لوں گا۔“



رانا گلزار نے اپنے سامنے میز کی دوسری طرف بیٹھے منظور حسین کو دیکھا اور اپنے آگے رکھی پائسل کا جائزہ لیا پھر کہا۔

”مجھے امید نہیں ہے کہ جج تمہاری ضمانت منظور کر لے گا۔ تمہارا ریکارڈ خاصاً شرمناک ہے۔ تم اٹھارہ بار گرفتار ہوئے ہو دو بار تمہیں سزا ملی ہے۔ ہر طرح کے الزام میں تم گرفتار ہو چکے ہو غیر قانونی اشیاء اور منشیات فروشی زبردستی لوگوں کے گھروں میں داخل ہونے اور قتل کرنے کی کوشش تک کے الزامات ماضی میں تم پر لگ چکے ہیں اس ریکارڈ کو مد نظر رکھتے ہوئے ضمانت ہونا مشکل ہے۔“

”کیوں مشکل ہے بھئی؟“ منظور حسین نے قدرے جارحانہ سے لہجے میں کہا۔ ”میں اس شہر میں پیدا ہوا تھا میرے تمام کاروباری رابطے یہیں ہیں جن جرائم میں مجھے سزا ہوئی تھی وہ معمولی قسم کے تھے میرا مطلب سمجھ رہے ہیں ناں؟“ اس نے رانا گلزار کو آنکھ ماری پھر بولا۔ ”میں سب کچھ چھوڑ کر کہیں بھاگ تھا تو ہی جاؤں گا۔“ پھر وہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ”اس کے علاوہ وہ میرے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے میرے پاس جائے وقوعہ سے اپنی غیر حاضری کا ایسا خاص ثبوت موجود ہے جسے کوئی بھی جھٹلا نہیں سکتا۔“ اس ثبوت کے لیے اس نے ایک نقش سی تشبیہ بھی استعمال کی پھر بولا۔ ”جس وقت جمیل خان کی بیوی کو اس کے اعمال کی سزا ملی اس وقت میں شہر کے ایک دور دراز حصے میں موجود تھا۔ دو خواتین اس کی حلفہ گواہی دینے کو تیار ہیں۔ وہ خاموش ہوا تو کئی تحوں تک رانا گلزار اپنے متوقع موکل کو ایک ٹک دیکھتا ہوا پھر بولا۔

”میں ذرا مکمل کر بات کرنا ہوگی۔ تمہیں پتا ہے کہ پولیس نے تمہارا نام قمر اندازی میں نکال کر نہیں

پکڑا سب کو پتا ہے کہ مقتول کا شوہر ایک طرح سے تمہارا کاروباری حریف تھا۔ وہ دوسری مافیا کا بندہ تھا وہ افغان تھا لیکن دو تین سال پہلے اس نے پاکستانی شہریت حاصل کر لی تھی۔ پولیس کے بقول منشیات کی تجارت میں وہ تمہارے مقابلے میں کام شروع کر کے تمہیں کروڑوں کا نقصان پہنچا رہا تھا اس کے علاوہ پولیس کے پاس ایک گواہ بھی موجود ہے۔“

”کون سا گواہ اور کس چیز کا گواہ؟“

”جس نے تمہیں اس عمارت میں داخل ہوتے وقت دیکھا تھا جہاں مقتول رہا تھا پڑھیں۔“

”یہ سب بکواس ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی مجھے اس وقت دیکھتا۔“ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ گیا ہے وہ خاموش ہو گیا۔ وہ جوش میں سب کچھ نہ چاہتے ہوئے بھی بتا گیا تھا لیکن اس نے خود کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھا پھر اس نے اصرار دیکھا جمیل کے اس ملاقاتیوں والے کمرے میں اس وقت ان دونوں کے سوا کوئی اور موجود نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر وہ خفا شد بھرا ہوا سا قہقہہ لگا کر بولا۔

”یہ بات میرے اور صرف آپ کے درمیان میں رہنی چاہیے۔“

”وکیل اور موکل ڈاکٹر اور مریض کے درمیان ہر بات لازمی ہوتی ہے۔“

”بالکل ٹھیک؟“ منظور حسین نے طرانی سے سر ہلایا اور بولا۔ ”جب اس غارت میں داخل ہوا تھا تو لابی اور لفٹ خالی تھیں اور میری واپسی پچھلی طرف کے بنگلہ کی طرف سے ہوتی تھی یہ کس طرح ممکن ہے کہ کسی نے مجھے اندر جاتے ہوئے دیکھا ہو؟“

”خیر تمہاری اس بات سے میرا شک تو یقین میں بدل گیا تھا۔“

”کک۔۔۔۔۔ کک۔۔۔۔۔ کون سا شک؟“

”وہ شک یہ تھا کہ قتل تم نے ہی کیا تھا۔“ رانا گلزار

شک لہجے میں بولا۔ ”اب میں تم سے صرف دو سوال

اور پوچھنا چاہتا ہوں؟“

جی پوچھیے۔۔۔۔۔“

”میرا پہلا سوال تو یہ ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟“

”کک۔۔۔۔۔ کک۔۔۔۔۔ کیسا کیوں کیا؟“ منظور

نے حیرت سے منہ پھاڑتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب ہے کہ تم نے جمیل خان کی بیوی

اور اس کے کم سن بچوں کو کیوں قتل کیا؟ ان کا تو منشیات

کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا انہیں قتل کر کے

تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوا؟“

”میں نے جمیل خان کو یہ سبق دیا ہے وہ یہی

زبان سمجھتا ہے۔ یہ افغان خود بھی تو یہی کرتے ہیں

چنانچہ میں نے سوچا کہ آج کل جب کہ جمیل خان

ایک بہت بڑی کھپ کی خریداری کے سلسلے میں ملک

سے باہر گیا ہے تو کیوں نا اسے اس کی زبان میں سبق

دے دیا جائے۔“ پھر اس نے انگلی میں دنی گریٹ کا

ایک کش لیا اور طرانی سے بھرے لہجے میں کہا۔ ”جمیل

خان کو اب صحیح طور پر پتا چلے گا کہ مجھ سے اچھے والے

کو کتنا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ رانا گلزار نے سر ہلایا۔ ”میرا دوسرا

سوال میری فیس کے بارے میں ہے کیا تم میری

فیس ادا کرنے کے قابل ہو؟ تم نے کسی سے فرمائش

کی تھی کہ شہر کے بہترین وکیل صفائی سے تمہارا رابطہ

کرایا جائے۔ تمہیں پتا ہی ہوگا کہ بہترین چیزیں

سستی اور آسانی سے نہیں ملتیں۔“

”ہاں مجھے پتا ہے۔“ منظور نے قہقہہ لگایا۔

”آپ فیس بتائیے؟“

”دس لاکھ۔“ پانچ لاکھ تو میں پچھلیوں گا۔۔۔۔۔

باقی مقدمے کا فیصلہ ہونے کے بعد.....

”ٹھیک ہے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ منظور نے فیس سن کر ذرا لمبی پریشان ہوئے بغیر کہا۔ ”میں بڑے وقت کے بارے میں جانتا ہوں کہ یہ بھی بتا کر نہیں آتا اور ویسے بھی ہمارا جو وعدہ ہے اس میں تو ہٹا ہی نہیں چلتا۔ اس لیے میں اس کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں میں کچھ رقم ایک طرف رکھتا ہوں وہ اچھی خاصی رقم ہے۔ آپ کی فیس ادا کرنے کے بعد بھی میرے پاس اچھی خاصی رقم بچ جائے گی۔“

ہوں..... رانا گلزار نے ہنکار دھرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارا دوسرے ہے۔“

”اور ہاں مجھے ایک بات یاد آگئی۔“

”کیا؟“

”مجھے اچھی طرح یاد ہے کچھ عرصہ پہلے آپ نے علی نواز نامی ایک شخص کا مقدمہ لڑا تھا اس پر تشدد اور قتل کا الزام تھا۔ عام خیال یہی تھا کہ اسے موت کی سزا ہو جائے گی لیکن آپ نے اسے بچا لیا تھا۔“

”تمہیں اس مقدمے کے بارے میں کہاں سے پتا چلا؟“

”اصل میں علی نواز میرا دوست تھا اس لیے میں اس مقدمے کی تفصیل میں دلچسپی لیتا رہا تھا آپ نے اس کی رہائی کے بعد اس کے لیے کچھ ایسے انتظامات کیے تھے کہ بعد میں خفیہ پولیس والے اسے کسی اور جگہ میں نہ دھریں آپ نے اس کے لیے سنے کاغذات اور پاس پورٹ وغیرہ کا انتظام کر کے اسے خاموشی سے ملک سے باہر نکال دیا تھا۔“

”ممکن ہے میں نے ایسا کیا ہو۔“ رانا گلزار نے مبہم لہجے میں کہا۔ ”تم اپنے بارے بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو؟“

”میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے لیے بھی ایسے

انتظامات کر دیں۔“

”لیکن تم تو کہہ رہے تھے تم اس شہر کو چھوڑ کر کہیں نہیں بھاگ سکتے یہاں تمہارے کاروباری رابطے ہیں اور.....“ منظور نے اس کی بات کاٹی اور کہا۔

”میں ہمیشہ کے لیے بھاگ جانے کی بات تو نہیں کر رہا ہوں۔“

”پھر.....؟“

”مجھے عارضی طور پر تو انڈر راکر اوٹ بند ہونا ہی پڑے گا اگر میرے آدمی مقدمے کے دوران میں جیل خان کا بھی بندوبست کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا تو رہائی کے بعد میرا کچھ مدت کے لیے نکل جانا ہی اچھا ہوگا کیوں کہ جیل خان کوئی نہ کوئی جوابی کارروائی ضرور کرے گا میرے نکل جانے کے کچھ عرصہ کے بعد جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو میں واپس آ جاؤں گا۔“

”یہ کام بھی ہو جائے گا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن.....“

”آپ بے فکر رہیں میں ان انتظامات کے بدلے میں بھی آپ کو بہت اچھی رقم دوں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے سگریٹ اینڈرے میں مسل دی۔

”ان انتظامات کا معاوضہ پچاس لاکھ روپے ہوگا۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے آپ میرا اچھی طرح خیال رکھیں میں آپ کا خیال رکھوں گا۔“

منظور کے خلاف جو مقدمہ استغاثہ نے عدالت میں پیش کیا تھا وہ بہت کمزور بنیاد پر استوار تھا۔ شہادتیں لکھی کرنے کے سلسلے میں بالکل جدوجہد نہیں کی گئی تھی۔ کوئی بھی قابل وکیل ان کے نیچے ادھیڑ سکتا تھا۔ سارا مقدمہ اصل میں ایک ہی شخص کی گواہی پر ٹکنا ہوا تھا۔ وہ شخص اس علامات کا سیکورٹا

گورڈ تھا جس میں جیل خان کی بیوی اور اس کے بچوں کو قتل کیا گیا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ واقعے کی شب اس نے منظور کو لابی سے لفٹ میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ اس کا نام مبشر خان تھا۔

رانا گلزار نے سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ جاسوسی کا شوق رکھنے والے ایک بندے کی خدمات حاصل کی تھیں کہ وہ مبشر خان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرے۔ مقدمے کی سماعت شروع ہونے سے ایک دن پہلے ہی جاسوس کی رپورٹ رانا گلزار کی میز پر پہنچ چکی تھی۔ اس کا مطالعہ کر کے رانا گلزار بہت مطمئن ہوا اور ہلکی ہلکی سیٹی بجانے لگا۔

مقدمے کی سماعت کی تاریخ جیسے جیسے قریب آتی چلی گئی منظور سے گفتگو کرنا یا اسے کچھ سمجھانا مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا۔ جیل میں بند رہ کر اس کی چرچا ابٹ اور بد مزاجی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ رانا گلزار کی توقع کے عین مطابق جج نے منظور حسین کی ضمانت منظور نہیں کی تھی۔ دوسرا منظور کو اس کے آدمیوں نے بتایا تھا کہ جیل خان باہر سے واپس آنے کے بعد چھپ گیا تھا۔ یوں اسے نشانہ بنانا مشکل ہو گیا تھا لیکن منظور کے بارے میں زیر زمین دنیا میں یہ خبر گرم تھی کہ اس کی موت کے احکامات جاری کیے جا چکے ہیں۔

تاہم منظور نے جیل کے ملاقاتیوں والے کمرے میں ایک ناز ترین ملاقات میں رانا گلزار سے کہا تھا۔

”مجھے ان خبروں پر کوئی تشویش نہیں ہے یہاں سے میں رہا ہو جاؤں تو مجھے صرف کچھ عرصے کے لیے کسی اچھے سے مقام پر روپوشی کی ضرورت ہوگی جیسے ہی جیل خان سامنے آئے گا اور ذرا غیر محتاط نہ ہوگا میرے آدمی اس سے نمٹ لیں گے۔“

”تم جیل خان کے ساتھ کیا کرتے ہو یہ تمہارا معاملہ ہے۔“ رانا گلزار نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میں تو محض تمہارا قانونی دفاع کر رہا ہوں۔“

”آپ کو میرے بیرون ملک سفر کے انتظامات بھی کرنے ہیں جس کے لیے میں آپ کو پچاس لاکھ روپے دوں گا۔“

”مسئلہ صرف اس سیکورٹی گاڑی کی گواہی کا ہے ورنہ استغاثہ کے مقدمے میں کوئی جان نہیں ہے۔“

”اس کرائے کے ٹوکا بھی کوئی بندوبست کر دیتے ہیں اسے کوئی حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے اگر انسان رقم خرچ کرنے کی استطاعت رکھتا ہو اور کام کے لوگوں کو جانتا ہو تو ہر طرح کا کام ہو جائے ہیں۔“

”میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ایسی کوئی حرکت کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ جب کبھرے میں آئے گا تو میں اس سے خوش کھلوں گا۔“ رانا گلزار ذرا سخت لہجے میں بولا۔

عدالت کا منظر تھا۔ وکیل استغاثہ سرکاری وکیل تھا اس لیے اس کی اس مقدمے میں دلچسپی بالکل نہیں تھی۔ وہ تو خانہ پوری کر رہا تھا۔ اس نے جو سوال مبشر سے کیے تھے وہ بس یہی ظاہر کر رہے تھے کہ جس شخص کو قتل والی رات مبشر نے دیکھا تھا وہ منظور حسین تھا۔ دو منٹ کے بعد ہی وکیل استغاثہ نے مبشر کو غارغ کر دیا تھا اب باری رانا گلزار کی تھی وہ اپنے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر کٹھنرے کی طرف بڑھا۔

رانا گلزار بارعب انداز میں چلا ہوا گواہوں کے کٹھنرے تک گیا اور مبشر خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ جیل خان کی بیوی اور ان کے بچوں کے قتل کی شب تم کہیں باہر سے لابی میں

رانا گلزار نے اس کا جواب سن کر چند کاغذات لٹکتے ملتے ہوئے کہا۔

”کیون میری مطلوبات کے مطابق اس ہفتے کے دوسرے معمول کے معائنے کے لیے تم وہاں نہیں پہنچے تھے کیا تم اس وقت بھی ہاتھ روم میں تھے؟“

مقدمے کی تمام تر تکنیکی اور موضوع کی تمام تر سنجیدگی کے باوجود اس موقع پر عدالت میں زوردار قبضہ پڑا۔ جج کو سختی سے انہیں روکنا پڑا۔ بمشتر کا چہرہ مخالفت سے سرخ پڑ گیا وہ کچھ اور بوکھلاہٹ کے عالم میں بولا۔

”نن..... نن نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں تھی بس میں نے ضرورت محسوس نہیں کی اس کے علاوہ اس دن مجھے دو تین دوسرے ضروری کام بھی کرنے تھے۔“ رانا گلزار نے اپنے مخصوص انداز میں اس کے بالکل سامنے ٹھلکتے ہوئے اسے مزید بدحواس کر دیا اور نہایت پر اعتماد لہجے میں کہا۔

”عین ممکن ہے کہ وہ ضروری کام یہی ہو کہ بوتل تمہارے ہاتھ لگ گئی ہو اور تمہیں اسے خالی کرنا ہو اس بات کا بھی امکان موجود ہے کہ قتل کی رات لابی سے غائب ہونے کی وجہ بھی بوتل رہی ہو؟“ اس سے پہلے کہ وہ کیل استغاثہ رانا گلزار کے طرز عمل پر اعتراض کرتا بمشتر تقریباً چیخ اٹھا۔

”نن..... نن نہیں..... نہیں..... یہ جھوٹ ہے..... میں اب بالکل نہیں پتہ ہوں۔“ یہ سن کر رانا گلزار انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

”اس صورت میں مجھے عدالت کی صفائی کرنے والے تصویر نامی شخص کو گواہوں کے کٹہرے میں بلانا پڑے گا اور وہ معزز عدالت کو بتائے گا کہ تم کتنی بار اس کے ساتھ بیٹھ کر بیچے ہو۔“ اس سوال کا بمشتر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس

کی شکست کے ساتھ ہی استغاثہ کی شکست کے تابوت میں آخری کیل بھی جڑی گئی۔

”جناب عالی! مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا۔“ رانا گلزار نے اپنے سوالوں کا سلسلہ ختم کرتے ہوئے کہا۔

شک کا فائدہ! یہ تھی وہ قانونی اصطلاح جو اس سے پہلے بھی بار بار رانا گلزار کے کام آچکی تھی۔ یہ اس کے لیے یا تجربہ نہیں تھا وہ اس کام کا بڑا ماہر تھا۔ جج کے ذہن میں صرف شک کے چند بیج بوئے جاتے تھے پھر بہترین الفاظ سے ان کی آب یاری کی جاتی تھی اور آخر کار بیج ملزم کو رہا کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

رانا گلزار کے شاطرانہ طریقے کے آگے بمشتر ڈھیر ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ایک معمولی تعلیم یافتہ اور احساس کمتری کا شکار انسان تھا۔ پہلی بار اس نے عدالت میں حاضری دی تھی جہاں وہ بہت سے لوگوں کی گھورتی ہوئی نگاہوں کا مرکز تھا۔ اس کا اپنا ماضی بہت خراب کارکردگی کا حامل تھا۔ وہ بھلا ایک شاطر کامیاب اور منجھے ہوئے فوج داری وکیل کا سامنا کیسے کر سکتا تھا۔

رانا گلزار کو یہ ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ بمشتر اس رات کہیں پینے پلانے گیا ہوا تھا اس نے سب کی توجہ صرف اس امکان کی طرف مبذول کرادی تھی کہ بمشتر کے داغ دار ماضی کو سامنے رکھتے ہوئے اتنا ہی کافی تھا پھر اس کی گواہی معتبر نہیں رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس نے آدی کو پہچاننے میں غلطی کی ہو۔

اگلی پیشی پر عدالت نے منظور حسین کو باعزت بری کر دیا تھا۔ وہ شہر کے بہترین وکیل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے

”بس! اب میرا کیس تقریباً چار کلو میٹر دور رہ گیا ہے۔“ ڈرامائی رنگ کرتے ہوئے رانا گلزار نے جواب دیا۔

”آپ میرے لیے شہر کے پاس کسی جگہ چھپنے کا بندوبست نہیں کر سکتے تھے؟ خاص طور پر جب کہ میں آپ کو اتنا معاوضہ دے رہا ہوں۔“ منظور حسین نے شکوہ کیا۔

”تم نے فرمائش کی تھی کہ میں تمہارے لیے وہی انتظامات کروں جو میں نے علی نواز کے لیے کیے تھے چنانچہ میں وہی کر رہا ہوں میرا یہ تعظیلاتی کیس چھپنے کے لیے بہترین جگہ ہے۔ دو چار روز تمہیں اس ویران مقام پر رہنا پڑے گا۔ اس دوران میں میں تمہارے لیے نئے کاغذات اور پاس پورٹ تیار کروالوں گا۔ ایک سوٹر بوتل تمہیں دوسرے ملک کے ساحل پر پہنچا دے گی۔ وہاں سے کہیں بھی چلے جانا تمہارے لیے شان دار انتظامات ہو رہے ہیں تم اور کیا چاہتے ہو؟“

کچھ دیر کے بعد رانا گلزار کی مرسدیز ایک پگ ڈنڈی پر مڑی اور آخر کار ایک کیسین کے ڈرامائیوے میں جا کر رکی۔ یہ کیسین ایک جنگل میں واقع تھا۔ لگتا ایسے تھا کہ اوپر کوئی شادو نا ڈری آتا ہے۔ منظور کا ڈری سے اتر کر کیسین کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”جگہ تو بڑی ٹھیک ہے آپ کے سوائے کسی اور کو تو اس کے بارے میں پتا نہیں ہے؟“

”نہیں! یہ خود میری بھی خفیہ پناہ گاہ ہے۔“ رانا گلزار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس نے منظور حسین کا سوٹ کیس بیڈ روم میں لے جا کر رکھا اور سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ”اب تم باقی چیچن لاکھ روپے بھی نکال کر میز پر رکھ دو۔“ منظور حسین نے ہاتھ میں رقم والا بیگ پکڑا ہوا تھا۔

ایک آراوشہری کی حیثیت سے عدالت سے نکلتا تو ذرا عجیب الہام کے نمائندوں کی ایک کثیر تعداد ان کے استقبال کے لیے موجود تھی۔ رانا گلزار ان سب سے معذرت کرتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اپنے موکل کو لٹھ کی طرف لے کر چلے کہ فی الحال وہ دونوں عدالت کے اس فیصلے پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے باوجود شہر کے سب سے بڑے اخبار کے رپورٹر نے بھیڑ کو جوہرے ہوئے اپنا چھوٹا سا ٹیپ ریکورڈر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے لوپ کی آواز میں کہا۔

”رانا گلزار صاحب! ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ قانون کی جگہ سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں آپ کا جواب نہیں کیا موجودہ مقدمہ میں بھی آپ نے یہی کیا ہے۔“ رانا گلزار نے لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے غول خوار نظروں سے رپورٹر کو دیکھا اور کلاٹ دار لہجے میں کہا۔

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا اور یہ میری نہیں نظام انصاف کی فتح ہے کیسین تم جیسے اخبار والوں کی کجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی۔“

اتنا کہ کراس نے لفٹ بند کر دی تھی۔ اس دوران میں منظور کے پاس ایک شخص آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا جو اس نے منظور کو پکڑا دیا۔ وہ بندہ اصل میں منظور کا ایک خاص آدمی تھا۔ اس سے اس نے پیسے منگوائے تھے۔ اس بیگ میں رقم تھی اس آدمی پر منظور حسین کو اتنا اعتماد تھا کہ اس نے بیگ کھول کر رقم دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

”م بھی اور کتنی دور جانا ہے۔“ گاڑی کی چھیل سین پر بیٹھتے ہوئے منظور حسین نے قدرے بے زاری سے پوچھا۔

خالی ہاتھ

جناب اربخدا کے لئے
آج

ایک کھانا ارمیہ کے مرنے والے ایک کھانا ہے اس میں کھانا تھا کامیاب ہوا اس کا
قبضہ لوہے سے کرنا ہے۔ یہ کھانا دوسرے کے لئے کھانا کھونے والی عموماً
خود اس کھانا کو کھانا ہوتا ہے۔ مگر اس کے ہاں جو وہ لوہے کے ہاتھ سے دوز
میں دوسرے کو کھانا ہے ہاں نہیں آئے۔ ایک بیوکہ پرہت کا قہقہہ جو دوسرے
کو کھانا پر ہاتھوں پر رکھ کر کامیاب کے قریب پہنچا کر کھانا کھاتا تھا۔

والسلام
غیاث الدین

تھا اس میں مجموعی طور پر پچاس ہزار کی ایک
بڑی رقم نکالی جا چکی تھی اور میں خود اس کا قرضے
دار تھا۔ میں نے یہ رقم یکمشت نہیں نکالی تھی۔
سب سے پہلے رقم میں نے اپنی شادی کے ایک
بھتیجے بعد صدر دفتر سے اجازت لیے بغیر یہ سوچ
کر نکالی تھی کہ دو ایک مہینے بعد لوٹا دوں گا مگر
ایک مہینے کے بعد ہی مجھے مزید قرض لینا پڑا
حالانکہ میں مذکورہ کمپنی کا جنرل منیجر تھا۔ میری
تخووا بڑی معقول تھی۔ شادی سے پہلے میں
ٹھانٹ باٹ کی زندگی گزار رہا تھا اور خاصی بڑی
رقم میں انداز کر لی تھی لیکن اب صورت حال
بدل چکی تھی۔ شادی میں نے بڑی دیر سے کی
یعنی چالیس سال کی عمر میں لیکن اس عمر میں بچہ
کر بھی میں چالیس سال کا دکھائی نہ دیتا تھا بلکہ
اپنی عمر سے بہت کم اس لیے نظر آتا تھا کہ
میں صحت مند اور دراز قد تھا۔ میری بیوی عمر میں
مجھ سے کوئی پندرہ سال چھوٹی تھی۔ نو عمری کے
خمار نے اسے دوا تھ بنا دیا تھا۔ ایک ایسی
حسین بیوی کو پا کر میں اس پر کچھ ایسا فدا ہوا کہ
اس کے اشاروں پر لٹو کی طرح گھومنے لگا۔
بیوی بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ سسٹم

آج میرے وجود میں یکے بعد دیگرے کئی
سو پونڈ وزنی ہموں جیسے خوف ناک دھماکے
ہوئے تھے جس وقت میں دفتر جانے کے لیے
گھر سے نکل رہا تھا تب پہلا بم میری بیوی نے
میرے سر پر دے مارا۔
"میں آخری مرتبہ کہہ رہی ہوں اب بس"
آپ ایک بھتیجے کے اندر اندر مجھے نئے ماڈل کی
ہنڈ اسوک کا خرید کر دے دیں۔"
"ہنڈ اسوک؟" میری نظروں کے سامنے
کوئڈ اسالپکا۔
"میں اس کے علاوہ کوئی اور گاڑی نہیں
لوں گی۔ اس ٹویونا سے میرا دل بھر گیا ہے اگر
آپ نے مجھے میری پسند کی کار خرید کر نہیں دی تو
بھر میں کراچی ڈیڈی کے پاس جا رہی ہوں اسی
وقت لوٹوں گی جب آپ کار خرید لیں
گے؟" میری بیوی غصے سے بولی۔
میں دفتر جاتے ہوئے سوچوں میں غرق
ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی بڑی
رقم کہاں سے لاؤں۔ میں جس کمپنی میں
ملازمت کر رہا تھا اس کا ذیلی دفتر میری تحویل
میں تھا۔ اس کمپنی کا جو سرمایہ مقامی بینک میں جمع

وہ بینک اس نے میز پر رکھ دیا۔ اچانک وہ چونک پڑا
کیوں کہ اس نے دیکھا تھا کہ رانا گلزار نے اپنی جیب
سے ایک پستول نکال کر اس پر نشان لگائی اور کہہ دیا تھا۔
"اب تمہیں میرے ساتھ کچھ اور آگے تک میرے
کے لیے چلنا ہے۔"
"یہ..... کیا مذاق ہے؟" منظور برہمی سے بولا۔
"چلو!" رانا گلزار پستول سے باہر کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے غرایا۔ شاید اس کے لہجے میں کچھ ایسی
بات تھی کہ نشیات کا استعمال اس کے حکم کی تعمیل کرنے
پر مجبور ہو گیا تھا۔
پانچ منٹ پیدل سفر کے بعد وہ گھنے جنگل میں جا
پہنچے ایک جگہ درختوں کے درمیان میں ایک تازہ کھدا
ہوا ٹڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ رانا گلزار نے اسے وہاں
رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"یہاں تمہارا دوست علی نواز اور معاشرے کے
تمہارے جیسے کئی دوسرے نامور فن ہیں تمہارے
رویوش ہونے کے لیے یہ ایک بہترین جگہ ہے یہاں
کوئی بھی کبھی تمہارا سراغ نہیں لگا سکے گا۔"
"سنگ..... کیا مطلب؟"
"مطلب یہ ہے کہ دنیا کی عدالت سے تو میں
نے تمہیں بچا لیا کیوں کر اگر میں ایسا نہ کرتا تو کوئی اور
تمہیں بچا لیتا۔ اب میں تمہیں اپنی عدالت میں لایا
ہوں اور اس عدالت نے تمہیں سزائے موت سنائی
ہے۔ جس پر میں فوری عمل کرنے لگا ہوں۔"
اتنا کہہ کر رانا گلزار نے اس کی کھوپڑی کا نشانہ
لے کر فائر کر دیا۔ منظور حسین کچھ بھی نہ کر سکا۔ ایک
دھماکا ہوا منظور حسین کی کھوپڑی کے پرچے اڑ گئے
اور وہ سیدھا گڑھے میں جا گرا اسے جیتنے کا موقع بھی
نہیں ملا تھا۔

آفسر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ زندگی شاہانہ ہوتی گئی سیر و تفریح اور فرمائشوں کے باعث میں قرض لی ہوئی رقم واپس کیا کرتا۔ الٹا میں نے اور قرض لیا۔ اس طرح یہ رقم بڑھتی چلی گئی میں پچاس ہزار روپے کا مقروض تھا۔ صدر دفتر سے اب تک اس لیے باز پرس نہ ہو سکی تھی کہ میرے مالکان سے قرضی روابط اور گہرے تعلقات تھے۔ مالکان کوئی ایک سال سے غلطی کی ریاستوں میں تعمیراتی ٹھیکے حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے اور وہیں مقیم تھے لہذا مجھ سے کون باز پرس کر سکتا تھا۔

آج میری بیوی نے مجھے جو دھکی دی تھی اس نے ابھن اور پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ مجھے اس بات کی فکر ستائے جا رہی تھی کہ بیوی اگر میکے چلی گئی تو میرا کیا حال ہوگا۔ اب میں بیوی کے بغیر ایک دن رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ادھر بیوی کی فرمائش پوری کرنا میرے بس میں نہیں تھا آخر اتنی بڑی رقم کہاں سے لاتا؟ میں اپنی بیوی کو کسی قیمت پر ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔

دفتر پہنچتے ہی پہلے ڈاک سے جو خطوط موصول ہوئے تھے ان میں سے ایک خط مالکان میں سے ایک کا تھا۔ خط ذاتی نوعیت کا تھا اس نے لکھا تھا۔

”ایک سال کی کوششیں بھی رائیگاں گئی ہیں ہم کوئی ٹھیکہ حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ گراچی میں تعمیراتی کام بالکل ٹھپ پڑا ہے۔ کمپنی خسارے میں جا رہی ہے لہذا آپ فوری طور پر نئے فلینس کی ہنگامہ سے جو رقم وصول ہوئی وہ اور قرض لی ہوئی پچاس ہزار کی رقم کا بھی جلد سے جلد

ادائیگی کا بندوبست کریں۔ میرے حصہ دار کا رویہ بڑا سرد ہوتا جا رہا ہے اگر وہ کسی وجہ سے الگ ہو گیا تو پھر سارا کاروبار چوڑھ ہو کر رہ جائے گا۔ لاہور کا دفتر اور کام کاج بند کرنا ہوگا۔“

آج صبح دن کا آغاز دراصل بد قسمتی کا آغاز تھا۔ بد قسمتی مجھے پوری طرح اپنے زخموں میں لے رہی تھی۔ مرے پر سو ڈزے لگ رہے تھے۔ آج ہی بیوی نے مجھے صاف اور واشگاف الفاظ میں دھکی دی تھی آج ہی صدر دفتر سے ایک طرح کا نوٹس آ گیا تھا ایک طرف بیوی کی ناراضی اور دوسری طرف مستقبل خطرے میں تھا میں فکر مند اور پریشان ہو کر گہری سوچ میں غرق تھا کہ کیشیئر عید الرزاق میرے کمرے میں داخل ہوا تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

”سر!“ وہ اپنی دھن میں کہنے لگا۔ اس نے مجھے خلاف معمول پریشان اور فکر مند دیکھا تو اسے کچھ احساس بھی نہیں ہوا۔ ”ہم نے ایگل اپارٹمنٹس کی آج سے ہنگامہ کے لیے اشتہارات ٹی وی اور اخبارات میں دیئے تھے اس کے بڑے اچھے نتائج نکلے ہیں۔ پندرہ مینٹ کے اندر استقبال کے کمرے کے اندر باہر ڈیڑھ دوسو کے لگ بھگ لوگ جمع ہو چکے ہیں ہم اب ہنگامہ شروع کرنے جا رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ دو تین گھنٹے میں سارے فلینس کی ہنگامہ آج ہی ہو جائے گی۔“

کیشیئر مجھے ایک اچھی سی خوش خبری سنا کہ چلا گیا لیکن اس خوش خبری سے میرے دل کو بوجھ نہ بٹ سکا۔ دوسرے لمحے میری سیکرٹری مس فاطمہ چوہدری ایک فائل اٹھائے اندر

داخل ہوئی میں اس وقت اپنی طبیعت میں کسی قدر اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ فاطمہ نے فائل میز پر میرے سامنے رکھ دی۔

”یہ مسٹر پرویز کی فائل ہے جو اسحاق خان نے آپ کو پہنچانے کے لیے دی ہے۔“ کوئی ایک گھنٹے بعد شاہد پرویز میری نظروں کے سامنے بدحواسی اور سراسیمگی کے عالم میں کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مجھے موقع مل گیا تھا کہ میں اپنا سارا غصہ اور دل کا بخار نکال سکوں۔ میں تیز و تند لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

”کیا تمہیں اس دن کے لیے پرہیز آفسر بنایا گیا تھا کہ کمپنی کو پوالیہ کر کے رکھ دو۔ تمہاری کیشن اور رشوت کی آمدنی ماہانہ دس پندرہ ہزار روپے ہے؟ اس طرح تم نے اب تک کمپنی کو دو تین لاکھ روپے کا نقصان پہنچایا اور بدنامی بھی الگ ملی۔ تم یہ فائل دیکھ رہے ہو اس میں تمہارے خلاف ایسے ثبوت موجود ہیں جو نہ صرف تمہارا مستقبل تباہ کر سکتے ہیں بلکہ حوالات میں بھی پہنچا سکتے ہیں۔ میں آج یہ فائل خود ہی صدر دفتر بذریعہ ہوائی جہاز روانہ کر رہا ہوں تم قانونی کارروائی کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھو۔“

پھر میں نے میز پر رکھا ہوا بریف کیس اپنی طرف کھینچا، نمبر سیٹ کر کے اسے کھول دیا۔ فائل اس کے اندر رکھ کر اسے دوبارہ متقل کر کے پہلے والی جگہ پر رکھ دیا۔ شاہد پرویز کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ اس کا جسم کانپ سا رہا تھا اس نے بریف کیس پر ایک حسرت بھری نظر ڈالی اور کسی

شرابی کی طرح لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

میں بڑی دیر تک سوچوں میں ڈوبا رہا۔ میری کنپٹیاں ابھی تک گرم تھیں۔ ایک لخت میرے ذہن میں ایک تدبیر نے میری مشکلات کو دور کرنے کے لیے راہ دی کہ میں شاہد پرویز کو بلیک میل کر سکتا ہوں وہ مجھے اتنی رقم کی ادائیگی کر سکتا ہے کہ میرا قرض بھی اتر جائے گا پھر ”ایگل اپارٹمنٹس“ کا نیا پروجیکٹ جس کی ہنگامہ خلاف توقع تیز بھی۔ اپنا کام شروع کر دے گا اس وقت شاہد پرویز سے میرے جعفر کا رشتہ قائم کر لوں تو بیوی کی فرمائش بھی آسانی سے پوری ہو جائے گی۔ میں اپنی ناراض بیوی کو دو ایک مہینے کے لیے سمجھا بھجھا تو سکتا ہوں۔

پھر میں اپنے کمرے سے نکل کر دفتر کے اس کمرے میں گیا جہاں بڑی تیزی سے فلینس اور دکانوں کی ہنگامہ ہو رہی تھی۔ مردوں اور عورتوں کا ایک جم غفیر تھا لوگ زیادہ تر نقد رقم لے کر آئے ہوئے تھے۔ نئے نئے نوٹوں کی گڈیاں دفعا میں اپنی خوشبو پھیلا رہی تھیں جس وقت وہ اپنے کمرے میں آیا تو بڑا مسرور تھا میری نپس میں ایک عجیب سی فرحت گردش کر رہی تھی۔ میں جاگتے میں پسینا دیکھنے لگا۔

میں دوپہر میں عموماً کچھ نہیں کھاتا تھا میں اپنے کمرے سے نکل کر آیا تو میں نے دیکھا کہ سارا ہال تقریباً خالی پڑا ہے۔ میں اپنی سیکرٹری کے کمرے کے پاس پہنچا تو وہ بھی خالی تھا۔ دروازے پر دربان بھی موجود نہیں تھا تقریباً سارا اسٹاف ہی چھ کرنے کے لیے باہر چلا جاتا تھا۔ دربان اور چیراسی پرانے اسٹور روم میں بیٹھ کر چائے کرتے اور نماز پڑھتے تھے۔ مجھے



اسی جگہ اسی طرح متقل پرارہے تو کوئی حرج نہیں ہے ایک گھنٹے بعد دفتر میں جب اس ڈکیتی کی وادوات پر ایک دم سے ہنگامہ بچ جانے گا تو دفتر کے لوگ میرے کمرے میں اس واقعہ کی اطلاع دینے آئیں گے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ میرا بریف کیس نہ پا کر شاید مجھ پر شک کر بیٹھیں میں باوجود کوشش کے اپنے دل کے چور کو نکال نہیں سکا پھر چند لمحوں کی دہنی اذیت اور کش مکش کے بعد فیصلہ کر لیا کہ بریف کیس میز پر ہی رہے گا۔

ایک گھنٹے سے پہلے ہی دفتر میں بھونچال مہا آ گیا۔ میری حسین و تمیل سیکرٹری ناظمہ ہدایاتی انداز سے چیختی، گرتی پڑتی ہجانی عالم میں پھولی ہوئی سانسوں سے کمرے میں داخل ہوئی تو میں تصوراتی دنیا سے باہر نکل آیا وہ حد درجہ خائف اور سر اسیمہ ہو رہی تھی بھر کرسی کا سہارا لے کر بے ترتیب سانسوں کے درمیان اٹکتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تو سینے کے تنوع نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ دفتر کا سارا نظام ورہم برہم ہو کر رہ گیا۔ دفتر کے سارے عملے کے درمیان خوف و ہراس پھیل گیا تھا میں جانتا تھا کہ مجھ پر کوئی شک نہیں کرے پھر بھی میرے دل کے نہاں خانوں میں انجانا خوف بسا ہوا تھا۔

ٹیلی فون پر اطلاع دیتے ہی پولیس نے پہنچنے میں بڑی تیزی دکھائی، ڈاکٹر بھی بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے میرے کمرے کے کیشیئر کو جلد ہی ہوش میں لے آیا۔ انجکشن اور دوائی سے وہ فوری طور پر سنبھل گیا تھا لیکن بڑی طرح دہشت زدہ ہو رہا تھا جب ڈاکٹر نے کیشیئر کی مرہم پٹی کر دی تو اسے رخصت کر دیا گیا۔ البتہ کیشیئر کو روک لیا گیا تھا

رہے تھے پھر میرے قدم اٹھتے چلے گئے۔ کیشیئر کے کمرے کا دروازہ میں نے بڑی آہستگی سے اندر کی طرف دھکیلا۔ باوجود احتیاط کے دروازہ چرچایا مگر عبدالرزاق نے پلٹ کر نہیں دیکھا وہ تیزی سے نوٹوں کی گنتی میں مصروف تھا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور اس کی پشت پر پہنچ کر اپنی پوری طاقت سے بریف کیس اس کے سر پر دے مارا اس کے منہ سے چیخ بھی نہ نکل سکی وہ کرسی سے نکل کر فرش پر گر پڑا۔ میں نے احتیاطاً اس کے سر پر ایک اور بھر پور ضرب لگائی۔

بریف کیس میں نوٹوں کی جتنی محتاش تھی اتنے نوٹ بھر لیے، چھوٹے نوٹوں کو میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا، میز پر دو ایک بڑے نوٹوں کی گڈیاں بچ گئی تھیں وہ بھی اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیں۔ جب میں کانپتے قدموں بدحواسی اور سراسیمگی کی سی کیفیت سے باہر آیا تو میرا کمر چند قدموں کے فاصلے پر تھا مگر یہ چند قدموں کی مسافت، میلوں کا فاصلہ بن گئی تھی۔ میرا ایک ایک قدم اٹھانا دو بھر ہو گیا تھا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچ کر نہ حال سا کر رہی پر گر پڑا جیسے تپتے ہوئے صحرا سے چل کر آیا ہوں، جلد ہی خود پر قابو پانے کے بعد مجھے سب سے پہلے اپنے بریف کیس کا خیال آیا۔ اسے کہاں چھپانا چاہیے؟ چھپا کر رکھنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے اگر چھپا دیا گیا تو دفتر کے لوگ مجھ پر شک کریں گے کیونکہ میں روزانہ اپنا بریف کیس ساتھ لے کر آتا ہوں اور چھٹی کے وقت ساتھ لے جاتا ہوں۔ یہ میرے روز کے معمولی میں شامل ہے سبھی جانتے ہیں اگر بریف کیس

چراغی اور دربان کی غیر ذمہ داری پر قصداً یا کوئی باہر کا شخص اندر آ کر دفتر کی چیز بھی آسانی سے اٹھا کر لے جاسکتا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ لچ ختم ہونے پر میں ان دونوں ملازمین کی خبر لوں گا۔ میں یہ سوچ کر اپنے کمرے کی طرف مڑا۔ کیشیئر کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے لمبے کے لیے ٹھیک گیا، میں نے دروازے میں لگے آئینے میں سے اندر جھانکا۔ کیشیئر عبدالرزاق اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا چھوٹے اور بڑے نوٹوں کو الگ الگ کر کے ان کی گنتی کر کے ان کا بڈل بنا بنا کر ایک طرف رکھ رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں بڑی مستعدی سے مشغول تھا۔ اسے دنیا و مافیہا کی خبر تک نہ تھی اس کی پشت میری طرف تھی۔ میری نظریں کیشیئر پر نہیں بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیوں پر مرکوز تھیں۔

جس وقت میں اپنے کمرے میں داخل ہوا میرے ذہن میں ایک کوند سا لپکا۔ ایک بل بھی نہیں گزرا میرے ذہن نے شیطانی منصوبہ بنایا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے میرے ذہن میں آیا تھا کہ میں خود ششدر رہ گیا تھا پھر کسی ناویدہ طاقت کے زیر اثر میں نے برقی سرعت سے شاہد پرویز کی فائل نکال کر میز کی دراز میں رکھ دی اور بریف کیس ہاتھ میں لے کر میں چوروں کی طرح کمرے سے نکلا تو میرا دل سینے میں بڑی طرح دھڑک رہا تھا اور رگوں میں بجلی سی کوند رہی تھی۔ میں نے پھر دفتر کے ہال کا جائزہ لیا، وہ اب بھی خالی پڑا تھا۔ پرانے اسٹور روم سے دربان اور چیراگی کے بائیں کرنے کی آواز نہیں آرہی تھیں شاید وہ دونوں نماز پڑھ

پولیس کو اپنی کارروائی پوری کرنا تھی۔ کیشیر کا گمراہ خاصا بڑا تھا۔ میز پر اور کرسیاں بھی موجود تھیں لہذا اسی کمرے میں کارروائی ہونے لگی۔ میں پوری کارروائی مکمل ہونے تک وہیں بیٹھا رہا۔ جیسے جیسے کارروائی اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی دیرے دیرے میرا خوف اور دہشت کم ہوتی جا رہی تھی۔ پولیس دفتر کے عملے پر اپنے شک و شبہات کا اظہار کر رہی تھی لیکن اسے کسی کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت یا بنیاد تک نہیں مل سکی تھی کہ وہ کسی پر ہاتھ ڈال سکے۔ ہر ایک نے دفتر سے بچنے کے وقت اپنی غیر حاضری کا ثبوت پیش کر دیا تھا اس چیز نے پولیس کو الجھن اور عجیب غمبے میں ڈال دیا تھا۔ آخر پولیس اس نتیجے پر پہنچی کہ ڈیکٹی کی یہ پراسرار دستگیر وادرات کسی جرائم پیشہ فرد کی کارستانی ہے مگر اس میں دفتر کا کوئی شخص ملوث ہے۔

بہت سارے چیک اور بے آرڈر ز چھوٹے نوٹوں کی گڈیاں میز پر پڑی تھیں۔ لوٹی ہوئی گئی رقم کا حساب کافی ہونی رسیدوں کی مدد سے مل گیا تھا۔ نامعلوم ڈاکو تقریباً تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے کی رقم لے گئے تھے اس مجموعی رقم کا چلے جانے کا سن کر نظا ہر میں اچھل گیا۔ پیشانی پر بے شمار سلوٹس پڑ گئیں اور چہرے پر دہشت سی برسنے لگی لیکن اندر ہی اندر میں کتنا مسرور ہو رہا تھا یہ میرا دل ہی جانتا تھا۔ میں اپنے دفتر کا قرض ادا کرنے اور اپنی بیوی کی فرمائش پوری کر کے اس کا دل جیتنے کی پوزیشن میں آ گیا تھا پھر یہ رقم کچھ عرصے تک میری شاہانہ گزر بسر یا سیر و تفریح کے کام بھی آ سکتی تھی۔

میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنا

قرض اتارنے اور بیوی کو خوش کرنے کے لیے اتنی دور بھی جاسکتا ہوں۔ یہ محض ایک سنہرا اتفاق تھا کہ سارا کام میری توقع سے بڑھ کر بچوں کا کھیل ثابت ہوا تھا۔ یہ ایک ایسا منصوبہ تھا جو حالات نے ساتھ دے کر مجھے کامیاب کر دیا تھا ایسا منصوبہ اب بار بار قابل عمل نہیں ہو سکتا ہے اور نہ میں کوئی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے جو کچھ بھی کیا اپنی عزت ملازمت اور حسین بیوی کی خوشنودی کے لیے کیا تھا۔ میں کوئی پیشہ ور مجرم تو نہیں ہوں جو بار بار ایسے منصوبوں پر عمل کرتا رہوں۔ میں بہت خوش تھا کہ کوئی بھی مجھ پر شک نہیں کر سکتا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ یہ رقم اس وقت بھی دفتر میں موجود ہے۔

پولیس والے دوسرے دن تحقیقات کے لیے دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔ میں نے زخمی کیشیر کو حفاظت سے گھر پہنچانے کی ذمہ داری قبول کر لی پھر میں اسی کمرے میں کیشیر کو چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف نہایت اطمینان اور حتمیت سے چلا ہوا پہنچا جیسے ہی میں نے کمرے کے اندر قدم رکھا مجھے محسوس ہوا کہ مجھ پر بجلی آ گری ہے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں اپنی جگہ پتھر کے مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا۔

میرا بریف کیس غائب تھا۔ پھر جلد ہی میری سبھ میں آ گیا کہ اس بریف کیس کو کس نے چرایا ہے؟ شاید پرویز؟ میری نظروں کے سامنے کونسا لپکا۔ ”وہ دفتر میں افراتفری سے فائدہ اٹھا کر اپنی فائل کے چکر میں پھینا ادھر آیا ہوگا۔“ میں

نے سوچا۔ ”اس نے مجھے فائل بریف کیس میں رکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بریف کیس کیونکہ منتقل تھا اس لیے وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا تاکہ اسے کھول کر فائل نکال سکے۔“ میں چند لمحے کرسی پر بیٹھا سوچتا رہا پھر میں نے میز کی دراز کھول کر دیکھی وہاں اس کی فائل موجود تھی۔

”اب بھی بازی میرے ہاتھ میں ہے۔“ میں نے کئی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر سوچا اور دل کو تسلی دی پھر میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا کہ ہم دونوں یکساں پوزیشن میں ہیں کیوں نہ ہم دونوں مل کر آپس میں اس رقم کو بانٹ لیں بھاگتے چور کی لنگوٹی سہی۔ ایک لاکھ تیس ہزار روپے ہر ایک کے حصے میں آئیں گے۔ کپنی کا قرض ادا کرنے کے بعد اسی ہزار روپے بچ جائیں گے۔ بیوی کی اور اپنی گاڑی بیچ کر میں ایک لاکھ روپے کی رقم حاصل کر لوں گا۔ ایک ہی گاڑی میں دونوں گزارا کر لیں گے۔

جس وقت میں نے شاید پرویز کے دروازے پر دستک دی رات ہو رہی تھی۔ دروازہ کھلا تو شاید پرویز کا دمکا ہوا چہرہ ابھرا۔ وہ مجھے اپنی نظروں کے سامنے دیکھ کر بھونچا رہ گیا۔ دوسرے لمحے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا پھر کسی خیال نے اس کے چہرے پر ممتی خیز مسکراہٹ پھیر دی۔ وہ بات کی تہہ میں پہنچ گیا تھا۔

”آئیے سر!“ اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔ جب ہم نشست گاہ میں پہنچ کر بیٹھ گئے تو اس نے متانت سے غمگینا۔ ”سر! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“

میں نے سوچا کہ بغیر کسی تمہید اور لگی لپٹی کے صاف صاف بات کر لینا چاہیے۔ میں سرد مہری سے بولا۔

”میں بریف کیس لینے آیا ہوں۔“ میں نے محسوس کیا کہ میرا لہجہ بہت سخت ہو گیا ہے میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ چوری ایک مذموم فعل ہے لیکن مجھے آئینے میں اپنا چہرہ نظر آ گیا۔ میں نے سنبھل کر لیجے کو نرم کر کے کہا۔

”صبح تمہارے ساتھ میں نے زیادتی کر دی تھی میں نہ صرف تمہیں معاف کرنے کو تیار ہوں اگر تم مجھے بریف کیس دے دو تو میں وہ فائل دبا دوں گا جو تمہارا مستقبل.....“

”بریف کیس؟“ اس نے ایک طنز آمیز تہقیر لگایا۔ ”مگر سر! میرا مستقبل تو محفوظ ہو چکا ہے لیکن آپ کا بریف کیس..... دریائے رادی کی گہرائیوں میں جا پہنچا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ بڑا کراٹھ کھڑے ہوئے۔

”جس وقت میں آپ کا بریف کیس اٹھا کر دفتر کے عقبی راستے سے باہر آیا تو میرے دل کو ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔“ شاید پرویز کہنے لگا۔ ”اس کا کھولنا ایک مسئلہ تھا اس مسئلے کا حل میں نے یہ نکالا کہ اسے جاکر دریائے رادی کی لہروں کی نذر کر دیا۔ سارے مسئلے ایک ہی وقت میں ختم ہو گئے۔ میری فائل اور آپ کا بریف کیس دونوں ہی.....“



گنگا کی بجاری

ایسے حمید

جہ ہمیں بارش اور جنگلات کے ساتھ مقدس مقام کا تذکرہ آتا ہے۔ دھن میں صری اور صری اہل حق شخصیت کا تصور اور پھر چھن سے آتا ہے وہ تصور اور پھر محترم اے حمید کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ذریعہ رحمت سے ان کے بارے میں نئے افاق کے مدہ اور معروف کائنات کا اظہار معلوم مرحوم فرمایا کرتے تھے۔ اے حمید بارش کے مندرجہ کتب کرتے ہیں تو کسے میں ہندو فارے کو مخصوص ہوتا ہے کہ باہر بارش لپا تہ بہرے رہے اور جہ وہ لہوہ کا دھڑ کرتے ہیں تو لہوہ کے خوب ہو چاروں طرف پھیلے مخصوص ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ جانو گھر تھے جو اپنے تئیں دھڑے دھڑے چلے گئے اپنے صحر میں جکر رہتے ہیں۔

زیر نظر ناول ہم اے حمید کا مضمون نامہ جنوبی ہند ہے۔ جس میں اہم کو اینڈونچر منظر ہنس کے ساتھ ماحول و جہتوں کے لہانے بھی ملتے ہیں۔

ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہی جاپانی افسر جس کے سامنے ہم دونوں کو پیش کیا گیا تھا زہریلی لڑکی پاروتی کے رات کے وقت بارک کے کونے میں واقع کمرے میں تھا کہ آدھی رات کے بعد اچانک اس کی چیخنے کی آواز آئی۔ سپاہی دوڑ کر اندر گئے۔ دیکھا کہ جاپانی افسر کا بدن کسی زہر کے اثر سے کالا پڑتا جا رہا تھا اور لڑکی غائب تھی۔ پاروتی کے ساتھ اس جاپانی افسر نے دست دراز کی کی کوشش کی ہوگی اور پاروتی نے اس کے جسم میں ڈر ساناخن چھو کر اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہوئی کہ پاروتی فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اگر وہ فرار نہ ہوئی تو یہ جاپانی اس کو جس طرح اذیت دے دے کر ہلاک کرتے اس کی شاید کہیں مثال نہ ملتی۔

پہلے والا جاپانی افسر مر گیا تھا۔ اس کے بدن میں پاروتی نے ناخن چھو کر ان تمام سانپوں کا تھوڑا تھوڑا ہر داخل کر دیا تھا جو اس نے آج تک

چاروں طرف سے ترپال سے ڈھکا ہوا تھا۔ ایک جاپانی سپاہی رانگل لیے میری نگرانی کے لیے ٹرک میں بیٹھ گیا تھا۔ ٹرک چھروں پر اچھلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ کہیں اترا لی آجاتی کہیں چڑھاتی شروع ہو جاتی۔ مجھے شاید کسی جنگی قیدیوں کے کیپ میں منتقل کیا جا رہا تھا۔ یہ سوچ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ کم از کم اب مجھ پر مزید تشدد نہیں کیا جائے گا اور میں دوسرے جنگی قیدیوں کے ساتھ رہوں گا۔

ساری رات ٹرک پہاڑی جنگلاتی علاقے میں چلتا رہا۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی کہ ٹرک ایک موڑ پر

کر کچھ دور جا کر رک گیا۔ جو سپاہی میری نگرانی کر رہا تھا اس نے اٹھ کر ترپال کا پردہ ہٹا دیا اور تیز لہجے میں مجھے باہر نکلنے کا حکم دیا۔ میرے ہاتھ پاؤں کھلے تھے۔ میں ٹرک سے نیچے کود گیا۔ وہاں پہلے سے تین چار جاپانی فوجی کھڑے تھے۔ کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ کوئی بڑا فوجی کیمپ تھا۔ کئی فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ لمبی لمبی بارکیں تھیں۔ مجھے کوادرٹ گارڈ میں بند کر دیا گیا۔ صبح ہوئی تو مجھے ایک جاپانی فوجی افسر کے آگے پیش کیا گیا۔ یہاں میرے بارے میں پوری رپورٹ پہلے سے پہنچ چکی تھی۔ یہ جاپانی افسر شاید مجھ کے رینک کا تھا۔ اس کی عمر بھی زیادہ تھی۔ سر نہ تھا تھا۔ وہ میرے پاس آگے لمبی سی تلوار رکھے بیٹھا تھا۔ میری طرف گھور گھور کر دیکھتا رہا پھر تلوار لے کر اٹھا۔ میرے پاس آیا۔ میں فرش پر بیٹھا تھا۔ تلوار میری گردن پر رکھی۔ میرا سانس خشک ہو گیا۔ میں نے کن کنکھتا تھا کہ جاپانی جنگی قیدیوں کی گردنیں تلوار سے اڑا کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ اس نے دو تین بار تلوار میری گردن کے ساتھ لگائی۔

میں خاموشی سے چاول کھانے لگا۔ بھوک لگی ہوئی تھی۔ سارے چاول کھا گیا۔ سپاہی ٹین کے ڈونگے میں میرے لیے پانی لے آیا۔ میں نے پانی پیا اور دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد جاپانی میجر کرسی پہنچ کر میرے پاس آ گیا اور اس نے مجھ سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ وہ بڑے شریفانہ انداز میں مجھ سے سوالات پوچھ رہا تھا۔ سوال یہی تھا کہ زہریلی لڑکی کون تھی؟ اس کے پاس زہر والا انجکشن کہاں سے آیا تھا۔ اور برٹش انڈیا کی فوج میں آسام کے بارڈر پر کہاں کہاں پر موجود ہیں؟ زہریلی لڑکی کے بارے میں میں نے اس کے آگے بھی یہی بیان دیا کہ وہ مجھے سنسنی پھیلانے کے ڈیرے پر لی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اس کے پاس زہر والا انجکشن کہاں سے آیا تھا۔ اور برٹش انڈیا کی فوجوں کے متعلق بھی میں نے اپنی لامبھی کا اظہار کیا۔ پہلے تو جاپانی میجر بڑے سکون سے میری باتیں سنتا رہا۔ اچانک کرسی چھوڑ کر اٹھا اور مجھ پر ٹھنڈوں اور گھونٹوں کی بارش کر دی۔

جب وہ مجھے مارتے مارتے تھک گیا تو اس نے

نے سپاہی کو بلا کر کچھ کہا۔ سپاہی مجھے گھسنے ہوئے بارک کے پیچھے جہاں جھاڑیاں اور درخت تھے لے گیا۔ یہاں زمین میں چارنٹ اوپنے ہانس گاڑ کر ایک پنجرہ بنایا ہوا تھا۔ یہ قین فٹ چوڑا تھا۔ اس پنجرے میں مجھے بند کر دیا گیا۔ باہر زنجیر چھا دی گئی۔ موٹے موٹے ہانس بالکل ساتھ ساتھ جوڑے گئے تھے۔ میں نہ بازو پوری طرح کھول سکتا تھا نہ ٹانگیں پھیلا سکتا تھا۔ باہر پھر بھی بارکوں کی دھند سی روشنی وہاں تک آرہی تھی مگر پنجرے کے اندر گھپ اندھیرا تھا اور میں گھٹنے سینے سے لگائے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کیا یہ اذیت میں زیادہ دیر تک برداشت کر سکوں گا۔

میں جانور کی طرح پنجرے میں بند تھا۔ جانور پھر بھی پنجرے میں ٹھہر رہتا ہے مگر میں تو ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ کچھ دیر تو بیٹھا رہا پھر گھٹنوں میں آنکھیں شروع ہو گئی۔ میں پوری ٹانگیں نہیں پھیلا سکتا تھا۔ عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ لگتا تھا کہ یہ اذیت مجھ سے زیادہ دیر برداشت نہیں ہوگی۔ کچھ پتہ نہیں تھا کہ جاپانی کب تک مجھے اس پنجرے میں بند رکھیں۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ شروع رات میں بارکوں کی طرف سے جاپانی سپاہیوں کی آوازیں آ جاتی تھیں۔ جیسے جیسے رات گزرتی گئی یہ آوازیں آنا بھی بند ہو گئیں۔ پنجرے کے باہر جنگل کا سناٹا چھا گیا۔ میں بے بسی کے عالم میں تھوڑی گھنٹوں کے اوپر رکھے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ آنکھیں اس لیے بند کی تھیں کہ شاید نیند آ جائے اور کم از کم رات تو کئے۔ صبح یہ لوگ شاید مجھے یہاں سے نکال کر دوسرے قیدیوں کے ساتھ کسی بارک میں بند کر دیں۔

نیند کو سوں دور تھی۔ خدا کو یاد کرنے لگا۔ خدا سے دعا لگتی کہ یا اللہ پاک مجھے اس مصیبت سے نجات دلا۔ بظاہر نجات کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خدا جانے اسی طرح بیٹھے بیٹھے قینی رات گزر گئی ہوگی کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی کہ جیسے جھاڑیوں میں کوئی چل رہا ہے۔ میں سمجھا کہ کچھ چیتا یا کوئی دوسرا جنگلی جانور ہوگا۔ میں سکڑ کر پنجرے میں بیٹھا رہا۔ نہ پنجرے کے اندر کچھ نظر آ رہا تھا نہ پنجرے کے باہر کچھ نظر آ رہا تھا۔ جھاڑیوں میں کسی کے چلنے کی آواز پنجرے کے قریب آ کر رک گئی۔ میں نے موٹے ہانسوں میں سے دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں کوئی ایسی درختیں تھیں جس میں سے میں باہر دیکھ سکتا۔ پھر ایسا لگا جیسے کوئی زنجیر کھول رہا ہے۔ ضرور یہ جاپانی سپاہی ہے جو مجھے یہاں سے نکالنے آیا ہے۔ اتنے میں باہر سے کسی نے سرگوشی میں میرا نام لے کر کہا۔

”آواز نہ نکالنا میں پاروتی ہوں۔“
پاروتی کی آواز اور اس کا نام سن کر میرے جسم میں توانائی کی لہر دوڑ گئی۔ زہریلی لڑکی میری مدد کو پہنچ گئی تھی۔ خدا جانے وہ کہاں کہاں سے میرا پیچھا کرتی ہوئی یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ پنجرے کا چھوٹا سا دروازہ پیچھے ہٹ گیا۔ پاروتی نے سر اندر ڈال کر آہستہ سے کہا۔

”باہر آ جاؤ۔ جلدی کرو۔“
میں گھٹنوں کے بل چلتا پنجرے سے باہر آ گیا۔

زہریلی لڑکی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتی ہوئی جھاڑیوں اور درختوں کے اندھیرے کی طرف دوڑ پڑی۔ میں بھی اس کے ساتھ لنگراتا ہوا

دوڑنے لگا۔ صرف ایک ہی ڈر تھا کہ پیچھے سے مشین گن کا فائر ہمیں بھون کر نہ رکھ دے۔ مگر جاپانی کیمپ پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پاروتی خود بھی جھاڑیوں میں دوڑ رہی تھی اور مجھے جتنی دوڑا رہی تھی۔ بادش کی وجہ سے جھاڑیاں کیلی تھیں۔ اس کے دوڑنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے پتہ ہے کہ کہاں جانا ہے۔

یہ بھی نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ اندھیرے میں درختوں کے ہولے دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ میں نے دوڑتے دوڑتے پاروتی سے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ آگ کہیں جاپانیوں کی کوئی پوسٹ نہ ہو۔ پاروتی اب تیز تیز چل رہی تھی۔ مجھے ڈانٹتے ہوئے بولی۔

”ابھی مت بولو نوچ رہو۔“

میں چپ ہو گیا۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ جنگل میں اندھیرا اور سناٹا تھا۔ جنگلی جھاڑیوں والی ڈھلان اترنے کے بعد کھلی جگہ آ گئی۔ اندھیرے میں کیلے کے درختوں کے جھنڈ ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ پیچھے سنبھل کے درختوں کو میں رات کے اندھیرے میں بھی پہچان لیتا تھا۔ ان درختوں کو آج بھی میں دور سے پہچان لیتا ہوں۔ اب تو یہ درخت کمن آباد میں بھی لوگوں نے اپنے گھروں کے آگے لگا دیے ہیں جو بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ درخت اوپر سے جتنا بڑا ہو کر پھیل جاتا ہے زمین کے نیچے اس کی جڑیں اس سے بھی زیادہ پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور مکانوں کے فرشوں اور دیواروں کو اکھاڑ دیتا ہیں۔ سندر بن کے جزیروں میں بھی سنبھل کے درختوں کے بے شمار ذخیرے ہیں۔ یہ دو قسم کے درخت ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے درخت پر موسم موٹے سرخ رنگ کے پھول لگتے ہیں۔

دوسری قسم کے درخت پر لوکاٹ کے رنگ کے پھول لگتے ہیں۔ دوسری قسم کے سنبھل کے درخت جنگلوں میں بھی کم دیکھتے ہیں آتے ہیں۔ بہر حال میں اس جنگلی لڑکی پاروتی کے پیچھے ان درختوں کے درمیان سے زورنا آگے چلا جا رہا تھا۔ سنبھل کے درختوں کا ذخیرہ ختم ہوا تو آگے ایک دریا آ گیا۔

پاروتی نے مجھے دریا کنارے ایک جگہ بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود قریبی جھاڑیوں میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک چھوٹی سی سیان یعنی کشتی کو کھینچتی ہوئی کنارے پر لے آئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”آ جاؤ۔“

کشتی دریا کے کنارے پانی میں کھڑی بچکولے کھا رہی تھی۔ میں نے پاروتی کو پہلے بٹھانے کی کوشش کی تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

”یہ باتیں رہنے دو کشتی میں بیٹھو۔“

میں کشتی میں بیٹھ گیا۔ پاروتی نے کشتی کو پانی کے اندر تھوڑا سا ہلکا اور پھر خود بھی چھلانگ لگا کر کشتی کے اندر آ گئی۔ کشتی میں دو چھوٹے بڑے تھے۔ وہ چھو چلا رہے تھے کشتی کو کنارے سے دور لے گئی اور پھر کشتی پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہنے لگی۔

میں نے پاروتی سے پوچھا۔

”یہ کونسا دریا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”پدریا کی ایک شاخ ہے۔ اصل

دریا تو یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کیا اب میں بات کر سکتا ہوں؟“

پاروتی بولی۔ ”ابھی خاموش ہی رہو تو بہتر

ہے۔ جاپانی رات کو یہاں کسی نہ کسی طرف سے نکل آتے ہیں۔“ کوئی آدھے گھنٹے تک کشتی دیا کے رخ پر بہتی رہی۔ اس کے بعد ایک جگہ پہنچ کر پاروتی نے کشتی کو دوسرے کنارے کی طرف چلانا شروع کر دیا۔ میں نے پاروتی کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی تو پاروتی لڑکی کہنے لگی۔

”دریا کا بڑا زور ہے تم کشتی نہیں چلا سکو گے۔“ وہ بڑی مہارت سے چپو بھی دایں اور بھی بائیں طرف چلائی کشتی کو دوسرے کنارے کی طرف لے جانے لگی۔ دوسرے کنارے پر اندھیرے میں گھنے درختوں کے جھنڈ سیاہ ٹیلوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اس نے کشتی کو کنارے پر لا کر ایک جھاڑی کے قریب کیا۔ ہم کشتی سے اتر پڑے۔ اس نے کشتی کو اوپر ریت پر کھینچ لیا۔ کشتی کو اوپر کھینچنے میں میں نے ضرور اس کی مدد کی۔

وہ مجھے ساتھ لے کر ایک بار پھر گھنے جنگل میں گھس گئی۔ یہاں درخت ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ ہم رک رک کر راستہ دیکھ کر اور کہیں راستہ بنا کر چل رہے تھے۔ درختوں کے جھنڈ ختم ہوئے تو مجھے اندھیرے میں ایک بارہ دری سی نظر آئی۔ یہ کسی بارہ دری کا کھنڈ تھا۔ اس کے باہر ایک قطار میں کچھ بت زمین سے آدھے باہر نکلے ہوئے تھے۔ بارہ دری کے کھنڈ میں آ کر ہم بیٹھ گئے۔ میں اس بات پر بڑا حیران تھا کہ پاروتی اتنی جلدی سے جاپانی کیمپ سے نکل کر یہاں دوسرے بڑے کیمپ میں کیسے پہنچ گئی۔ جبکہ دونوں کیمپوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا اور جس ٹرک میں مجھے بٹھا کر یہاں لایا گیا تھا وہ تقریباً ساری رات جنگل میں چل رہا تھا۔ جس میں میں نے

پاروتی سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھوں میں مجھے سانپ کی آنکھوں والی سرخی اور چمک نظر آئی۔ کہنے لگی۔

”یہ ایک ایسا راز ہے جو میں تمہیں نہیں بتاؤں گی۔ تمہیں بتایا بھی تو تم یقین نہیں کرو گے۔ اس لیے یہ سوال پھر نہ کرنا۔“

میں نے یہ سوال اس سے دوبارہ نہ پوچھا۔ وہ مجھے بتانے لگی کہ وہ جاپانیوں کی قید سے کیسے فرار ہوئی۔ ہوا کہ جب ہمیں الگ الگ کوٹھڑی میں بند کروایا گیا تو رات کے وقت جاپانی کیمپن پاروتی کی کوٹھڑی میں آ گیا۔ اس نے پاروتی کے ساتھ دست دراز کی۔ پاروتی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس نے صرف اتنا ہی کیا کہ اپنی ایک انگلی کا ناخن جاپانی کیمپن کی گردن میں چبھو دیا۔ جاپانی فوجی نے کوئی خیال نہ کیا۔ وہ یہی سمجھا کہ پاروتی پر ایک خاص کیفیت طاری ہو چکی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا سانس اکھڑنا شروع ہو گیا۔ یہ ایک سانپ کا نہیں بلکہ سیکڑوں سانپوں کا زہر تھا جو پاروتی نے جاپانی کیمپن کے خون میں شامل کر دیا تھا سب سے پہلے اس کا گلا بند ہوا۔ وہ گئے کو پکڑ کر باہر کی طرف دوڑا مگر سانپوں کے زہر نے اسے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ دروازے تک پہنچ سکے۔ وہ دروازے کے ساتھ جا کر زور سے گرا۔ اس وقت باہر ایک سنتری پہرہ دارے رہا تھا۔ اس نے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی تو دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اس دوران پاروتی نے روشنی گھا کر دی تھی۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ جیسے ہی جاپانی سنتری اندر آیا پاروتی اندھیرے میں سانپ کی طرح رنگینی باہر نکلتی گئی۔ اس کا ایک ہاتھ کوٹھڑی سے

باہر نکلتا ہی بہت تھا۔ وہ بارک کے پیچھے سے ہو کر خاردار تاروں سے نکل کر جنگل میں گھس گئی اور اندھیرے جنگل نے اسے اپنے اندر چھپا لیا۔ جس طرح سانپ کو زمین جگہ دے دیتی ہے اسی طرح پاروتی کو بھی جنگل اپنے اندر چھپا لیتا تھا۔ اس کے بعد وہ وہیں جنگل میں کیمپ کے آس پاس منڈلاتی رہی۔ کیونکہ وہ مجھے بھی وہاں سے نکالنا چاہتی تھی۔ بقول اس کے صبح تک وہ کیمپ کے قریب ایک درخت پر چڑھ کر تکیہ ہی رہی۔ جب مجھے بارک سے نکل کر فوجی ٹرک میں سوار کرایا گیا تو وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد وہ ٹرک کے تعاقب میں چل پڑی۔ یہاں سے آگے پاروتی نے مجھے بالکل نہ بتایا کہ وہ میرا تعاقب کرتے ہوئے کس طرح موجودہ فوجی کیمپ تک پہنچی۔ کہنے لگی۔

”جب اس فوجی کیمپ میں جاپانیوں نے ہمیں ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا تو میں ہمیں درختوں کے پیچھے چھپی دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد میں جنگل میں سانپوں کی تلاش میں نکل گئی۔ یہاں مجھے تین بزرگ رنگ کے سانپ مل گئے۔ میں نے ان سے اپنے آپ کو ڈسوا لیا اور انہیں کھا کر اپنی بھوک مٹائی۔ سانپوں نے ڈسوانے کے بعد مجھ پر ایک خاص قسم کی خمداری چڑھ جاتی ہے میں وہیں جنگل میں گھاس پر سو گئی۔ جس وقت آکھ کلی تو رات ہو گئی تھی۔ میں دوڑ کر کیمپ کے قریب جو درخت تھے وہاں آ گئی۔ یہاں سے مجھے وہ بارک بجلی کے لمب کی روشنی میں صاف نظر آ رہی تھی جس کی ایک کوٹھڑی میں جاپانیوں نے ہمیں قید کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہمیں کوٹھڑی سے باہر لایا جا رہا ہے۔ جاپانی سپاہی ہمیں بارک کے پیچھے لے گیا جہاں اس نے ہمیں پائس کے بیجرے میں بند کر دیا۔

میں نے رات گہری ہو جانے کا انتظار کیا۔ پھر کیمپ کے گرد لگی ہوئی خاردار باز دی کے نیچے ایک جگہ زمین کھود کر ایک گڑھا بنایا اور اسی گڑھے میں سے گزر کر تم تک پہنچی اور تمہیں وہاں سے نکال لیا۔“ میں نے پاروتی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم مجھے وہاں سے نہ نکالتی تو بیجرے میں پڑے پڑے صبح تک میرا برا حال ہو جاتا۔ میں تو چلنے پھرنے کے قابل بھی نہ رہتا۔“

پاروتی چونکی ہو کر اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی سانپوں والی چھٹی حس اسے کسی خطرے سے آگاہ کر رہی ہے۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔

”کیا بات ہے پاروتی؟“

اس نے میرا بازو دھکڑا اور مجھے اپنے ساتھ بارہ دری سے نکل کر ان بتوں کے پیچھے لے آئی جو آدھے باہر نکلے ہوئے تھے۔ ہم ان سمسوں کی آڑ لے کر بیٹھ گئے۔ یہ گول گول سردوں والے کانی بڑے انسانی جسمے تھے۔ ان کے اوپر وہ کانی گھنٹی جنگلی گھاس لگی ہوئی تھی۔

پاروتی بڑے غور سے بارہ دری کے کھنڈر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندھیرے میں کوئی خاص شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس خیال سے پاروتی سے بھی نہیں پوچھ رہا تھا کہ یہ پھر مجھے ڈانٹ دے گی کہ خاموش رہو۔ اتنے میں مجھے ایک انسانی سایہ نظر آیا۔ یہ سایہ درختوں سے نکل کر بارہ دری کے کھنڈر کے پاس آ کر رک گیا۔ یہ ایک آدمی تھا اندھیرے میں اس کا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جھک کر بارہ دری کے باہر کچھ تلاش کرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ پاروتی لیے لیے پسے ہوئی ہے۔

میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا وہ میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ٹاک سے سانس لینے کی بجائے منہ کھول کر لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ انسانی ہولناک کنڈر کے ارد گرد چکر لگانے لگا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی شے کی تلاش میں ہے۔ پاروتی مسلسل منہ سے سانس لے رہی تھی۔ ایک دو منٹ کے بعد انسانی ہولناکیاں اس طرف سے آیا تھا اسی طرف درختوں میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کچھ دیر تک اسی طرح پاروتی منہ کھول کر سانس لیتی رہی پھر اس نے منہ بند کر لیا اور بولی۔

”یہ میرا دشمن تھا۔ میری بو پا کر ادھر آیا تھا۔“

میں نے آہستہ سے کہا۔

”تو پھر وہ یہاں کیوں نہیں آیا؟“

پاروتی نے کہا۔ ”میں نے اپنی بوروک لی تھی۔ میری بو میرے جسم سے بہت کم اور اندر سے بہت زیادہ نکلتی ہے۔ جب میں ٹاک کے ذریعے سانس لیتی ہوں تو میرے خون کی زہریلی بو بہت زیادہ مقدار میں باہر آتی ہے لیکن جب میں سانس لینا بند کر کے منہ سے سانس لیتی ہوں تو میرے خون کی بو اتنی دھیمی ہو جاتی ہے کہ کوئی آدمی پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر سے بھی میری بو نہیں سونگھ سکتا۔“

میں پاروتی کی اس قسم کی باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔ میں نے صرف اتنا پوچھا کہ یہ تمہارا دشمن کون تھا اور تمہاری بو کے پیچھے کیوں لگا ہوا تھا؟ وہ سانس لے کر بولی۔

”انسان جس حال میں بھی ہو اس کے دشمن اس کا پچھتا نہیں چھوڑتے۔ میں دنیا والوں سے دور اس جنگل میں در بدر پھر رہی ہوں۔ یہاں بھی میرا کوئی نہ کوئی دشمن میری تلاش میں نکل آتا ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ ”کیا تم اس کو ناخن چھو کر ہلاک نہیں کر سکتی تھیں؟“

پاروتی نے کہا۔ ”مہاناگی سپیرے پر دنیا کے زہریلے سے زہریلے سانپ کا زہر بھی اثر نہیں کر سکتا۔ اس علاقے میں شاید دو یا تین مہاناگی سپیرے ہوں گے۔ یہ لوگ بڑے بڑے چلے کاٹ کر اور بڑے بڑے زہریلے سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسوا کر مہاناگی کا مقام حاصل کرتے ہیں۔ اگر وہ میرے بدن میں اپنا ناخن چھو دیتا تو میں ہلاک ہو سکتی تھی۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ میں نے پوچھا۔

”مگر ہم کس طرف جائیں گے؟ یہاں تو چاروں طرف لگتا ہے جاپانیوں کا قبضہ ہے جس طرف بھی جائیں گے خطرہ ہے کہ جاپانی ہمیں پکڑ لیں گے۔“

پاروتی بولی۔ ”میں ان جنگلوں سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ لگتا ہے کہ ہم جنوبی آسام میں ایک بڑے جنگل میں نکل آتے ہیں۔ پھر بھی میرا ہندازہ

کے مطابق اگر ہم اوپر کی طرف پہاڑیوں میں چلتے جائیں تو دو تین دنوں میں بنگال پہنچ جائیں گے۔“

میں خود بنگال یعنی نکلنے پہنچنے کے لیے بے چین تھا۔ میں ان سپیرے سپیروں ناگ ناگوں اور جنگلی قیدیوں کے کیمپوں سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر تقدیر مجھ پر ہنس رہی تھی۔ کیونکہ میرے نامہ اعمال میں بھی ایسے ایسے سسنی خیز اور خطرناک واقعات لکھے ہوئے تھے کہ آج ان کو یاد کرنا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ میں زندہ کیسے بچ گیا۔

میں نے اور پاروتی نے ملے یہی کیا کہ کسی نہ کسی طرح رات اسی جنگل میں گزار دی جائے اور صبح کا اجالا ہوتے ہی ان پہاڑیوں کی طرف چلنا شروع کروا جائے جو اس کے اندازے کے مطابق بنگال کے جنگلوں کی طرف نکل جاتی ہیں۔

مہاناگی سپیرا اگرچہ چاچکا تھا اور بظاہر اس کے داغیں بارہوری کے کنڈر کی جانب آنے کا امکان نہیں تھا لیکن اس کے باوجود میں نے دیکھا کہ زہریلی لڑکی پاروتی پر اس کی دہشت ابھی تک چھائی ہوئی تھی۔ کہنے لگی۔

”یہاں باقی رات گزارنی ٹھیک نہیں۔ ہم یہاں سے آگے جا کر باقی رات گزارنے کا کوئی ٹھکانہ تلاش کرتے ہیں۔“

میں نے کہا تم جھوپڑی میں سو جاؤ۔ میں باہر سو جاتا ہوں۔“

پاروتی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے جھوپڑی سے ہٹا دیا۔ ”نہیں تم جھوپڑی کے اندر سو گے۔ میں باہر سوں گی۔“

میں سمجھ گیا کہ اسے ابھی تک مہاناگی کا خطرہ لگا ہوا ہے کہ کہیں وہ اس کو تلاش کرتا ہوا ادھر نہ آجائے۔ اس کے دل میں مہاناگی سپیرے کا جو ڈر و خوف بیٹھا تھا اس سے لگتا تھا کہ وہ پاروتی کو اپنے قبضے میں کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ میں نے اپنا بازو دھڑلاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے تم باہر ہی سو جاؤ۔“

اور میں جھوپڑی کے اندر چلا گیا۔ یہاں سوائے اندھیرے زمیں پر سوکھے پتوں اور چھجروں کے اور کچھ نہیں تھا مگر اب جنگل کے پھر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑتے تھے۔ میرا جسم ان کا عادی ہو گیا تھا۔ برسات کی وجہ سے جنگل کی رات مرطوب اور خشک تھی۔ جبکہ جھوپڑی کے اندر ٹکی ٹکی گرماہٹ تھی۔ میں خشک پتوں پر لیٹ گیا۔ ایک طرح سے میں بھی جنگلوں میں پھرتے

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہم وہاں سے اٹھے اور دوسری طرف نیچے ڈھلان اتر کر ایک چھوٹی سی ندی کے پاس آ گئے۔ ندی رات کے اندھیرے میں خاموشی سے بہ رہی تھی۔ بڑے غور سے دیکھنے پر اس کا پانی نظر آتا تھا۔ ہم ندی کے ساتھ ساتھ آگے ہوئے درختوں میں چلتے رہے۔ ایک جگہ ندی میں پانی کا چھوٹا سا پل بنا ہوا تھا۔ ہم

پھرتے آدھا جنگلی ہو گیا تھا۔ پاروتی کے ساتھ دوڑ دوڑ کر چل چل کر تھک گیا تھا۔ پتھروں نے حملہ کر دیا مگر میں بڑی جلدی سو گیا۔ مجھے کوئی خبر نہیں تھی کہ پاروتی باہر کہاں جا کر سوئی ہے۔ سوئی بھی تھی یا مہانا کی سپیرے کے ڈر سے کسی جگہ چھپ کر بیٹھ گئی تھی۔

میرا خیال ہے میں بڑی مشکل سے آدھا گھنٹہ سویا ہوں گا کہ کسی نے مجھے بازو سے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جھونپڑی کے اندر اندھیرے میں میرے اوپر کوئی آدھا جھکا ہوا ہے۔ میں نے اپنے حواس درست کرتے ہوئے کہا: ”کون ہو تم؟“

”چپ رہو۔“ یہ اس آدمی کی آواز تھی جو میری گردن پر ہاتھ رکھے ہوئے باس ہی پھنسا ہوا تھا۔ اس نے میری گردن کو چھوڑ کر میرے گریبان کو پکڑتے ہوئے سخت لمبے میں پوچھا۔

”ناگن لڑکی کہاں ہے؟“ وہ مجھے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ یہاں اندھیرے میں کچھ نہ کچھ نظر آ رہا تھا۔ میں اس آدمی سے زیادہ طاقتور تھا۔ میں نے لپک کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اس نے بجلی ایسی تیزی کے ساتھ اپنا ہاتھ جیب میں ڈالا اور جب باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک سانپ تھا۔ جس نے اپنا پھن کھول رکھا تھا۔ اس نے سانپ میرے چہرے کے قریب کیا تو میں نے ڈر کر اس کی گردن چھوڑ دی۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور دوسرا سانپ والا ہاتھ میری آنکھوں سے کوئی ایک فٹ کے فاصلے پر اٹکھڑا کر دیا۔

”جلدی بتاؤ ناگن لڑکی کہاں ہے؟ نہیں تو یہ سانپ تمہاری زندگی ختم کر دے گا۔“ میں نے کہا: ”وہ میرے ساتھ تھی کہنے لگی تم جھونپڑی میں سو جاؤ میں باہر سو جاتی ہوں۔ سنیں نہیں ہوگی۔“

مہانا کی نے ویسے ہی لمبے لمبے سانس لے کر فضا کو سونگھا اور بولا۔ ”اس کی بو نہیں آ رہی وہ کدھر گئی ہے۔ جلدی بتاؤ۔“ اور اس نے سانپ کا پھن مزید میرے قریب کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ پاروتی کی بو اس لیے نہیں آ رہی کہ وہ ناک بند کر کے سانس لے رہی ہوگی۔ وہ ضرور آس پاس ہی موجود تھی۔ میں نے کہا۔

”میں کچھ نہیں جانتا وہ کہاں ہے۔ تم جا کر دیکھو وہ سامنے والے درختوں کے نیچے سو رہی ہوگی۔“

ابھی یہ فقرہ میں نے ادا ہی کیا تھا کہ ایک چیخ کی آواز کے ساتھ پاروتی درختوں میں سے نکل کر سامنے آ گئی۔ اس کے منہ سے پھنکار ایسی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے کہا۔

”اس کو چھوڑ مہانا کی میں ناگن پاروتی تمہارے سامنے آ گئی ہوں۔“

مہانا کی سپیرے کی آنکھیں اندھیرے میں چمک اٹھیں۔ اس نے میری گردن فوراً چھوڑ دی اور پاروتی کو بالوں سے پکڑ لیا۔ پاروتی کے جسم میں جیسے جان ہی نہ رہی۔ وہ نیم مردہ سی ہو گئی۔ مہانا کی سپیرا اسے کھینچتا ہوا ایک طرف چل پڑا۔ میں ان دونوں کو دیکھتا ہی رہ گیا اور جنگل کے اندھیرے نے ان دونوں کو اپنے اندر گم کر لیا۔ جب سپیرا مہانا کی پاروتی کو لے کر جنگل کے اندھیرے میں میری نظروں سے اڑھل گیا تو

اچانک مجھے خیال آیا کہ اس لڑکی پاروتی نے محض میری جان بچانے کے لیے اپنے آپ کو مہانا کی کے حوالے کر دیا ہے۔ اس کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔ میں اس کی طرح یہاں منہ اٹھائے کس لیے کھڑا ہوں۔ خدا جانے یہ سپیرا اس کے ساتھ کیا کرنے والا ہے؟ کیونکہ پاروتی نے مجھے بتایا تھا کہ مہانا کی بڑے چلے کاٹ کر اور بے شمار ہریلے سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسوا کر مہانا کی سپیرے کا مقام حاصل کرتے ہیں اور اگر وہ اپنا ناخن بھی میرے جسم میں چھو دے تو میں مر سکتی ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی میرے بدن میں بجلی کا کرنٹ سا دوڑ گیا۔ میں فوراً جدھر مہانا کی گیا تھا اوھر چل پڑا۔

اس طرف جنگل بڑا گھنا تھا۔ جھاڑیاں اور درختوں کی لگتی ہوئی شاخیں میرا راستہ روک رہی تھیں۔ گہر میں دیوانہ وار آگے بڑھتا چلا گیا۔ مشکل یہ تھی کہ پاروتی کو تو میری بو آ جاتی تھی مگر مجھے اس کی بو نہیں آتی تھی۔ بہت قریب سے میں اس کی بو محسوس کر لیتا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ بے شمار سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسوانے اور بے شمار سانپ کھانے کے بعد اس کے جسم نے ایک عجیب و غریب قسم کی بو چھوڑنی شروع کر دی تھی۔ میں کافی دیر تک جنگل میں چلتا رہا۔ مگر مہانا کی سپیرے کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ میں تھک کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ مجھے ایک یہ بھی خطرہ تھا کہ کسی طرف سے جاپانی سامی سامنے نہ آ جائیں۔ یہ علاقہ جاپانیوں کے قبضے میں تھا۔ وہ کم بخت مہانا کی پد نکلا پاروتی کو لے کر کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے ہمت نہ ہاری۔ میں نے پاروتی کی مدد کرنے اور اسے مہانا کی سے جھڑانے کی کوشش کھالی تھی۔

میں نے کچھ دیر آرام کیا اور اس کے بعد پھر چلنا شروع کر دیا۔

جنگل میں یہی ایک راستہ چلنے کا تھا۔ دوسرا کوئی راستہ بظاہر اندھیرے میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چلتے چلتے سامنے ایک چھوٹا سا ٹیلہ آ گیا۔ میں دبے دبے قدم اٹھاتا ٹیلے کے ساتھ ساتھ دوسری طرف گھوم گیا۔ اس خیال سے کہ اگر مہانا کی یہاں کہیں چھپا ہو تو اسے میرے قدموں ک آہٹ ہو شمار نہ کر دے۔ ٹیلے کے دوسری جانب اندھیرے میں مجھے جھاڑیوں کے درمیان ایک راستہ نیچے کھد میں اترتا نظر آیا۔ میں نے اندھیرے میں بڑے غور سے اسے دیکھا۔ یہ ایک قدرتی پگھلائی تھی۔ میں بڑی احتیاط سے نیچے اترنے لگا۔ کوئی پچاس ساٹھ فٹ نیچے اترنے کے بعد مجھے پانی کے پتھروں سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ جنگل میں جہاں پہاڑی چشمہ بہتا ہو تو اس کی ایک خاص قسم کی آواز آتی ہے۔ جیسے میں جنگلوں کا خانہ بدوش ہونے کی حیثیت سے بخوبی پہچانتا تھا۔ میں مزید نیچے اتر گیا۔

اب میں نے دیکھا کہ ٹیلے کے دامن میں ایک جگہ چشمہ بہ رہا تھا۔ یہ چشمہ پہاڑی نالے کی طرح تھا۔ اندھیرے میں پانی پتھروں سے ٹکرا کر بہتا۔ کسی کسی وقت ایک تھلکی سی دکھائی دیتا تھا۔ چشمے کے دوسرے کنارے پر ایک اونچی جگہ پر ایک چھیر سا جھکا ہوا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ چھیر ایک کوٹھڑی کا تھا۔ میں نے سوچا کہ چل کر دیکھنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے مہانا کی نے پاروتی کو اسی جگہ قید کر رکھا ہو۔ پتھروں پر اندھیرے میں پاؤں رکھ رکھ کر میں نے چشمے کو پار کیا اور دوسری جگہ پر آ کر اونچی جگہ پر چڑھ آیا۔ کوٹھڑی کا مجھے کوئی

دروازہ نظر نہ آیا۔ ایک طرف دیوار کو جنگلی بیلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں ان کی طرف بڑھا تو مجھے پاروتی کی دبی دلی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو۔“

آواز دیوار پر چڑھی ہوئی جنگلی بیلوں کے پیچھے سے آئی ہوئی معلوم ہوئی تھی۔ میں جلدی سے دیوار کی طرف آیا۔ جنگلی بیلوں کو ہاتھ سے پرے ہٹایا۔ تو وہاں دیوار میں ایک کھڑکی تھی۔ جس کے کوڑ بند تھے۔ میں نے بہت تلاش کیا مگر کھڑکی کے بندختوں میں ذرا سی بھی درز نہیں تھی۔ جہاں سے میں کوٹھڑی میں جھانکنے کی کوشش کرتا۔ پاروتی کی آواز پھر آئی۔

”تم جو بکو گے میں کروں گی۔ تم بے شک مجھے ناگن بنا کر پٹاری میں قید کر لو۔ مگر میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرنا۔“

اب مہاناگی سپرے کی آواز آئی۔ اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”میں نے تمہیں اس لیے نہیں پکڑا کہ تم پر رحم کروں یا تمہیں پٹاری میں بند کر کے رکھ لوں۔ یہ تو مجھ پر تک دیوتا کی بڑی مہربانی ہوئی ہے کہ پورے ایک جنم کی تلاش کے بعد تمہارے ایسی زہریلی ناگن لڑکی میرے ہاتھ لگی ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ وہی کچھ کروں گا جس کے لیے میں نے تمہیں پکڑا ہے۔“

پاروتی کے رونے کی آواز آئی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔

”یاد رکھا اگر تو نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا جو تم کرنے والے ہو تو تمہارا اگلا جنم بھوکا ہوگا۔ اور میں سورگ میں مہاناگ کے چرنوں میں تعویں گی

اور تمہارے واسطے بد دعائیں کروں گی پھر تمہارا ہر جنم مرنے کے بعد برے سے برا ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ تم دھرتی کے ساتھ میں پاتال کی دلدل میں جنم جنم تک رہتے رہو گے۔“

مہاناگی نے پھنکارا لیسی آواز نکال کر کہا۔

”میں جانتا ہوں میرا انجام کیا ہوگا۔ مگر میں تیرا انجام اسی طرح کروں گا جس طرح میں چاہتا ہوں۔ اب میں ناگ دیوتا کی آشیر باد لینے جا رہا ہوں۔ چھری میں اسی جگہ تمہاری سامنے رکھ کر جا رہا ہوں تاکہ تمہیں تمہاری موت اسی جگہ نظر آتی رہے۔ مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ تم خوب جانتی ہو کہ میں کس طرح یہاں سے جاؤں گا۔ اور تمہی جلدی واپس آ جاؤں گا۔“

اس کے ساتھ ہی کوٹھڑی کے اندر سے ایسی آواز آئی جیسے کہ سانپ نے زور سے پھنکار ماری ہو۔ اس کے بعد سنا اچھا گیا۔ ایک منٹ دو منٹ تین منٹ جب تین چار منٹ گزر گئے اور اندر سے نہ پاروتی کی آواز آئی اور نہ مہاناگی سپرے کی تو میں حیران ہوا کہ یہ بات کیا ہے کیا دونوں مر گئے ہیں۔ اتنے میں پاروتی کے سسٹنے کی اور آہستہ آہستہ بولنے کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”اے بھگوان میرے باپ معاف کر دے۔ تو جانتا ہے میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اگر سنتال کے سپرے مجھے ٹھکے سے اغوا کر کے نہ لاتے تو میں بھی اس حال تک نہ پہنچتی۔“

اور وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ مجھے ایسے لگا جیسے کوٹھڑی کے اندر پاروتی اکیلی ہے۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا میں نے مہاناگی کو کسی طرف سے بھی کوٹھڑی سے باہر نکلنے نہیں دیکھا تھا۔ اول تو کوٹھڑی کا کوئی دروازہ ہی نہیں تھا۔ چاروں طرف

پتھر کی دیوار تھی۔ صرف یہ ایک کھڑکی تھی جو چاروں طرف پتھروں سے بند کر دی گئی تھی۔ یہ کیا معرہ ہے۔ کیا مہاناگی سپرے اسو گیا ہے؟

پاروتی کی آواز پھر سنائی دی وہ اپنے بھگوان کے آگے پرارتھا کر رہی تھی۔

”بھگوان مجھے اس دنیا سے اٹھالے۔ جب تک مہاناگی واپس نہیں آتا مجھے موت دے دے۔“

میں چونک پڑا۔ اس کا مطلب تھا کہ سپرے اندر نہیں تھا۔ میں نے کھڑکی کے بندختوں کو ہاتھ سے بجاتے ہوئے کہا۔

”پاروتی کہا پاروتی۔“

پاروتی بولتے ہوئے ایک دم رک گئی۔ پھر اس کی خوشی سے کا پتی ہوئی آواز آئی۔ اس نے میرا نام لے کر کہا۔

”بھگوان کے لیے میری مدد کرو۔“

میں نے کہا میں اندر کس طرف سے آؤں؟ دروازہ کس طرف ہے؟

پاروتی نے جواب دیا۔ ”اس کھڑکی کو توڑ کر اندر آ جاؤ۔ کوٹھڑی کا دروازہ کوئی نہیں ہے۔“

میں نے کھڑکی کے تختوں کو کٹے مار مار کر توڑ دیا اور کوڑ کر اندر چلا گیا۔ اندر کوٹھڑی کا منظر یہ تھا کہ فرش پر موم بتی روشن تھی۔ پاروتی فرش پر رسیوں سے جکڑی ہوئی اس طرح سیدھی پڑی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں زمین میں ٹھکی ہوئی میٹوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور جسم پر ساڑھی جگہ جگہ سے لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے رسی کھولتے ہوئے کہا۔

”پاروتی مجھے معاف کر دینا میں تھک چکا ہوں۔“

دیر سے پہنچا۔

پاروتی بڑی گھبرائی ہوئی تھی اور بار بار کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جس کے تختے ٹوٹ چکے تھے۔ میں اس کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کھولنے میں مصروف تھا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”بھگوان کے لیے جلدی کھول مہاناگی آ گیا تو ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

جب میں نے ساری رسیاں کھول ڈالیں تو پاروتی جلدی سے کھڑکی کی طرف دوڑی اور بولی۔

”جلدی سے باہر آ جاؤ۔“

وہ کھڑکی سے دوسری طرف کود گئی۔ میں نے بھی اس کے پیچھے کھڑکی میں سے چھلانگ لگا دی۔ وہ چشمے کے ساتھ ساتھ اس طرف دوڑنے لگی جس طرف پانی کا بہاؤ تھا۔ میں بھی اس کی پیچھے بھاگ رہا تھا۔ کھلی جگہ تھی اور رات کے اندھیرے کا رنگ سلیمنی سلیمنی تھا۔ درخت دور دور تھے۔ جھاڑیاں زیادہ گھنی نہیں تھیں۔ ان سب چیزوں کے خاکے اندھیرے میں نظر آرہے تھے۔ چشمہ آگے جا کر ایک ندی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اور اس کے کنارے اونچے ہو گئے تھے۔ ایک جگہ پاروتی رک گئی۔ میں بھی اس کے پاس آ کر رک گیا۔ میں تو ہانپتے لگا تھا مگر پاروتی کا سانس اتنا پھولا ہوا نہیں تھا۔ ایک بار اس نے مجھے بتایا تھا کہ سانپوں کے کھانے اور ڈسوانے کی وجہ سے اس کا سانس زیادہ نہیں پھولتا۔ وہ فضا میں مندا تھا کہ کچھ سو گھنٹے کی کوشش کر رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ مہاناگی سپرے کی بوسو گھنٹے کی کوشش کر رہی تھی۔ جس طرف سے ہم بھاگ کر آئے تھے اس طرف منہ

کر کے بولی۔
 ”مہاناگی کی بواس طرف سے آرہی ہے۔“
 میں نے پوچھا۔ ”کیا وہ ہمارا پیچھا کر رہا ہے؟“
 ”نہیں۔“ پاروتی بولی۔ ”اس کی بو بہت دور سے آرہی ہے۔ ابھی وہ اس کوٹھڑی میں واپس نہیں آیا جہاں اس نے مجھے باندھ رکھا تھا۔“
 میں نے پوچھا۔ ”لیکن وہ تمہیں چھری سے کیوں کاٹنا چاہتا تھا؟ اور مہاناگی سپیرا کوٹھڑی سے باہر کیسے نکلتا تھا؟ کوٹھڑی کا تو دروازہ بھی نہیں تھا۔ ایک کھڑکی تھی جو تختے جوڑ کر بند کی ہوئی تھی؟“
 پاروتی نے میرا بازو پکڑ کر آگے کی طرف کھینچا اور بولی۔ ”یہ باتیں پھر بتاؤں گی۔ ابھی یہاں سے بھاگ چلو۔“
 ہم نے دوبارہ چشمے کی ندی کے اونچے کنارے پر دوڑنا شروع کر دیا۔ ندی جنگل میں ایک طرف گھوم گئی۔ ہم بھی اس کے ساتھ ہی اس طرف آگئے۔ یہاں ایک بار پھر ندی کے کنارے نیچے ہوتے ہوتے زمین کی سطح کے ساتھ لگ گئے۔ آگے پانی کے گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ پاروتی دوڑنے کی بجائے قدم قدم چلتی گئی۔ یہاں اس نے ایک دیوار پیچھے مڑ کر فضا کو منگھلا اور بولی۔
 ”اس کی بو نہیں آرہی۔ ہم خطرے سے نکل آئے ہیں۔“
 رات کے سلیٹی رنگ کے اندھیرے میں میں نے آنکھیں پھاڑ کر آگے دیکھا مجھے ایسا لگا جیسے ندی کا چوڑا پات کچھ دور جا کر غائب ہو گیا ہے۔ پاروتی نے بھی پانی کے شور کی آواز سن لی تھی۔
 ”کبے لگی۔“
 ”آگے کوئی آبشار ہے میرے پیچھے پیچھے آنا۔“
 ہم تھوڑی دور آگے گئے تو تھوڑی دور ندی کے چوڑے پات کا پانی ایک کافی بڑی آبشار کی صورت میں نیچے گر رہا تھا۔ نیچے کافی گہرائی اور پانی کے گرنے کا کافی شور بلند ہو رہا تھا۔ یہاں آگے جانے کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ پاروتی وہاں کھڑی ہو کر غور سے نیچے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔
 ”یہاں سے آگے ہم کیسے جائیں گے؟ میرا خیال ہے بائیں جانب چلے چلتے ہیں۔“
 وہ کہنے لگی۔ ”بائیں جانب گئے تو واپس مہاناگی کی نخوس کوٹھڑی میں پہنچ جائیں گے۔ ہمیں اسی جگہ سے نیچے اترنا ہوگا۔“
 اور وہ ادھر ادھر نیچے اترنے کا کوئی راستہ تلاش کرنے لگی۔ وہ اندھیرے میں مجھ سے زیادہ دیکھ لیتی تھی۔ سانپوں کی طرح اسے اندھیرے میں بھی نظر آ جاتا تھا۔ آخر اس نے ایک راستہ تلاش کر لیا۔ یہ ایک بہت بڑا درخت تھا جس کی جڑیں زمین سے نکل کر نیچے کافی دور تک چلی گئیں تھیں۔ یہ لمبی لمبی مضبوط جڑیں رسیوں کی طرح آبشار کے قریب ہی لٹک رہی تھیں۔ پاروتی نے کہا۔
 ”ہمیں ان جڑوں کو پکڑ کر نیچے اترنا ہوگا۔ کیا تم نیچے اتر سکو گے؟“
 میں نے کہا۔ ”اگر تم اتر سکتی ہو تو میں بھی اتر جاؤں گا۔“
 وہ ہنس پڑی اندھیرے میں اس کی چمتی آنکھیں اور ہنستا ہوا چہرہ مجھے صاف نظر آیا۔
 ”تو پھر میرے پیچھے آ جاؤ۔“
 اس نے ہلکے ہلکے قدموں کے پلو کو سنبھال لیا اور

درخت کی ایک لمبی جڑ کو پکڑ کر نیچے اترنے لگی۔
 میں نے درخت کی ایک دوسری جڑ کو پکڑا اور اس کے ساتھ ہی دیوار سے پاؤں لگا کر نیچے اترنے لگا۔ ہم پر آبشار کے گرتے پانی کی پھوار پڑ رہی تھی۔ زمین کی دیوار کی تھی۔ میرے پاؤں جانے سے کچھ نیچے گرنا تھا۔ کہیں کہیں دیوار میں سے پتھر باہر نکلے ہوئے تھے۔ میں ان پتھروں پر پاؤں بٹا کر اتر رہا تھا۔ پاروتی میرے دائیں جانب نیچے اتر رہی تھی۔ میں نے دائیں جانب سرگھما کر دیکھا وہ کافی نیچے تک چلی گئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر درخت کی جڑ ختم ہوگئی تو کیا کروں گا۔ مگر درخت کب جڑ بہت لمبی تھی اور بالکل مضبوط رستے کی طرح تھی۔ ہماری ایک جانب ندی کا پانی بڑی زور سے نیچے کی جانب گر رہا تھا۔ نیچے گہرائی میں جہاں پانی بڑے شور کے ساتھ نیچے گرنا تھا۔ وہاں سفید و ہند سی چھائی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ میں جو جڑ ہے ختم ہو رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر پاروتی کی طرف نیچے دیکھا۔ پاروتی زمین پر کھڑکی تھی اور اوپر منہ کر کے کھد رہی تھی۔
 ”چٹان لگا دو زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔“
 میں نے اندازہ لگا دیا۔ میرے پاؤں سے زمین کچھ پندرہ فٹ کی گہرائی میں تھی۔ میں نے درخت کی جڑ چھوڑ دی اور کھلی زمین پر پاؤں کے ٹل لیا۔ پاروتی ہاتھ کے اشارے سے مجھے اس طرف بلا رہی تھی۔ جہاں آبشار کی گرتی ہوئی چادر کا کنارہ تھا۔ وہاں اس قدر شور تھا کہ ہمیں ایک دوسرے کی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ میں اب اس سے نکلتے ہوئے چلے گا۔ وہ میرے دیکھتے دیکھتے نیچے

شروع ہو جاتا۔ خدا خدا کر کے سرنگ ایک ایسی جگہ پہنچی جہاں ایک کشادہ دالان بنا ہوا تھا۔ دیواریں پیچھے ہٹ گئی تھیں۔ چھت بھی اونچی ہو گئی تھی۔ یہاں سبہ جد جس تھا۔ میں تھک کر بیٹھ گیا۔ پاروتی بھی میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ مجھے ہلکی ہلکی گونج سی سنائی دے رہی تھی۔ گونج کی اس آواز کو پاروتی بھی غور سے سن رہی تھی اس نے منہ چھت کی طرف اٹھا کر کچھ سوگھنے کی کوشش کی اور کہا۔

”میرا خیال ہے ہمارے اوپر سے کوئی دریا گزر رہا ہے۔ میں پریشان ہو کر چھت کو دیکھنے لگا۔ چھت میں سے کسی وقت پانی کے پوندوں کے ٹپکنے کی آواز آ جاتی تھی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

”یہ گونج کی آواز کیسی ہے؟“

وہ بولی۔ ”یہ ہمارے اوپر سے گزرنے والے دریا کی آواز ہے۔ اسی آواز سے تو میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ہمارے اوپر کوئی دریا بہہ رہا ہے۔“

میں نے ہمیشہ دریا کو اوپر سے دیکھا تھا اور اس کے اوپر ہی سیر کی تھی۔ دریا کے نیچے آنے کا میرا یہ پہلا موقع تھا۔ میں نے تشویش کے ساتھ پوچھا۔

”کہیں آگے جا کر دریا کا پانی اندر تو نہیں آ جائے گا؟“

پاروتی ہنسنے لگی۔ ”عجب ناگن قسم کی عورت تھی۔ جب وہ ہنسنی لگی تو اس کے حلق سے مجھے ہنکارنے کی آوازیں نکلتی محسوس ہوتی تھیں۔ ہو سکتا ہے یہ میرا مغالطہ ہو لیکن مجھے اس وقت یہی محسوس ہوتا تھا“ کہنے لگی۔

”اگر دریا کا پانی کسی طرف سے سرنگ میں آ گیا ہوتا تو یہ سرنگ پانی سے بھری ہوئی ہوتی۔ خشک سرنگ کا مطلب ہے کہ یہ سرنگ دوسری خشک جگہ پر نکلتی ہے۔“

”میں نے کہا لیکن ہم جا کس طرف رہے ہیں؟“

وہ بولی۔ ”اس کا مجھے بھی کچھ پتہ نہیں چلو کا ذی آرام کر لیا ہے۔“

ہم سرنگ میں کافی آگے چل پڑے۔ کچھ پتہ نہیں ہم کئی دیر سرنگ کے اندر چلتے رہے۔ کتنے موڑ گھومے۔ کئی اتر اٹھائیں چڑھائیں عبور کیں۔ آخر ایک جگہ سرنگ ختم ہو گئی۔ جہاں ہم سرنگ سے باہر نکلے وہاں دونوں جانب اونچی پہاڑیاں تھیں۔ درمیان میں تنگ راستہ تھا۔ اوپر آسمان پر پھیلے پھر کے نور کی روشنی جھلکنے لگی تھی۔ یہ تنگ راستہ پہاڑیوں میں کافی دور تک چلا گیا تھا۔ پہاڑیاں ختم ہوئیں تو چھوٹے بڑے چوکور اور مخروطی چٹانوں کا منظر نظر آیا۔ پچھلے پہر کی نورانی روشنیوں میں ان چٹانوں کی چوٹیاں دھندلی دھندلی نظر آنے لگی تھیں۔ میں نے پاروتی سے پوچھا کہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟ یہ کوئی جگہ ہے؟ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک جگہ پتھروں میں پانی بہہ رہا تھا۔ یہ پانی ایک چٹان کے اندر سے آ کر نیچے گر رہا تھا۔ ہم نے منہ ہاتھ دھویا پانی پیا اور تازہ دم ہو کر دھما بیٹھ گئے۔

پاروتی کہنے لگی۔ ”مجھے خود نہیں معلوم کہ ہم کہاں نکل آئے ہیں۔ دن کی روشنی ہوگی تو کچھ پتہ چل سکے گا۔“

میں نے پاروتی سے پوچھا کہ مہاناگی سپر اتر سے کس قسم کا سلوک کرنے والا تھا۔ وہ دہائی دے رہی تھی۔ پاروتی نے میرے اس سوال کے جواب میں کہا۔

”تمہیں میں ساری باتیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔“

سنو مہاناگی سپر ازندہ حالت میں میرا گوشت کھانا چاہتا تھا۔ اگر تم عین وقت پر نہ آتے تو اس نے میرے جسم کے کسی حصے کا گوشت کاٹ کر کھانا تھا۔ پھر میری گردن کاٹ کر میرا سر ساتھ لے جانا تھا۔ جانتے ہو اس نے ایسا کیوں کرنا تھا؟ ایسا کرنے سے اس میں اتنی شکتی پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ آدمی سے سانپ کا روپ دھار سکتا تھا۔ صرف اسی واسطے وہ میرے پیچھے لگا ہوا تھا۔ تمہاری مہربانی سے میری جان بچ گئی۔“

میں اس قسم کی باتوں پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ میں نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور ایک بار پھر پوچھا کہ یہ جنگل کا کونسا علاقہ ہے؟ کیا یہاں سے ہم جنگل نکلنے کی طرف نکل سکتے ہیں؟“

پاروتی فضا میں کچھ سوگھ رہی تھی میں نے پوچھا۔

”کیا مہاناگی کی بو سوگھنے کی کوشش کر رہی ہو؟“

وہ بولی۔ ”نہیں اس کی بو تو خائب ہو چکی ہے۔ یہ تو میں کسی سانپ کی بو لینے کی کوشش کر رہی ہوں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ تمہیں بھوک نہیں لگ رہی؟“

میں نے کہا۔ ”بھوک ضرور لگ رہی ہے مگر یہاں تو کھانے کو سوائے سانپ اور پتھروں کے کچھ نہیں ملے گا۔“

پاروتی غصے سے بولی۔ ”میری مانو تو تم بھی سانپ اور پتھر کھانے شروع کر دو۔ زندگی بڑی آسان ہو جائے گی۔“ پھر وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اس طرف سے سانپ کی بو آ رہی ہے۔ میں

ابھی آتی ہوں۔“

وہ چلی گئی واپس آئی تو بڑی خوش تھی کہنے لگی۔ ”اگھے تین سانپ مل گئے تھے۔ اس کو تھوڑا تھوڑا اسانہ چڑھا ہوا تھا۔ یہ بقول اس کے سانپ کے زہر کا نشانہ تھا۔ اتنی دیر میں آسمان پر صبح کا اجالا پھیل گیا۔ ہمارے ارد گرد کالی کالی چٹانیں ہی چٹانیں تھیں۔ پاروتی کی ساڑھی کافی بوسیدہ ہو چکی تھی۔ کہنے لگی۔

”یہاں کوئی گاؤں آیا تو میں کسی عورت کی بی ساڑھی چرا کر پہنوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”پہلے یہ بتاؤ ہمیں جانا کدھر کو ہے؟“

اس نے مجھے آنکھیں نکال کر دیکھا اور ڈانٹتے ہوئے بولی۔

”کیوں پریشان ہوتے ہو؟ تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ چلو اٹھو میرے ساتھ آؤ۔“

ہم چٹانوں سے باہر نکلے تو وہ فضا کو سوگھتے ہوئے بولی۔

”مجھے ادھر سے سمندر کی بو آ رہی ہے کہیں سرنگ نے ہمیں سمندر کی طرف تو نہیں نکال دیا؟“

میں شکستہ دلی سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پاروتی کا اندازہ درست نکلا۔ ہم اونچی اونچی گھاٹیں میں چل رہے تھے۔ یہاں سے آگے آئے تو سامنے سمندر کا براؤن رنگ کا مہلا ساحل دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ہم وہیں کھڑے سمندر کی لہروں کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک ایک طرف سے سات آٹھ آدمی جنہوں نے سروں پر رد مال باندھے ہوئے تھے اونچے پتھروں میں پھول تھے نکل کر ہمارے سامنے

آگئے۔

انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔

اپنی وضع قطع اور چال ڈھال سے یہ لوگ جرائم پیشہ اور ڈاکو لگ رہے تھے۔ ان کے قد درمیانے مگر جسم بہت گھٹے ہوئے تھے اور وہ کوئی عجیب سی زبان بول رہے تھے۔ پاروتی کو انہوں نے سب سے پہلے قابو کیا۔ پاروتی نے اپنی ہنگامہ اور سنہٹائی سپردوں کی زبان میں بہت شور مچایا مگر دو آدمیوں نے اسے قابو کر کے اس کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے اور گھسیٹتے ہوئے لے کر چل پڑے۔ میرے ہاتھ بھی پیچھے باندھ دیئے اور دھکے دے کر مجھے آگے چلانے لگے۔

پاروتی نے ایک آدمی کو دانتوں سے کاٹنے کی کوشش کی تو اس نے اسے زور سے تھپڑ مارا۔ پاروتی کے منہ سے پھنکاریں سی نکلنے لگیں۔ وہ سب لوگ اپنی زبان میں اس سے غفاق کر کے بننے لگے۔ میں نے انہیں ہندوستانی زبان میں کہا کہ ہم لوگ جنگل میں راستہ بھول کر اوپر آ گئے ہیں۔ ہم واپس چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے مجھے ٹوٹی ہوئی ہندوستانی زبان میں گالی دی اور کہا۔ ”ابھی تم کو معلوم پڑ جائے گا۔ سب معلوم پڑ جائے گا۔“

وہ آپس میں کسی ایسی زبان میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے جو میری سمجھ سے باہر تھی۔ ان میں سے دو آدمیوں کے کاندھوں سے چمڑے کے بڑے تھیلے لٹک رہے تھے اور تین آدمیوں نے کمر کے ساتھ خنجر بھی لگائے ہوئے تھے۔ پاروتی نے ایک بار پھر ایک آدمی کو کاٹنے کی کوشش کی جس کے جواب میں پاروتی کو مار کھانا پڑی۔ میں نے ہنگامہ زبان میں چلا کر کہا۔ ”پاروتی کو کوئی ایسی دوائی

حرکت نہ کرنا۔“

مجھے معلوم تھا کہ اگر اس نے کسی آدمی کو دانتوں سے کاٹ کھایا تو وہ آدمی وہیں اس کے زہر سے مر جائے گا۔ اس کے بعد پاروتی کا زندہ رہنا ناممکن تھا۔ ہم سمندر کے کنارے ریت پر ناریل کے درختوں کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہاں کنارہ ونگون کی صورت میں سمندر میں آگے تک چلا گیا تھا۔ ہم اس ننگون کو پار کر کے اگلی طرف آئے تو مجھے سمندر میں دور کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا بجزی جہاز نظر آیا جس کی چٹنی میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ ساحل کی ریت پر تین چار چھوٹی ڈونگاں کشتیاں کھڑی تھیں۔ ان لوگوں نے ہمیں کشتیوں میں بٹھایا۔ کشتیاں بجزی جہاز کی طرف چل پڑیں۔ پاروتی دوسری کشتی میں تھی۔ میں سب سے آگے والی کشتی میں تھا۔

سمندری جہاز کا لنگر گرا ہوا تھا۔ اس کے ڈیک پر اسی قسم کے چندہ میں جرائم پیشہ آدمی رینگ رہے تھے۔ کشتیوں کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ رہے تھے۔ ڈیک پر سے رسی کی تین میٹریاں نیچے لٹک رہی تھیں۔ ہمیں سب سے پہلے جہاز پر چڑھایا گیا۔ پھر باقی کے لوگ بھی ڈیک پر آ گئے۔ یہ ایک خستہ حال پراٹا سمندری جہاز تھا جس کے سرابورڈ کا رنگ اڑچکا تھا اور جگہ جگہ رنگ لگ چکا تھا۔ ڈیک کا لکڑی کا فرش صاف ستھرا تھا۔ ہمیں ایک ایسے آدمی کے سامنے پیش کیا گیا جس کی ایک آنکھ کافی تھی اور اس میں سے پانی بہہ رہا تھا جسے وہ رومال سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد صاف کر لیتا تھا۔ سر پر نیلا رومال بندا تھا۔ کمر میں بیلٹ لگی تھی جس کے ساتھ ایک خنجر اور پستول لٹک رہا تھا۔ اس کے دونوں کانوں میں تانبے یا سونے کی چھوٹی چھوٹی

باباں تھیں۔ اس نے مجھے اپنی ایک آنکھ سے گھور کر دیکھا پھر پیچھے کودھکا دیا میں گرتے گرتے پچا۔ پاروتی کے پاس جا کر اس کے خوفناک چہرے پر ایک عجیب خنخوار قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر پاروتی نے اس شخص کو اپنا ناخن ذرا سا بھی چھو دیا تو اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ مجھے یہی خطرہ تھا کہ پاروتی کہیں یہ حماقت نہ کر بیٹھے۔ کیونکہ اس کے بعد ہم دونوں کی موت یقینی تھی۔ مگر پاروتی نے بڑی سمجھداری سے کام لیا۔ اس کے دونوں ہاتھ کھول دیئے گئے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر خاموش کھڑی خالی خالی نظروں سے اس آدمی کو دیکھتی رہی۔ اس وقت کسی نے ہندوستانی میں کہا۔

”کیپٹن ہم نے انہیں جنگل میں پکڑا ہے۔ یہ دونوں ہندوستانی ہیں۔“

کیپٹن کے حلق سے غراہٹ کی سی آواز نکلی۔ اس نے چنگی بجا کر ایک طرف اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ ملے ہی چار آدمی ہمیں دھکیلتے ہوئے جہاز کے لوڑڈیک میں لے آئے۔ یہاں انہوں نے ہمیں لوہے کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے اور ہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میں نے پاروتی سے کہا۔ ”پاروتی قسمت نے ہمیں ان ڈاکوؤں یا اسمگلروں کا قیدی بنا دیا ہے مگر خدا کے لیے تم کوئی ایسا ایسی حرکت نہ کرنا۔“

پاروتی کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آدھ گھنٹہ پہلے اس نے جنگل میں تین سائیوں کا ناشہ کیا تھا۔ کہنے لگی۔ ”میں ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

پاروتی نے کرنا نہیں تو ہماری خبر نہیں۔ یہ لوگ تو قاتل اور ڈاکو ہیں۔ تم ان میں سے کسی کو مارو گی تو یہ ہمیں بھی مار ڈالیں گے۔“

پاروتی نے پھنکار تے ہوئے کہا۔

”تو کیا میں اس کاٹنے بندے کے ساتھ رہوں گی۔“

میں نے کہا خدا کے لیے عقل سے کام لو۔ ہمیں ان لوگوں کی قید سے فرار ہونا ہے۔ اس کے لیے ہمیں بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ کوئی اسکیم تیار کرنا پڑے گی۔“

پاروتی نے سر جھکا لیا۔ کہنے لگی۔

”اگر اس کاٹنے کیپٹن نے میرا منہ چوما تو وہ میرے منہ کے زہر سے مر جائے گا۔ تب میں کیا کر دوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”جس طرح بھی ہو تم ایسا مت کرنا۔“

وہ بولی۔ ”میں اسے کیسے روک سکتی ہوں وہ تو جانور ہے۔“

میں نے بے بسی کے انداز میں کہا۔

”تمہیں تمہارے بھگوان کا واسطہ ہے کوئی علاج سوچو ورنہ ہماری لاشیں سمندر کی مچھلیاں کھا رہی ہوں گی۔“

پاروتی کچھ سوچنے لگی۔ لوڑڈیک میں بیاز اور گرم مصالحوں کی تیز خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ فضا مرطوب اور یوچھل تھی۔ چھت میں جو ہوادان لگا تھا صرف اس میں سے سمندر کی تازہ ہوا کسی وقت آ جاتی تھی۔ ہمارا ایک ایک ہاتھ جھکڑی سے لوہے کے ستون کے ساتھ جکڑ دیا گیا تھا۔ پاروتی کہنے لگی۔

”ننا ننا میں رو تین بھگوان کا واسطہ ہے۔“

کھا جاؤں تو تمہارے اثر سے کم از کم چوبیس گھنٹوں کے لیے میرے منہ کے ذہر کا اثر ختم ہو جائے گا۔“

میں نے جلدی سے کہا۔
”بس ٹھیک ہے اگر یہ کانا کیپٹن تمہیں رات کو اپنے کیمپ میں لے گیا تو تم کہنا کہ مجھے رات کو تمہارا چبانے کی عادت ہے۔ وہ کوئی اعتراض نہیں کرے گا۔“

اسنے میں جہاز کا فرش کاٹنے لگا۔ ساتھ ہی گزرگراہٹ کی آواز شروع ہوگئی۔ جہاز کے پرانے انجن چل پڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جہاز دائیں بائیں ہلچکولے کھانے لگا۔ پاروٹی پریشان ہو رہی تھی کہنے لگی۔

”یہ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔ آخر انہوں نے ہمیں اپنا قیدی کیوں بنایا ہے؟“ میں نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”پاروٹی یہ لوگ مجھے بحری ڈاکو یا سنگٹھرتے ہیں۔ ان کا کام کھلے سمندروں میں سفر کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے تجارتی جہازوں کو لوٹنا ہے۔ یا یہ ساحلی علاقوں میں منشیات وغیرہ کی سنگٹھگ کرتے ہیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں انہوں نے ہمیں اس لیے پکڑا ہے کہ ہم نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ یہ لوگ روپوش رہ کر گھنٹاؤں کے جرائم کرتے ہیں۔ انہیں ڈر تھا کہ ہم شہر جا کر پولیس کو ان کے حلیے اور وہ جگہ بتا دیں گے جہاں یہ اترے تھے۔“

پاروٹی نے غامبیدی کے ساتھ کہا۔ ”پھر تو یہ ڈاکو ہمیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔ پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے کہ ہم انہیں ماریں یہ ہمیں مار ڈالیں۔“

میں نے کہا۔ ”اگر ایسا وقت آ گیا تو ہم ان کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ کم از کم تمہارے پاس تمہارے زہرے لیے ناخنوں کا ہتھیار تو ہر وقت موجود رہتا ہے۔“

جہاز دائیں بائیں آگے پیچھے ڈولتا سمندر میں رواں دواں تھا۔ لوڑ ڈیک سمندری جہاز کا سب سے نچلا ڈیک ہوتا ہے۔ مسافر بردار جہاز میں بارش یا طوفان کے وقت اپر ڈیک کی کلاس کے مسافر یہاں آ جاتے ہیں۔ مال بردار جہاز میں لوڑ ڈیک کو گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے نیچے بھی ایک منزل ہوتی ہے جہاں جہاز کے انجن نصب ہوتے ہیں۔ لوڑ ڈیک میں ہوا صرف اوپر والے ہوائیوں سے آتی ہے۔ یہاں سے سمندر دکھائی نہیں دیتا۔ اپر ڈیک اور لوڑ ڈیک کو تھرڈ کلاس میں ہی شمار کیا جاتا ہے۔

ہمیں وہاں بیٹھے نہ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ آدی آئے اور ہمیں کھول کر جہاز کی درمیانی منزل میں لے گئے۔ یہاں ایک اتنی تنگ راہ داری تھی کہ اس میں سے صرف ایک آدمی ہی گزر سکتا تھا۔ یہاں آئے سانسے دو کیمپن تھے۔ انہوں نے مجھے ایک کیمپن میں دھکا دے کر داخل کیا اور باہر تالا لگا کر پاروٹی کو ساتھ لے کر وہاں سے چلے گئے۔ مجھے راہ داری میں دیر تک ان کے یونٹوں کی آواز آتی رہی۔ اس کا مطلب تھا کہ پاروٹی کواد پر والی منزل کے کسی کیمپن میں لے جا رہے تھے۔ اور جہاز کے اوپر والا کیمپن جہاز کے پتہ کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔ میرے کیمپن میں سوائے پلاسٹک کے بڑے بڑے تھیلوں کے اور کچھ نہیں تھا جو فرش سے چھت تک چلے گئے تھے۔ وہاں صرف میرے لینے کی جگہ ہی تھی۔ میں فرش

پر گیا اور سوچنے لگا کہ میری زندگی کی کتاب نے ایک عجیب و غریب باب کھول دیا ہے۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔ میں تو ایسا دیرینہ پسند طبیعت رکھتا تھا۔ اس مہم جوئی میں موت کئی بار میرے قریب سے ہو کر گزرنی تھی۔ موت سے آنکھ بھولی کھیلنے میں مجھے بڑا مزہ آتا تھا۔ بس میری طبیعت ہی ایسی تھی۔ اتنا ضرور تھا کہ کسی کا قیدی بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ دل بہ چاہتا تھا کہ آزادی کے ساتھ دشوار گزار بارانی جنگلوں کھلے سمندروں اور ناقابل عبور صحراؤں کی سیاحت کرتا رہوں۔ ان سمندری لائبروں یا سنگٹھروں نے پاروٹی کے ساتھ مجھے بھی پکڑ کر قید میں ڈال دیا تھا۔ جو میرے مزاج کے خلاف تھا۔ اور میں فرار کی ترکیبیں سوچنے لگا تھا۔

کیمپن کے دروازے کا تالا کھول کر ایک بوڑھا آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چادروں سے بھری ہوئی تھالی اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا ڈونگ تھا۔ وہ گہرے سانولے رنگ کا آدمی تھا۔ عمر ساٹھ کے قریب ہوگی۔ سمندری ہواؤں نے اس کے چہرے کو کرسٹ بنا دیا تھا۔ اس کے سر پر بھی تیلہ رد مال بندھا ہوا تھا۔ چادروں کی تھالی اور ڈونگ میرے آگے رکھ کر بولا۔

”اسے کھاؤ۔ خبردار یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ چادروں طرف سمندر ہی سمندر ہے۔“

میں نے چادروں کی تھالی اپنے آگے کی اور میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”اللہ تیرا شکر ہے۔“

میرے پاس بیٹھ گیا۔ وہ ہندوستانی بول لیتا تھا۔ مگر اس کا لہجہ جنوب مشرقی ایشیا کے خطے کا تھا۔ کہنے لگا۔

”تم مسلمان ہو؟“

میں نے کہا۔ ”الحمد للہ مسلمان ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ اس کے دو تین دانت غائب تھے کہنے لگا۔ ”میں بھی مسلمان ہوں۔ میں تھائی ہوں۔ تھائی لینڈ کا رہنے والا ہوں۔ جوانی میں کپتان ابرو کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اب بوڑھا ہو رہا ہوں۔“ پھر وہ میری طرف جھک کر رازداری سے بولا۔

”تمہارے ساتھ جو عورت تھی وہ تمہاری بیوی ہے کیا؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں وہ میری بیوی نہیں۔ جنگل میں مل گئی تھی۔ سپرے کی بیٹی ہے۔ ماں باپ مر چکے ہیں۔ وہ کلکتہ شہر جانا چاہتی تھی۔ میں بھی کلکتہ جانا چاہتا تھا۔ ہم دونوں جنگل میں راستہ بھول گئے۔ اور تم لوگوں نے ہمیں پکڑ لیا۔“

بوڑھا بڑے غور سے میری باتیں سنتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا کہنے لگا۔ ”میرا نام عمر ہے۔ یہاں مجھے سب خامو کہتے ہیں میں پھر آؤں گا۔“

وہ چلا گیا۔ میں دل میں بڑا خوش ہوا کہ لائبرے ڈاکوؤں کے جہاز میں ایک مسلمان مل گیا ہے۔ جو قید سے فرار ہونے میں میری مدد کر سکتا ہے۔ میں سارا دن کیمپن میں پلاسٹک کے تھیلوں کے اسٹاک کے پاس بڑا رہا۔ سچ میں ایک آدمی آ کر میرا منہ ہاتھ دھلانے مجھے ہاتھ دھو دھو میں لے گیا جو کارڈور کے کونے پر تھا۔ جہاز ایک پتی کی رفتار کے ساتھ دائیں بائیں تھوڑی تھوڑی رولنگ کرتا خدا جانے کس طرف چلا رہا تھا۔

مجھے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ دن ہے یا رات۔ کیمین میں ایک بقی جمل رہی تھی دوسری بار بوڑھا عمر میرے لیے چاول لے کر آیا تو اس نے بتایا کہ رات ہوگئی ہے۔ وہ میرے لیے ابلے ہوئے چاولوں میں جھینکا چھلچھلی چھپا کر لے آیا تھا۔ میرے پاس بیٹھ گیا کہنے لگا۔

”ہم برسوں ایک جزیرے میں پہنچیں گے۔ وہاں پاکستان کو مال اینجنوں کے حوالے کرنا ہے۔ دو دن جزیرے میں ٹھہریں گے۔ وہاں جہاز میں پینے کا پانی اور خوراک وغیرہ سٹاک کی جائے گی۔“ میں نے پوچھا۔ ”پاکستان کس قسم کا کاروبار کرتا ہے اور اس نے ہمیں کیوں پکڑا ہے؟“

عمر آہستہ سے بولا۔ ”ایسا سوال پھر نہ پوچھنا۔ اس جہاز پر ہر قسم کا کاروبار ہوتا ہے۔ زیادہ تر ہم مختلف جنگیوں سے بیرون اور خشیش لے کر ہانگ کانگ، کولون اور میکاؤ کے اینجنوں کو سپلائی کرتے ہیں۔ آزاد پانیوں میں کوئی چھوٹا موٹا مال بردار جہاز مل جائے تو ہم اسے لوٹ بھی لیتے ہیں۔“

میں نے اس سے کہا۔ ”یہ تو گناہ ہے۔ آپ تو مسلمان ہیں۔“

عمر بولا۔ ”پہلے تو مجھے بھی گناہ لگتا تھا اب نہیں لگتا۔ میں نے سوچا پھر نہ جانے موقع ملے نہ ملے۔ اس وقت موقع ہے اس شخص سے دل کی بات کہہ دی ڈالنی چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کو تو معلوم ہے کہ ہم دونوں بے قصور ہیں۔ ہمیں یونہی پکڑ کر قید میں ڈال دیا گیا ہے۔ کیا اس قید سے رہائی نہیں مل سکتی؟“ بوڑھے عمر نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”ایسی بات کبھی بھول کر بھی دل میں نہ لانا۔“ پاکستان اہرنو کے جہاز سے آج تک کوئی قیدی فرار نہیں ہوا۔ جانتے ہو جو قید سے فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے اس کے ساتھ کیمین کیا سلوک کرنا ہے؟“ یہ قیدی کو بوری میں بند کر کے سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے۔ میں کئی قیدیوں کا یہ عبرت ناک انجام دیکھ چکا ہوں۔“

میں نے ہنسنے لگا۔ ”آخر تمہارے پاکستان نے ہمیں کیوں پکڑا ہے وہ ہم سے کیا چاہتا ہے؟“ بوڑھا عمر بولا۔

”دو ایک دنوں میں تمہیں جہاز کی صفائی، میلے کپڑوں کی دھلائی اور جوٹے برتنوں کے صاف کرنے کے کام پر لگا دیا جائے گا اور اگر کیمین کو تمہارے اچھے دام مل گئے تو وہ تمہیں کسی قلابان یا تھائی اسمگلروں کے ہاتھوں فروخت بھی کر دے گا۔“

میں نے دل میں کہا کہ تمہارے پاکستان کی ایسی تہمتی۔ میں تو ہر حالت میں فرار ہو جاؤں گا۔ اگر پاروٹی ساتھ نہ جاسکی تو میں اکیلا موقع پاتے ہی بھاگ جاؤں گا۔ میں بوڑھے عمر سے اس سمندر کے بارے میں پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

”مجھے معلوم ہے کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ یہ خیال دل سے نکال دو کہ اگر تم نے سمندر میں چھلانگ لگا دی تو تیر کر کسی شہر پہنچ جاؤ گے۔ یہ سمندر ہزاروں میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اور فوجیوں کے شاردک مچھلیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اگر شاردک مچھلیوں سے بچ بھی گئے تو ہزاروں میل کی وسعت میں پھیلا ہوا ہیبت ناک سمندر تمہیں بھوکا پیاسا مار دے گا۔“

مجھے جاپانی بحری بیڑے کا خیال آیا جو ان سمندروں میں گشت کر رہا تھا۔ جب میں نے اس سے ذکر کیا کہ اگر ہمیں کوئی جاپانی جنگی جہاز مل گیا تو وہ تو ہمارے جہاز کو تباہ کر دے گا۔ تو وہ حیران سا ہو کر بولا۔

”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس علاقے سے سارے جاپانی بھاگ گئے ہیں۔ جاوا، سائرا تھائی لینڈ، برما، فلپائن۔ سارے علاقے جاپانیوں سے خالی ہو گئے ہیں۔ اگر بیڑوں کے ساتھ امریکہ بھی مل گیا ہے۔ ان کے جنگی جہاز اب جاپان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور جنگ جاپان کے ساحلوں کے قریب ہو رہی ہے۔ یہ سمندر تو ہمارے لیے بالکل خالی ہو گئے ہیں۔“

وہ خوش ہو کر ہنسنے لگا۔ یہ بوڑھا مسلمان کبھی مجھے بڑا رحمدل لگتا اور کبھی سفاک قاتل لگنے لگتا۔ ایک بات ثابت ہوگئی تھی کہ میرے فرار میں یہ شخص کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اب مجھے اکیلے ہی فرار کی کوئی ترکیب نکالنا تھی۔ رات گزر گئی۔ دوسرے روز مجھے کیمین سے نکال کر عرشے کی صفائی پر لگا دیا گیا۔ صابن والے پانی سے بھری ہوئی پانی اور برش مجھے تھکادیا گیا۔ اور میں نے گھٹنوں کے مل جھک کر فرش کی صفائی شروع کر دی۔ دوپہر تک میں یہ مشقت کرتا رہا۔ دوپہر کو مجھے تھوڑا بہت کھانے کو دیا گیا۔ اس کے بعد پاروٹی خانے میں برتنوں کی صفائی کا کام دے دیا گیا۔ اس دوران مجھے نہ تو کانا کپتان دکھائی دیا تھا اور نہ ہی پاروٹی نظر آتی تھی۔ تیسرے پہر ڈیک کے دوسرے سرے پر میں نے جہاز کے کپتان کو دیکھا۔ وہ دور میں لگائے اپنی ایک آنکھ سے دور کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ پاروٹی نے رات کو

تمہا کو چھانی ہے ورنہ اس وقت یہ کانا کپتان زندہ حالت میں نظر نہ آتا۔ جہاز کچھ زیادہ ہی ڈولنے لگا تھا۔ سمندر کی بھری ہوئی موجیں دور دور سے آ کر جہاز سے ٹکرائی تھیں۔ رات کو مجھے دوبارہ کیمین میں بند کر دیا گیا۔

اس طرح سمندر میں سفر کرتے ہوئے دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن سمندر میں مشرق کی جانب دور سیاح دھبے سے نظر آنے لگے۔ میں عرشے کی صفائی اور فرش دھونے میں لگا ہوا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس دوران ایک بار بھی پاروٹی مجھے جہاز پر نظر نہ آئی تھی لگتا تھا کہ کانے کپتان نے اسے کسی خاص کیمین میں بند کر کے رکھا ہوا ہے۔ جیسے جیسے جہاز آگے بڑھتا گیا سیاح دھبے اونچے اونچے پہاڑوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ یہ کوئی جزیرہ تھا۔ جہاز ساحل سے کچھ فاصلے پر سمندر میں کھڑا ہو گیا لنگر ڈال دیا گیا۔ چھوٹی کشتیاں سمندر میں اتار دی گئیں۔ ان میں پلاسٹک کے تھیلے لادے جانے لگے۔

کشتیوں کے دو پھیروں میں یہ تھیلے ساحل پر پہنچائے گئے۔ اس دوران کپتان اہرنو عرشے پر کھڑا کام کی نگرانی کرتا رہا۔ جب سارا مال جزیرے پہنچ گیا تو کپتان نے چند آدمیوں کو ساتھ لیا اور کیمین میں بیٹھ کر جزیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت میں عرشے کے دوسرے سرے پر جہاں لنگر نیچے ڈالا گیا تھا اکیلا بیٹھا تھا۔ مجھے جہاز کے دوسرے سرے پر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اگرچہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے مگر مجھے جہاز کی دوسری منزل اور لوئر ڈیک پر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں کپتان کے قریب بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس وقت

میں پاروتی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پھر خیال آیا کہ اگر میں کسی طرح سمندر میں چھلانگ لگا کر جزیرے کی طرف نکل جاؤں تو ان بحری ڈاکوؤں کی قید سے نجات مل سکتی ہے۔ پاروتی کے بارے میں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ کپتان اس پر لٹو ہو گیا ہے اور اسے اس نے اپنے کیمپن میں ہی بند کر کے رکھا ہوا ہے۔

اتنے میں بوڑھا جہاز ران عمر ہاتھ میں تام چٹنی کا لنگ پکڑے میری طرف آتا نظر آیا۔ وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر بیٹھ گیا اور ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ان لوگوں کے سامنے میں تم سے زیادہ بات چیت نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی آدمی ہمارے قریب سے گزرے تو خاموش ہو جانا۔“

ہم ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ بلکہ دوسری طرف منہ کر کے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے بوڑھے عمر سے پاروتی کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ وہ بڑے مزے میں ہے۔ کپتان کو وہ پسند آگئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تمہاری بڑے مہربانی ہوگی مجھے صرف ایک بار اس سے ملا دو۔“

بوڑھے عمر نے پوچھا۔ ”تم اس سے کس لیے ملنا چاہتے ہو؟ وہ تمہاری بیوی تو ہے نہیں پھر اپنی جان خطرے میں کیوں ڈال رہے ہو۔ جانتے ہو اگر کپتان کو پتہ چل گیا تو وہ تمہیں بوری میں ڈال کر سمندر میں پھینک دے گا۔“

میں نے کہا۔ ”پاپا مجھے اس سے ایک دو بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ صرف تھوڑی دیر کے لیے مجھے اس کے پاس لے جاؤ۔ اس وقت کپتان

بھی جہاز پر نہیں ہے اور آدھے سے زیادہ آدمی جزیرے پر جا چکے ہیں۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔“

بوڑھا عمر مسکراتے لگا۔ ”معلوم ہوتا ہے تمہیں اس لڑکی سے محبت ہوگئی ہے۔ اچھا میں کوشش کرتا ہوں تم اسی جگہ بیٹھے رہو۔“

وہ دوسری طرف منہ کیے ہوئے پلٹا اور ان سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ جو جہاز کی دوسری منزل کو جاتی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بالٹی تھی۔ وہ میرے قریب سے ہوتا ہوا عرشے کی ریڈنگ کے پاس گیا۔ بالٹی کا پانی سمندر میں پھینکا اور میرے قریب سے واپس جاتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

”اپنے کیمپن میں جاؤ پاروتی وہاں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

جہاز کا عرشہ تقریباً خالی تھا۔ میں خاموشی سے اتر اتر دوسری طرف والی سیڑھیاں اتر کر جہاز کی تیسری منزل کی راہ واری سے گزرتا ہوا اپنے کیمپن میں آ گیا۔ پاروتی وہاں بیٹھی میری طرف دیکھ کر مسکراتی تھی۔ اس نے نئی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

میں نے کیمپن کا دروازہ بند کرتے ہوئے پاروتی سے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے تمہیں جہاز کا کانا کپتان پسند آ گیا ہے؟“

پاروتی کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ کہنے لگی۔

”تم نے مجھے ہتے دیکھ کر یہ اندازہ لگایا ہوگا۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میرے چہرے پر تو مسکراہٹ تمہیں دیکھ کر آئی تھی۔ آج پہلی بار مجھے یہ احساس

ہونے لگا ہے کہ شاید مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔“

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”باتیں چھوڑو۔ مجھے بتاؤ کہ تم باہر کیوں نہیں نکلتیں؟ کیا تم نے کپتان کی ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“

اس پر پاروتی کو غصہ آ گیا۔ مجھے بازو سے پکڑ کر جھجھوڑا اور بولی۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ کیا میں اس کے ساتھ رہ سکتی ہوں جس نے مجھے قیدی بنا رکھا ہے؟ تو اس کی خوش قسمتی ہے کہ میں نے اس کے جسم میں اپنا زہر داخل کر کے اسے مار نہیں ڈالا۔ وہ بھی اس لیے کہ تم نے مجھے منع کیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”پاروتی! ہمارے پاس وقت بہت تھوڑا ہے۔ یہ بتاؤ کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم کتنا طرح کپتان کو راضی کر لو کہ ہم دونوں جزیرے کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اجازت دے دے۔“

وہ کہنے لگی۔ ”یہ کانا ڈاکو کپتان بڑا وحشی درندہ ہے۔ میرے ساتھ وہ درندوں ایسا سلوک کر رہا ہے۔ اسے میں صرف تمہاری وجہ سے برداشت کر رہی ہوں نہیں تو میں اسے کبھی زندہ نہ چھوڑتی ان نے مجھے اپنے ساتھ والے کیمپن میں بند کیا ہوا ہے۔ یہ تو بوڑھے ملارج کی مہربانی سے میں تم سے ملنے آئی ہوں۔ اس نے مجھے دس منٹ سے زیادہ کی ہلکت نہیں دی۔ میں خود تم سے ملنے کو بے چین تھا۔ یہ بتاؤ کہ ہم یہاں سے فرار کس طرح ہو سکتے ہیں؟ میں تو کہتی ہوں کہ اسی وقت باہر نکل کر سمندر میں کود جاتے ہیں جہاز کے سارے لوگ زندہ رہ گئے ہوتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”مگر کچھ ڈاکو سپرے پر موجود ہیں۔ ان کے پاس شین گیس اور رائفلیں ہیں۔ وہ ہمیں وہیں بھون ڈالیں گے۔“

”تو پھر یہاں سے کیسے فرار ہوں؟ میں اس درندے کپتان کے ساتھ زیادہ دیر نہیں رہ سکتی۔ آخر میں بھی ناگن عورت ہوں۔ مجھے ذرا غصہ آ گیا تو صبح کیمپن میں کپتان کی لاش ہی ملے گی؟“

میں نے جلدی سے کہا۔

”نہیں نہیں پاروتی! بھگوان کے لیے ایسا بالکل نہ سوچنا۔ ایسی حرکت نہ کرنا۔ میں یہاں سے فرار کی کوئی ترکیب سوچتا ہوں۔ بوڑھا ملارج تو ہمارا ایک ہمدرد یہاں موجود ہے جیسے ہی میں نے کوئی ترکیب سوچی میں تمہیں بوڑھے عمر کے ہاتھ کھلوایا۔“

پاروتی نے کہا۔

”یہ بوڑھا ملارج تو کپتان کا بڑا خاص آدمی ہے۔ وہ اسے بتا دے گا۔“

میں نے کہا۔ ”میں اسے راضی کر لوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ اور کچھ دن کپتان کا ظلم برداشت کر لو اور بھگوان کے لیے اسے ہلاک نہ کرنا۔ ورنہ ہم دونوں کی خیر نہیں۔“

پاروتی نے زیر لب جھجھکاؤ میں کپتان کو گالی دے کر کہا۔

”تمہاری خاطر مان لیتی ہوں۔“

کیمپن کے بند دروازے سے بوڑھے عمر کی گھبراہٹ ہوئی آواز آئی۔

”لڑکی کو جلدی بھیج دو کپتان آ رہا ہے۔“

پاروتی جلدی سے اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے ایک منٹ بعد میں

بھی کیمین سے نکلا اور صفائی وغیرہ کا کام کرنے اور والے ڈیک پر آ گیا۔ میں نے جزیرے کے ساحل کی طرف دیکھا۔ اسٹیکروں سے بھری ہوئی کشتیاں جزیرے سے چل پڑی تھیں۔ میں عرشے کے فرش کی صفائی میں لگ گیا۔ بحری ڈاکوؤں کی پہلی کھیپ جہاز پر آ گئی۔ ان میں کپتان البرٹو بھی تھا۔ اس کے بعد کشتیاں واپس جزیرے کی طرف چلی گئیں۔ اب ان پر کھانے پینے کا سامان پھل پانی سے بھرے ہوئے کنسترو اور تیل کے ڈرم لاد کر جہاز میں لائے جانے لگے۔ دو پہر تک مال جہاز پر آتا رہا۔ اس کے بعد جہاز کے عملے میں کھانا تقسیم کیا گیا۔ میں بھی اپنی تھالی لے کر ڈیک کی ریڈنگ کے پاس بیٹھ گیا۔ شام سے ذرا پہلے جہاز کا انکرا اٹھایا جانے لگا۔ مجھے ایک سلاخ پیرے دار نیچے میرے کیمین میں لے آیا۔ اب باہر سے کیمین کا دروازہ بند نہیں کیا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جہاز کے پرانے انجن گڑ گڑا ہٹ کے ساتھ اشارت ہو گئے اور جہاز آہستہ آہستہ جھکولنے لگا۔ اسٹندر میں رداں ہو گیا۔

تھائی لینڈ کے بوڑھے مسلمان ملازم عمر سے جہاز کے ڈیک پر ملاقات ہو جاتی تھی یا کبھی کبھی وہ خود میرے کیمین میں آ جاتا تھا۔ اب میں کھانا دوسرے ملاحوں کے ساتھ کچن میں بیٹھ کر ہی کھاتا تھا۔ ملاحوں میں زیادہ تر لوگ فلپائن اور تھائی لینڈ کے تھے۔ ایک دو ملاحوں کی بیویاں بھی ساتھ تھیں۔ جنہیں وہ کچھ وقت کے لیے اپنے ساتھ رکھتے۔ پھر انہیں واپس بھیج دیتے کیونکہ کپتان البرٹو کا حکم تھا کہ کوئی سیلابی بیوی یا کوئی دوسری عورت اپنے پاس زیادہ دن نہیں رکھ سکتا۔ ایک دن آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں۔

تیز ہوا چلنے لگی۔ بارش بھی شروع ہو گئی۔ دیکھتے دیکھتے سمندر میں طوفان آ گیا۔ جہاز سمندر کی موجوں پر کھلونے کی طرح ادھر ادھر اچھلنے لگی۔ سمندر کی موجیں عرشے پر شور مچاتی ہوئی آئیں اور جو چیز وہاں پر ہوتی اسے ساتھ بھا کر لے جاتیں۔ میں نے پہلی بار سمندر کا طوفان دیکھا تھا۔ ہم لوگ نیچے ڈیک میں چلے گئے تھے۔ خدا خدا کر کے طوفان تھا۔ اور والے ڈیک پر طوفان نے کافی توڑ پھوڑ کی ہوئی تھی۔ دوسرے ملاحوں کے ساتھ مجھے بھی کام پر لگا دیا گیا۔ رات کو بادل چھٹ گئے اور آسمان پر چاند نکل آیا۔ سمندر میں چاندنی رات کا منظر بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔ چاروں طرف چاندنی ہی چاندنی تھی۔ میں دن بھر کی مشقت سے فارغ ہو چکا تھا۔ نیچے کیمین میں جانے کی بجائے میں وہیں عرشے پر ایک طرف لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب سورج نکل آیا تھا۔ کپٹن کے حکم سے مجھے لوڑ ڈیک کی صفائی پر لگا دیا گیا۔ یہاں بوڑھا عمر بھی موجود تھا۔ میں فرش پر بچاؤ اچلا رہا تھا کہ وہ میرے پاس آ کر بولا۔

”معلوم ہوتا ہے تمہارا دل لگ گیا ہے بس ایسی طرح دل لگا کر کام کرتے رہو تو پھر کپتان تمہیں اپنے عملے میں شامل کر لے گا اور تمہیں لوٹ مار کے مال سے حصہ بھی ملا کرے گا۔“

میں نے بوڑھے عمر سے کہا۔

”میں تو دن رات فرار کی ترکیبیں سوچتا رہا ہوں بابا۔“

بوڑھا عمر ٹوٹے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ہنسنے لگا۔

”یہ خیال دل سے نکال دو۔“

اتنا کہہ کر وہ سڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ اسی طرح ایک ہفتہ سمندر میں گزر گیا۔ آٹھویں دن جہاز ایک اور جزیرے کے ساحل سے جا لگا۔ یہ چھوٹا سا جزیرہ تھا اور اس میں بھورے اور سیاہ رنگ کی پہاڑیاں ہی پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ جہاز کے دوسرے آدمیوں کے ساتھ مجھے بھی اس جزیرے پر اتارنے کی اجازت ملی گئی۔ یہاں بھی کپتان نے نشیات کے کچھ تھیلے سمندر کے حوالے کرنے تھے۔ یہ جزیرہ بظاہر بالکل ویران نظر آ رہا تھا۔ ساحل کے ساتھ درختوں کے نیچے دس بارہ ڈھلانی پچھتوں والے مکان بنے ہوئے تھے۔ دنیا جہان کے قیمتی سگریٹ اور شروبات دستیاب تھے۔ ریسٹوران میں ہمارے جہاز کے ٹیئرے ملاج بھی جا کر بیٹھ گئے اور شراب پینے لگے۔ میں بوڑھے عمر کے پاس کوٹے والی چٹائی پر بیٹھ گیا۔

اس نے مجھے بتایا کہ پاروتی اس وقت جہاز پر چل پھر رہی ہوگی۔

”اس وقت اسے کیمین سے باہر نکلنے کی کھلی چھٹی ہے۔ مگر ایک ڈاکو اس کی گمرانی کر رہا ہوگا اگر اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ یہ کپٹن کا حکم ہوتا ہے۔“

بوڑھے عمر نے خود ہی فرار کا موضوع چھیڑ دیا تھا۔ میں خود اس سے اس موضوع پر تفصیلی اور آخری بات کرنا چاہتا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں پاروتی کو ساتھ لے کر ہر حال میں فرار ہونا چاہتا ہوں تو پہلے تو وہ مجھے اس کے انجام سے ڈراتا رہا اور یہی کہتا رہا کہ یہ ناممکن ہے لیکن جب میں نے اسے کہا۔

”بابا! میں نے اور پاروتی نے فرار ہونے کا

فیصلہ کر لیا ہے۔ چاہے ہمیں اس کے لیے اپنی جان ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔ جان بچ گئی تو آزاد ہو جائیں گے۔ اگر مر گئے تو بھی اس قید سے تو نجات مل ہی جائے گی۔“

اس پر بوڑھا عمر خاموش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”کیا واقعی تم نے جہاز سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور تم اس کے لیے جان کی بازی لگانے پر بھی تیار ہو۔“

میں نے اس کا بوڑھا عمر مضبوط ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بڑی عاجزی سے کہا۔

”بابا! تم بھی مسلمان ہو۔ میں بھی مسلمان ہوں خدا کے لیے ہماری مدد کرو۔ ہمیں کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ اس قید سے جان چھوٹے اور پاروتی تو مجھے اس روز کہہ رہی تھی کہ اگر میں یہاں سے بھاگ نہ سکے تو خود کشی کر لوں گی۔“

بوڑھا عمر سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

”تم اس کا ذکر اس لڑکی سے مت کرنا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے تو اس کی شکل تک نظر نہیں آتی میں اس سے کیسے بات کر سکتا ہوں۔“

بوڑھا بولا۔

”تھوڑے دنوں بعد اسے دن کے وقت اوپر والی ڈیک پر چلنے پھرنے کی اجازت مل جائے گی۔“

میں نے اسے بتایا کہ پاروتی کے ساتھ کپتان بڑا وحشیانہ سلوک کر رہا ہے اور وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکے گی۔

”میں سوچ کر ہٹاؤں گا ابھی یہ بات اپنے تک ہی رکھنا۔“

رات ہونے سے پہلے پہلے ہمارا جہاز اس

جزیرے سے بھی روانہ ہو گیا۔ اب ایک بار پھر سمندر تھا اور ہم تھے۔ مزید ایک ہفتہ سمندر میں سفر کرتے گزر گیا۔ ایک دن جبکہ آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور میں کچن میں برتن مانجھ رہا تھا بوڑھا عمر بچن میں آیا۔ ایک پیالہ صاف کرنے کے یہاں میرے پاس آ کر آہستہ سے کہنے لگا۔ ”آج دوپہر کے وقت جہاز ایک جزیرے میں داخل ہوگا۔ تم بیماری کا بہانہ بنا کر جہاز پر ہی رہنا۔ پاروتی تو جہاز پر ہی ہوگی۔ پھر بات کروں گا۔“

میرے دل میں امید کی کرن چمکی۔ بوڑھے عمر نے ہمارے فرار کی کوئی ترکیب سوچ لی تھی۔ دوپہر کے وقت جہاز ایک آبنائے میں داخل ہو گیا۔ دونوں جانب اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں۔ درمیان میں گہرا سمندر تھا جس میں ہمارا جہاز آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ آخر ایک جگہ ساحل کے قریب لنگر انداز ہو گیا۔ کپتان اپنے ساتھ کافی آدمیوں کو کشتیوں میں بٹھا کر جزیرے کی طرف چلا گیا۔ میں صبح سے بیماری کا بہانہ بنا کر اپنے کیمپن میں ہی پڑا تھا۔ جہاز کوڑے آدھ گھنٹہ گزر گیا تھا کہ بوڑھا عمر میرے کیمپن میں میرے لیے چاول اور کافی کا ڈونگا لے کر آ گیا۔ بس کر بولا۔

”تم بیمار تو نہیں ہو پھر بھی تمہارا حال پوچھنے آ گیا ہوں۔“ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے تھالی اور کافی کا گگ مجھے پکڑاتے ہوئے آنکھ مار کر کہا۔ ”تمہاری محبوبہ کو بھی ساتھ لایا ہوں مگر تمہیں صرف پانچ منٹ دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ وہ تمہارے پاس نہیں ٹھہر سکے گی۔“

یہ کہہ کر بوڑھا عمر کیمپن سے باہر نکل گیا۔ دوسرے لمحے پاروتی اندر داخل ہوئی۔ اس نے نیچے رنگ کی نئی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کانوں میں بندے تھے اور گلے میں سونے کا ہار بھی تھا۔ میں نے کہا۔

”پاروتی! کپتان تو تمہاری بڑی خدمت کر رہا ہے۔“

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ پہلے سے اترا ہوا تھا کہنے لگی۔

”تم مجھ سے مذاق نہ کیا کرو۔ میرا تو تمہا کو کھا کھا کر برا حال ہو گیا۔ ایک عرصے سے میں نے اپنے آپ کو سانپ سے نہیں ڈسوا یا۔ کھانے کو کچن سانپ نہیں ملا۔ اگر اور کچھ دیر یہ حالت رہی تو میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔“

میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ بوڑھا عمر آج ہمیں یہاں سے فرار ہونے کی کوئی ترکیب بتانے والا ہے۔ اسی لیے تو میں بیماری کا بہانہ بنا کر کیمپن میں ہی رہ گیا ہوں اور ملاخوں کے ساتھ جزیرے پر نہیں اترا۔

”تم سچ کہہ رہے ہو؟“ پاروتی نے خوش ہو کر کہا۔ میں نے اسے مزید تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”تم باگل ہو گئی ہو کیا؟ تمہیں کہا نہیں کہ اگر تم نے اس کم کی کوئی حرکت کی تو ہم زندہ نہ رہیں گے۔“

تھوڑی دیر میں پانچ منٹ گزر گئے اور بوڑھا عمر کیمپن میں آ گیا۔

”بس اب باتیں ختم۔ چلوڑکی میرے ساتھ واپس چلو۔“

پاروتی اٹھ کر اس کے ساتھ جانے لگی تو بوڑھے عمر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں آ رہا ہوں۔“

پاروتی کو لے کر بوڑھا چلا گیا۔ کوئی دس منٹ بعد واپس آیا اور میرے پاس بیٹھ ہی بولا۔

”تمہارے فرار کا یہی ایک موقع ہے۔ اگر تم نکل گئے تو نکل گئے۔ اگر جہاز والوں نے تمہیں پکڑ لیا تو پھر اپنا خاتمہ سمجھو۔“

کاچھونا سا ناپو آئے گا۔ اس کی دوسری جانب ایک اور جزیرہ ہے۔ اس جزیرے سے چھوٹے اسٹیمر بالنس ربر اور گرم مسالے وغیرہ لے کر انڈونیشیا کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں سے تم کسی اسٹیمر میں سوار ہو جانا۔ اگر تم اس میں کامیاب ہو گئے تو پھر تم سمجھ لینا کہ آزاد ہو گئے۔“

میری آنکھوں کے سامنے درندہاں کھل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا ہم آج رات ہی یہاں سے نکل جائیں؟“

”تم پوری طرح تیار رہو۔ باقی فرار ہونے کا سگنل میں شام کو آ کر دوں گا۔“

پاروتی کو میں یہ سب کیسے بتاؤں گا؟

میرے اس سوال پر بوڑھا عمر کہنے لگا۔

”اس کو میں سب کچھ بتا دوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو تم اپنے کیمپن میں ہی رہنا۔ میں شام کو آؤں گا۔“

میں شام تک اپنے کیمپن میں ہی رہا۔ شام کے وقت بوڑھا عمر آ گیا۔ کہنے لگا۔

”بیماری پکڑ لو۔ تمہیں آج آدھی رات کے وقت جہاز سے فرار ہونا ہے۔“

اس خبر نے میرے جسم میں ایک نئی جان ڈال دی۔ میں نے کہا۔

”میں بالکل تیار ہوں بابا جان!“

عمر میرے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

”میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہ سب کچھ کیا ہے اس لیے کہ تم مسلمان کے بچے ہو اور تم ان اسمگلروں کے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہتے۔ میں تمہیں اس حالت میں یہاں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں رات کے وقت آ کر تمہیں لے

جاؤں گا۔“

پھر اس نے اپنی پرانی جیکٹ کی جیب میں سے پندرہ بیس نوٹ نکال کر مجھے دیئے اور کہا۔

”یہ ڈیڑھ سو امریکی ڈالر ہیں۔ ان علاقوں میں قدم قدم پر کرنسی بدل جاتی ہے مگر امریکی ڈالر ہر کوئی خوشی سے لے لیتا ہے۔ یہ تم اپنے پاس رکھو راستے میں تمہارے کام آئیں گے۔“

وہ چلا گیا۔ میرے جسم میں ایک نئی طاقت آگئی تھی۔ مایوسی اور ناامیدی کے سارے خیالات دفن چکر ہو گئے تھے۔ وقت کا مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے وقت گزر رہا تھا۔ آخر آدھی رات کا وقت ہو گیا اور وعدے کے مطابق بوڑھا عمر بھی پہنچ گیا۔ اس نے مجھے نیلے رنگ کی جیکٹ اور اسی رنگ کی پرانی سی پتلون پہننے کوئی اور کہا۔

”اسے جلدی سے پہن لو۔ سب کچھ تیار ہے۔“

میں نے جلدی جلدی پتلون اور جیکٹ پہنی اور بوڑھے عمر کے ساتھ کہیں سے نکل آیا۔ راہ داری سنسان پڑی تھی۔ ہم سبز سیال جڑھ کر جہاز کے اوپر والے عرشے کے پچھلے حصے کی طرف نکل آئے۔ یہاں بھی کوئی پہرے دار نظر نہ آیا۔ میں اندھیرے میں اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

جہاز کے عقبی حصے میں آ کر مجھے نیچے جھانکنے کو کہا۔ میں نے نیچے دیکھا۔ مجھے سمندر کے پانی میں ایک چھوٹی کشتی جہاز کے پینڈے کے ساتھ اوپر نیچے ہوتی نظر آئی۔ میں نے بوڑھے سے کہا۔

”پاروتی کہاں ہے؟“
اس نے نیچے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”وہ کشتی میں بیٹھی ہے۔ اب تم بھی نیچے اتر جاؤ۔“

اس نے رسی کی ایک سیڑھی نیچے پہلے ہی سے لٹکا رکھی تھی۔ اس نیک دل بوڑھے مسلمان نے مجھے گنگے سے لگایا اور کہنے لگا۔

”کشتی کو جہاز کے پیچھے سے نکال کر ساحل کے مشرقی کنارے کی طرف لے جانا۔ اس طرف کوئی خطرہ نہیں ہے اور یاد رکھنا۔ کنارے پر پہنچنے ہی بالکل سیدھ میں مشرق کی جانب مار یلوں کے درمیان چلتے جانا۔ آگے سمندر کا ٹاپو آئے گا۔ کنارے کنارے چلتے جانا۔ آگے جا کر دونوں کنارے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد جب سمندر آیا تو وہاں چھبیس اسٹیمر مل جائے گا۔ یہ اسٹیمر مال لے کر رات کو بھی چلتے رہتے ہیں۔ جاذب خدا کے حوالے۔“

یقین کریں اس وقت میری آنکھوں میں آنسو چٹک اٹھے مگر وہ وقت آنسو بہانے کا نہیں عمل کرنے کا تھا۔ میں اللہ کا نام لے کر رسی کی سیڑھی پر پاؤں جما کر نیچے اترنے لگا۔ جب کشتی کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ پاروتی کشتی میں کھڑی مجھے پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں کشتی میں اتر گیا۔

اور دیکھا۔ اوپر مجھے بوڑھے عمر کا چہرہ نظر نہ آیا۔ کشتی میں دو چہرے تھے۔ میں نے پاروتی کو خاموشی سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود کشتی کو آہستہ آہستہ جہاز کے پینڈے کے ساتھ ساتھ چلانے لگا۔ میں اس طرح چہو چلا رہا تھا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ میں بوڑھے عمر کی ہدایت کے مطابق کشتی کو جہاز کے مشرق کی جانب لے گیا۔ رات اندھیری تھی۔ دور ساحل پر کہیں کہیں روشنیاں جھلک رہی تھیں۔ ساحل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے جہاز سے دور ہوتے ہی کشتی کی رفتار

تیز کر دی۔ ساحل کے پاس سمندر میں پہاڑیاں ابھری ہوئی تھیں۔ میں ان پہاڑیوں میں کشتی کو نکال کر ساحل پر لے آیا۔ ساحل پر آتے ہی ہم نے کشتی کو وہیں سمندر میں چھوڑ دیا اور اپنا رخ مشرق کی جانب جو نارمل کے جھنڈ نظر آ رہے تھے اس طرف کر کے دوڑنا شروع کر دیا۔ زمین ریتیلی اور سخت تھی۔ کہیں ریتیلی ہو جاتی تھی تو کہیں پتھری طرح سخت ہو جاتی تھی۔ آخر ہم نارمل کے جھنڈوں میں داخل ہو گئے۔ اب ہم قدم قدم چل رہے تھے کیونکہ جہازیاں ہمارا راستہ روک رہی تھیں۔ کافی دیر تک ہم ان جہازوں اور درختوں میں چلتے رہے۔ پھر ہمیں درختوں کے درمیان کچھ فاصلے پر ستاروں کی روشنی میں پانی کی چمک سی نظر آئی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

”سمندر کا ٹاپو آ گیا ہے۔ ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے ہمیں جہاز کی مصیبت سے نجات مل گئی۔“

میں نے رک کر پیچھے اندھیرے میں دیکھا اور کہا۔

”کوئی بحری ڈاکو ہمارا پیچھا نہ کر رہا ہو۔“
پاروتی نے غصے سے کہا۔
”اب تو اگر کاٹا کیتان بھی آ گیا تو میں اسے زندہ نہ چھوڑوں گی۔ تم بے فکر ہو کر چلو۔“
اور ہم اندھیرے میں سمندری ٹاپو کی طرف بڑھنے لگے۔

بہت جلد ہم اس جگہ پر پہنچ گئے جہاں سمندر جنگل کے اندر آ گیا تھا۔ ہم نے بوڑھے عمر کی ہدایت کے مطابق کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ یہ کنارہ کچھ دور چلنے کے بعد دوسرے کنارے کے ساتھ جا کر مل گیا تھا۔ اس طرح

سمندر نے یہاں ایک جھیل سی بنائی ہوئی تھی۔ اب ہمیں دوسری جانب اصل سمندر تک پہنچنا تھا۔ یہاں جنگل زیادہ تنجان نہیں تھا۔ درختوں کے درمیان خالی جگہ تھی جہاں گھاس اگی ہوئی تھی۔ ہم گھاس میں چل رہے تھے۔ ایک جگہ اچانک پاروتی رک گئی۔ میں نے پوچھا۔

”کیا ہوا؟“
وہ ایک طرف منہ کر کے فضا میں کچھ سوگھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا۔ کہنے لگی۔

”کتنے دن ہو گئے ہیں کھانے اور ڈسوانے کو کوئی سانپ نہیں ملا۔ مجھے اس طرف سے سانپ کی بو آ رہی ہے۔ تم یہیں ٹھہرو میں ابھی آتی ہوں۔“

مجھے مجبوراً وہاں رکنا پڑا۔ پاروتی ایک طرف اگی ہوئی اونچی اونچی گھاس میں گھس گئی۔ تھوڑی دیر بعد باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں سانپوں کا جوڑا لٹک رہا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں سانپوں سے بار بار اپنے جسم پر ڈسولیا۔ پھر دونوں کو کھانا شروع کر دیا۔ میں نے منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

پاروتی ہنس کر کہنے لگی۔
”تم بھی کہتے ہو گے کس ناگن سے پالا پڑ گیا ہے۔“
میں نے کہا۔ ”اب جلدی سے چلو۔ ہمیں آگے بھی جانا ہے۔“

سانپوں سے ڈسوانے اور انہیں کھانے کے بعد پاروتی کے بدن میں نئی طاقت آگئی تھی۔ وہ تیز تیز چلنے لگی۔ ہم کافی دیر تک جنگل میں چلتے رہے۔ آخر سمندر کا ساحل آ گیا۔ یہاں ہمیں رات کے اندھیرے میں کہیں کوئی گھاٹ یا اسٹیمر

نظر نہیں آ رہا تھا۔ پاروئی کہنے لگی۔

”بوڑھے عمر نے یہی جگہ بتائی تھی ان؟“

میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے سمندر کی ساحل کے مغرب کی جانب روشنی جھللاتی دکھائی دی۔ میں نے پاروئی سے کہا۔

”میرا خیال ہے گھاٹ ادھر ہے۔ آؤ چل کر دیکھتے ہیں۔“

جب ہم گھاٹ پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک بڑی کشتی ساحل سے لگی کھڑی تھی۔ اس پر ایک لائین روشن تھی۔ کشتی پر پہلے ہی سے بہت سامان لدا ہوا تھا۔ دو آدمی اس پر بانسوں کے گھسے لا رہے تھے۔ اندھیرے میں ہمیں ان کی شکلیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ایک آدمی کشتی میں لائین کے قریب کھڑا نہیں اپنی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ہم ڈرا آگے گئے تو اس آدمی نے ہماری طرف دیکھا اور اپنی زبان میں کچھ پوچھا جو ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے ہندوستانی میں کہا۔

”ہمیں جکار تہ جانا ہے۔ ہمارے پاس امریکی ڈالر ہیں۔“

امریکی ڈالروں کا سن کر وہ آدمی کشتی سے اتر کر ہمارے پاس آ گیا۔ نائے قد کا سانولا گول منول آدمی تھا۔ آنکھیں چھوٹی تھننے چوڑے تھے۔ وہ فلیپو لگ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

”کتے ڈالر ہیں تمہارے پاس؟“

میں نے کہا۔ ”جتنا کرایہ ملے گا ہم دیں گے۔“ اب دوسرے دو آدمی بھی ہمارے قریب آ کر ہمیں گھور گھور کر دیکھنے لگے۔ فلیپو نے ہنس کر کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ تم جو چاہو دے دینا۔ بیٹھ جاؤ کشتی میں۔ ہم جکار تہ ہی جا رہے ہیں۔“

میں نے محسوس کیا کہ رات کے اندھیرے اور

لائین کی دھیمی روشنی میں اس کی آنکھیں پاروئی کے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ہم کشتی میں اتر گئے۔ وہ ہمارے ساتھ آیا۔ اس نے ہمیں کشتی میں بانس کے گھسوں پوریوں اور لکڑی کے قہقہروں کے درمیان ایک جگہ بٹھا دیا اور بولا۔

”آرام سے بیٹھو۔ کوئی پرابلم نہیں۔ ہم تمہیں کھانے کو بھی دیں گے۔“

میں نے پوچھا۔ ”ہم جکار تہ کب پہنچیں گے؟“

اس آدمی یعنی فلیپو نے جیکٹ کی جیب سے چار نکال کر سلگایا اور بولا۔

”تین دن میں پہنچ جائیں گے۔ کوئی پرابلم نہیں۔ ہم ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔ طوفان آیا تو کشتی کنارے پر لے جائیں گے۔ ابھی تم ایسا کرو کہ دو آدمیوں کا کرایہ پچاس ڈالر دے دو اس میں تمہارے کھانے پینے کا خرچہ نہیں ہے۔ وہ جکار تہ پہنچ کر دے دینا۔“

میں نے جیب سے ڈالر نکال کر گننے اور پچاس ڈالر اس کے حوالے کر دیے۔ فلیپو نے جو کشتی کا مالک لگتا تھا ڈالروں کی طرف اور پھر اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا اور پچاس ڈالر اپنی جیکٹ میں رکھ لیے۔ پھر اپنے آدمیوں کو کچھ کہا۔ خود کشتی کے دوسرے سرے پر چلا گیا اور کشتی کی موٹر

اسٹارٹ کرنے لگا۔ یہ ایک بہت بڑی مال بروار کشتی تھی جس میں ایک موٹر لگی ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے بوڑھے عمر نے اسے سیر کہا تھا۔ دو تین بار سی کھینچنے سے انجن چل پڑا۔ اس کے ساتھ ہی کشتی بھی ساحل سے ٹھکے لگی۔ پاروئی میرے قریب ہی بیٹھی تھی۔ کہنے لگی۔

”مجھے ان آدمیوں کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

کشتی ساحل سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ جب ساحل سے کوئی ساٹھ ستر گز دور ہوئی تو اس نے اپنا رخ کھلے سمندر کی طرف کر لیا اور ایک خاص رفتار سے چلنے لگی۔

مجھے بھی ان لوگوں کی نیت پر شبہ تھا۔ ایک تو ان لوگوں نے میرے پاس کافی تعداد میں امریکی ڈالر دیکھ لیے تھے۔ دوسرے پاروئی کے کانوں میں سونے کے بندے اور گھسے میں سونے کا بار بھی ضرور رکھ لیا ہوگا۔ یہ دونوں مجھے جہاز کے کانے کہتان نے پاروئی کو عنایت کیے تھے اور وہ انہیں بھی ساتھ ہی لے آئی تھی۔ مگر میں اس لیے مطمئن تھا کہ ان چاروں آدمیوں نے منٹنے کے لیے اکیلی پاروئی ہی کافی تھی۔ کیونکہ جس عورت کو محض ایک خمر درسی عورت سمجھ رہے تھے انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک نہرین ناگن ہے۔

رات کے اندھیرے میں جزیرے کا ساحل روشن ہوتے ہی سیاہ لیکر کی طرح نظر آنے لگا۔ پھر یہ ساؤتھ بھی غائب ہو گئی اور کشتی کھلے سمندر میں آ گئی۔ کشتی کی شکل ایسی تھی کہ یہ تقریباً پچاس گز لمبا اور پندرہ بیس گز چوڑا ایک پلیٹ فارم سا تھا جس کے ایک سرے پر چھوٹا سا انجن

لگا تھا اور دوسرے سرے پر جمپوزی نما چھوٹا سا کیمین بنا ہوا تھا۔ اس کیمین کے باہر بانس کے ساتھ جاتی ہوئی لائین لٹک رہی تھی۔ کیمین کے اندر کئی کالالک فلیپو دو آدمیوں کیساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ وہ ساتھ ساتھ براڈی بھی لی رہے تھے۔ یہی وقت ان میں سے کسی کے قبضے کی آواز آ جاتی تھی۔ ایک آدمی کشتی کے دونوں پہلوؤں پر

چل پھر کر سامان اور بندھے ہوئے گھسوں کی چینگنگ وغیرہ میں لگا ہوا تھا۔ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ سمندر کی لہریں پرسکون تھیں اور مرطوب سمندری ہوا چل رہی تھی۔ میں اور پاروئی سامان کے درمیان جس رخ پر بیٹھے تھے وہاں سے ہمیں کشتی کا کیمین اور کھلا سمندر نظر آتا تھا۔ انجن بالکل اس طرح چل رہا تھا جس طرح موٹر سائیکل کی موٹر چلتی ہے۔ سامان کی دیکھ بھال کرنے والا ملاح بھی کبھی موٹر بھی آ کر دیکھ جاتا تھا۔ یہ موٹر بیزل سے چلتی تھی۔ کشتی کے کنارے اونچے تھے اور سمندر کا مانی نیچے نظر آتا تھا۔

پاروئی کہنے لگی۔

”جکار تہ پہنچ کر تم کہاں جاؤ گے؟“

میں بھی تمہارے ساتھ ٹکلتے ہی جاؤں گا۔

وہاں سے ہم کسی سمندری جہاز میں سوار ہو کر کلاکتہ پہنچ جائیں گے۔“

پاروئی آخر ٹکلتے کی پرہی لکھی لڑکی تھی۔ اس نے ایک ایسی بات کی طرف اشارہ کیا جس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا اور جو بہت اہم تھی۔

کہنے لگی۔

”ہمارے پاس کوئی پاسپورٹ ویزا نہیں ہے

جکار تہ کی پوئی تو ہمیں پکڑے گی۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی اس نے ٹھیک کہا تھا

جکار تہ ایک آزاد ملک تھا۔ ایک دوسرا ملک تھا۔

انڈیا میں تو ہمیں پاسپورٹ وغیرہ کی ضرورت ہی

نہیں تھی کیونکہ ابھی پاکستان بھی نہیں بنا تھا۔ ہم

کشمیر سے لے کر اس کداری تک جہاں جا رہے

بغیر پاسپورٹ ویزے کے آ جاسکتے تھے۔ لیکن

جکار تہ پہنچ کر تو ہمیں ان چیزوں کی اشد ضرورت

تھی۔ اس کے بغیر تو ہم جکار تہ کے ساحل پر پہنچتے

ہی گرفتار ہو سکتے ہیں۔ میں نے پاروتی سے کہا۔
”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ پولیس ہمیں پکڑ سکتی ہے۔“

مجھے خیال آیا کہ یہ لوگ کوئی جکارتہ کی بندرگاہ پر تھوڑی جائیں گے۔ یہ تو بندرگاہ سے کسی جنگل کے کنارے گھاٹ پر کھڑے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی غیر قانونی طور پر مال ادھر سے ادھر لے جاتے ہوں۔ اس طرح ہمیں جکارتہ کے ساحل پر اترنے کا موقع مل جائے گا۔ جب میں نے یہ بات پاروتی کو بتائی تو وہ یلدی۔

”ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ ایک بار جکارتہ پہنچ گئے تو پھر وہاں سے اٹھنا بھی کسی نہ کسی طرح پہنچ جائیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے پاروتی کہ ہمیں ان بحری لیبروں سے چھٹکارا ملا۔ اگر بوڑھا عمر ہماری مدد نہ کرتا تو یقیناً گردان بحری ڈاکوؤں کی قید سے نکلنا بہت مشکل تھا۔“

پاروتی بولی۔ ”وہ تمہارا مسلمان بھائی تھا۔ وہ تمہارے کام آگیا۔“
میں نے کہا۔ ”وہ بڑا اچھا انسان تھا۔ میں تو اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

پھر میں نے موضوع بدلے ہوئے پاروتی سے یونہی مذاق میں پوچھا۔

”تم نے کانے پیتان کو کیسے کہا تھا کہ تم تمباکو کھانا چاہتی ہو؟“

پاروتی مجھے اندھیرے میں ہنسی ہوئی نظر آئی۔ بولی۔

”وہ تو بالکل اجڑا آدمی تھا۔ وہ خود بھی کبھی تمباکو چبایا کرتا تھا۔ کہنے لگا۔ تم تمباکو کھاؤ گی یا چاؤ گی۔ میں نے کہا میں دونوں کام کرتی

ہوں۔ وہ منہ پھاڑ کر ہنسنے لگا۔ پھر اس نے مجھے ایک بکس میں سے ایک سگار نکال کر دیا جسے میں نے توڑ کر سارا تمباکو منہ میں ڈال لیا اور اسے چبانے لگی۔ اس گدھے کو کیا معلوم تھا کہ میں یہ سب کچھ اس کی جان بچانے کے لیے کر رہی ہوں۔ میں نے ایک سگار کا تمباکو تو اسی وقت کھالیا۔ دوسرے سگار کا تمباکو منہ میں ڈال کر چپاتی ری۔ بس اسی طرح ہر رات ایک سگار کھا لیتی اور ایک سگار چپاتی رہتی اور کانے بحری ڈاکو کی جان بچا لیتی۔“

میں اس لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا کہ اس کی زندگی بھی کیا زندگی بنی گئی ہے۔ کہاں وہ کلکتے کے اسکول میں پڑھا کرتی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ مستقبل میں اسکول ٹیچر بنے گی۔ اس کے ماں باپ اس سے کتنا پیار کرتے ہوں گے اور کہاں اب اس کی یہ حالت ہے کہ اب تک ہزاروں سائب کھا چکی ہے۔ ہزاروں سانپوں سے اپنے آپ کو ڈسوا چکی ہے۔ اس کے بدن کے ذرے ذرے میں اتنا زہر پیدا ہو چکا ہے کہ اگر کسی کو ذرا ساناخن چھو دے کسی بچے کا منہ چوم لے تو وہ اس کے زہر سے مر جائے گا۔

پاروتی بھی شاید اس وقت یہی کچھ سوچ رہی تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگی۔

”میں بھی کتنی ابھرا ہوں۔ اگر کلکتے پہنچ بھی گئی تو کیا منہ لے کر اپنے ماما پاپا کے پاس جاؤں گی۔ وہ تو مجھے پہچان بھی نہیں سکیں گے۔ جب میں اپنے ماما پاپا سے جدا ہوئی تھی اور سنہالی پیرے مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے تو میرا رنگ اتنا کالا نہیں تھا جتنا اب ہے میں سانولی ہوئی تھی۔“

میرے بال بڑے لمبے ہوتے تھے۔ اب تو میرے بال بھی سانپوں کے زہر کی گری سے جھڑ جھڑ کر چھوٹے ہو گئے ہیں۔ میرے ماما پاپا جی تو مجھے دیکھ کر بہت روئیں گے۔“

اور پھر رات کے اندھیرے میں مجھے پاروتی کی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ میں بھی اداس ہو گیا۔ واقعی اس لڑکی کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی تھی۔ انسان دوسرے انسان پر جتنا ظلم کرتا ہے شاید اتنا ظلم ایک جانور بھی دوسرے جانور پر نہیں کرتا۔ میں یونہی پاروتی کو جھوٹی تسلیاں دینے لگا۔ ”جی ہلکا نہ کرو پاروتی! ایک بار تم اپنے گھر پہنچ گئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ لوگ تمہارا علاج کرائیں گے۔ تمہاری کھوئی ہوئی صحت اور رنگ و روپ واپس آ جائے گا۔ تم دوبارہ اسکول میں داخل ہو کر پڑھائی شروع کر دینا۔ ابھی تمہاری عمر ہی کتنی ہے۔“

پاروتی ٹھنڈا سانس بھر کر چپ ہو گئی۔ کتنی سمندر میں معمول کی رفتار کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ سمندری موجوں کی ہلکی ہلکی آواز پیدا ہو رہی تھی جس کو کتنی کے دوسرے سرے پر لگی ہوئی موٹر کے شور نے کافی حد تک دبا دیا تھا۔ میری نظریں جھونپڑی نما کیمپن کی طرف اٹھ گئیں۔ کیمپن میں خاموشی چھائی تھی۔ پہلے فلیپو اور اس کے ساتھیوں میں سے کسی کے توجہ کی آواز سنائی دے چلی تھی۔ اب وہ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میں نے فضا میں خطرے کی بومبوس کی لیکن پھر سوچا کہ ایسی خطرے والی کوئی بات نہیں ہے ان لوگوں کو ہم پر حملہ کر کے کھال جائے گا۔ یہی چند ڈالر اور سونے کا ایک معمولی سا ہار اور بندے۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ محض چند پیسوں کے لیے اجنبی مسافروں کا خون کر دیا کرتے ہیں۔ آخر وہی ہو کر رہا جس کا مجھے ڈر لگا ہوا تھا۔ کتنی سمندر میں بی چلی جا رہی تھی۔ آسان پر صبح کے نور کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ چند لمحوں کے بعد صبح کاذب کی پہلی روشنی میں ہمیں کتنی میں لدا ہوا سامان اور سمندر کی نیلی موجیں صاف دکھائی دینے لگیں۔ میں نے پاروتی کی طرف دیکھا۔ وہ کٹری کے صہمیر دیں کے ساتھ ٹیک لگائے ایک طرف کوچنگی سو رہی تھی۔

کیمپن میں سے دو آدمی نکل کر ہماری طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک فلیپو تھا اور دوسرا اس کا ساتھی تھا۔ ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پستولوں نے ساری بات واضح کر دی۔ جب یہ لوگ ہمارے قریب آئے تو اس وقت باقی دو ملات بھی کیمپن میں سے نکل کر ہماری طرف بڑھنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں خنجر تھے۔ یہ لوگ ہمارے قریب آ کر رک گئے۔ فلیپو گردن نیڑھی کیے مکار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ہندوستانی زبان میں اس سے پوچھا۔

”کیا بات ہے بھائی؟ کیا کچھ پیسے چاہیں؟“

فلیپو نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ چاروں توجہ لگا کر ہنسنے لگے۔ اتنی دیر میں پاروتی بھی جاگ پڑی۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو مجھ سے پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

میں نے اسے خاموش رہنے کو کہا اور فلیپو سے دوبارہ پوچھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ فلیپو کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ کرسٹ آواز میں بولا۔

”ابھی بتاتا ہوں میں کیا جاتا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے آگے بڑھ کر پاروتی کو بازو سے پکڑا اور بھیج کر اپنے ساتھ لگا کر پستول اس کی کٹپٹی پر رکھ کر بولا۔

”تمہارے پاس جو کچھ ہے نکال کر رکھ دو۔“

میں نے اپنی جیکٹ کی جیب میں سے سارے ڈالر نکال کر رکھ دیئے۔ فلیپو نے اپنے ساتھیوں کو اشار کیا۔ انہوں نے ڈالر اٹھائے اور میری جیبوں کی تلاشی لی۔ پھر مجھے ٹائیکلون کی رسی سے

شہتیروں کے ساتھ باندھ دیا۔ اس دوران میں پاروتی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ فلیپو کے جسم کے کسی بھی حصے میں ناخن چھو کر اسے ہلاک کرے۔ کیونکہ اس طرح باقی تینوں آدمی اس کو کسی صورت میں بھی زندہ نہ چھوڑتے اور اسے فوراً گولی مار دیتے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے بھی گولی سے اڑا دیتے۔ اس کے لیے ہمیں کیا حکمت عملی کی ضرورت تھی۔ شاید یہ بات پاروتی بھی سمجھ گئی تھی۔ اس نے کوئی مدافعت یا اپنی طرف سے حملہ نہ کیا۔

مجھے باندھنے کے بعد وہ لوگ پاروتی کو کھینچتے ہوئے کشتی کے کیمین میں لے گئے۔ کیمین کی لکڑی کی دیواریں تھیں اور میری طرف کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ آدمیوں کے قدموں اور اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آواز ضرور آرہی تھی۔ مجھے ایک ہی فکر لگتی تھی کہ دشمن چار ہیں پاروتی انہیں کس طرح ہلاک کرے گی۔ مگر پاروتی اس قسم کے مردوں کی جنسی کیفیات سے پوری طرح باخبر ہو چکی تھی۔ اس نے وہی کام کیا جو اسے ایسے نازک حالات میں کرنا چاہیے تھا۔ کیمین میں ایک دم خاموشی

چھا گئی۔ صرف کشتی کے انجن اور سمندری لہروں کی آواز آرہی تھی۔ کیمین پر کوئی دو تین منٹ تک ایک سکوت سا طاری رہا پھر کشتی کے تھقبے کی آواز آئی۔ اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ کوئی دس منٹ کے بعد دن کی روشنی میں پاروتی ساڑھی سنبھالتی ہوئی کیمین میں سے نکلی۔

میری جان میں جان آئی۔ میرے پاس آ کر اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے بولی۔

”سب کو ٹھکانے لگا دیا ہے جا کر دیکھ لو۔“

میں نے کہا۔ ”پہلے میری رسی تو کھولو۔“

پاروتی نے مسکراتے ہوئے میری رسی کھول دی اور میں جلدی سے کیمین کے اندر چلا گیا۔ کیمین کے اندر کا نقشہ یہ تھا کہ چار دن غنڈے مر چکے تھے اور فرش پر ادھر ادھر لٹے سیدھے پڑے تھے۔ ان سب کے منہ سے سبز رنگ کی جھاگ نکل رہی تھی۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ جس آدمی نے میرے ڈالر جیب میں ڈالے تھے اس کی جیب میں سے ڈالر نکال کر اپنے قبضے میں کیے پھر پاروتی کے پاس آ گیا۔

”پاروتی! تم نے بڑی عقل مندی سے کام لیا۔ مجھے تو یہی فکر تھی کہ تم ان چاروں کو کس طرح مارو گی۔“

پاروتی لکڑی کے بڑے شہتیر پر بیٹھی اپنے کانوں میں سونے کے بندے ڈال رہی تھی۔ اس کے گلے میں سونے کا ہار بھی موجود تھا وہ یہ ساری چیزیں بھی دایں لے آئی تھی۔ کہنے لگی۔

”بس کچھ نہ پوچھو دو آدمیوں کی گردن کو چما دو آدمیوں کے جسم میں جینے سے ناخن چھو دیئے۔ اس کے بعد بھلا وہ کیسے زندہ رہ سکتے

تھے۔“

پھر وہ جلدی سے شہتیروں پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور جس طرف سمندر میں کشتی جا رہی تھی اس طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

”اب ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ کیمین ہم سمندر میں بھٹک نہ جائیں۔“

پیشانی مجھے بھی ٹپکنی یہ اطمینان ضرور تھا کہ کشتی میں ہماری جانیں محفوظ ہیں۔ میں نے کہا۔

”جس رخ پر ان لوگوں نے کشتی کو ڈال رکھا ہے ہم اسی رخ پر کشتی کو چلاتے جائیں گے پہلے ان بد معاشوں کی لاشیں تو ٹھکانے لگائیں۔“

ہم کیمین میں آ گئے۔ چاروں بد معاشوں کی لاشوں کو گھسیٹ کر باہر نکالا اور سمندر میں پھینک دیا۔ کیمین کے اندر ایک ذیل لگا تھا جس سے کشتی کے رخ کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ کچھ گھسے پڑے اسے گیسر بھی لگے ہوئے تھے جو میری سمجھ سے باہر تھے۔ ذیل کو لوہے کی تار سے باندھا ہوا تھا۔ جس سے ذیل حرکت نہیں کر رہا تھا اور کشتی ایک ہی رخ پر بچے چلی جا رہی تھی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

”یہ بالکل موثر کار کی طرح ہے۔ ابھی تو اس کا ڈرائیونگ ذیل ان لوگوں نے باندھا ہوا ہے جب دیکھیں گے کہ کشتی کا رخ ادھر ادھر ہو رہا ہے تو ذیل کی سمت درست کر لیں گے۔ ہمیں سورج سے کشتی کے رخ کو قائم رکھنا ہوگا۔ اس وقت سورج ہمارے پیچھے ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم شمال مغرب کی طرف جا رہے ہیں اور ہمیں کشتی کو اسی طرف لے جانا چاہیے۔“

پاروتی کیمین کی پہلو والی کھڑکی میں سے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”سمندر کی لہریں کچھ زیادہ اونچے ہونے لگی ہیں۔“

یہ میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ کشتی نے سمندر کی موجوں پر زیادہ ہلکولے کھانے شروع کر دیئے ہیں۔ اب جو میں نے کیمین سے باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھا تو دور سے کالی سیاہ گھٹائیں اندی چلی آرہی تھیں۔ ان گھٹاؤں میں کسی وقت بجلی بھی لہر اچلتی تھی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

”لگتا ہے سمندر میں طوفان آنے والا ہے۔“

”ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیمین یہ کشتی الٹ نہ جائے۔“

میں نے دور بادلوں پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

”اتنا خطرناک طوفان نہیں لگتا۔ بہر حال ہمیں کیمین میں جا کر بیٹھ جانا چاہیے۔“

اتنی دیر میں ہوا تیز ہو گئی تھی سمندر کی موجیں کشتی کو زیادہ اونچے نیچے کرنے لگی تھیں۔ کیمین میں آ کر ہم نے ٹوٹا ہوا دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائیونگ ذیل کھولنے لگا تو پاروتی نے مجھے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ سیاہ گھٹائیں اب ہمارے اوپر پہنچ گئی تھیں۔ بادل گر بنے لگے۔ بجلی کڑکے لگی اور پھر بارش شروع ہو گئی۔ یہ سمندر کی بارش تھی۔ طوفانی بارش تھی۔ کشتی ہلکولے کھانے لگی۔ ہواؤں کا شور بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ سمندر کا پانی کیمین کے دروازے سے ٹکرانے لگا۔ پاروتی اس قسم کر کونے میں بیٹھ گئی۔

سمندر میں طوفان آیا ہوا تھا۔ طوفانی ہوا میں چیخ رہی تھیں۔ زبردست بارش ہو رہی تھی۔ کشتی کو سمندر کی پھری ہوئی موجیں ادھر اُدھر اچھالتی ہوئی لیے جا رہی تھیں۔ ایک بڑی

موج کشتی کے اوپر آگئی اور ایک طرف کے سارے پاس اور بہتر سمندر میں گر گئے۔ موٹر کا انجن بند ہو چکا تھا۔ میں نے ڈھیل کی رسی کھول لی تھی اور اسے اناڑیوں کی طرح یونہی ادھر سے ادھر گھمایا جا رہا تھا۔ اس خیال سے کہ شاید اسی طرح کشتی اٹلنے سے بچ جائے۔ کشتی ابھی تک اس لیے نہیں اٹلی تھی کہ یہ ایک پلیٹ فارم کی طرح تھی جو تختوں کو جوڑ کر بنادیا گیا تھا۔ پاروٹی ڈر کر سین میں ایک طرف کو بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کچھ کہا مگر مجھے طوفان کے شور میں کچھ سمجھ نہ آیا۔ پانی اور بارش کی بو چھاڑیں کہیں کی دیواروں سے نظر رہی تھیں۔ میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ یا خدا ہمیں اس طوفان سے بچالے۔ طوفان جھنسنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ میں خود بھی دل میں خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اگر کشتی الٹ گئی تو ہمارا زندہ بچنا محال ہے۔ اس قدر بھری ہوئی سمندری موجوں میں بڑے سے بڑا تیراک بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

سمندر پر بارش نے دھند کی چادری پھیلا دی تھی۔ کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ہم شمال کو جا رہے ہیں یا جنوب کو جا رہے ہیں۔ ایک طرف سے سمندری کی بڑی موج نے کشتی کو اچھالا تو پاروٹی چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گئی۔ ڈھیل میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں گر پڑا۔ بڑی مشکل سے کہیں میں ٹھکی ہوئی ایک ہک کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے آپ کو سنبھالا۔ پاروٹی نے چیخ کر کہا۔ ”میں مرنا نہیں چاہتی۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔“

اور پھر وہ زور زور سے روئے گی۔ زندگی کتنی پیاری چیز ہے موت کو سامنے دیکھ کر زندگی زیادہ پیاری لگنے لگتی ہے۔ میں نے چلا کر پاروٹی سے

کہا۔ ”روؤں نہیں اپنے بھگوان سے تم بھی دعا کرو۔“

کہیں کبھی ایک طرف سے ادھیچا ہو جاتا اور کبھی ایسے نیچے چلا جاتا جیسے اب اوپر نہیں اٹھے گا۔ کہیں کی وجہ سے ہم سمندر کی طوفانی موجوں سے بچے ہوئے تھے۔ مگر نہ موجیں کب کی بہا کر لے گئی ہوتیں۔ نہ جانے اس حالت میں کتنا وقت گزر گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ طوفان کی شدت میں کمی آنے لگی ہے۔

میں نے اٹھ کر ڈھیل کو پکڑ لیا اور کہیں کے شیشے میں سے سمندر کو دیکھا۔ سمندر کے جہان میں کوئی کی واقع نہیں ہوئی تھی۔ چٹان ایسی موجیں بہت ناک انداز میں اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ کشتی بھی ان کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ مگر بارش رک گئی تھی اور ہوا کی تیزی بھی کم ہو گئی تھی۔ میں نے پاروٹی سے کہا۔

”خدا نے ہماری دعا قبول کر لی ہے پاروٹی طوفان ختم رہا ہے۔“

پاروٹی ٹکٹوں میں سر دیئے کو نے میں بیٹھی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بارش کے رکتے ہی دھند چھٹ گئی تھی اور سمندر نظر آنے لگا تھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی وہاں تک سمندر ہی سمندر تھا جس میں بڑی بڑی موجیں اٹھ رہی تھیں۔ کشتی کا انجن خاموش ہو چکا تھا۔ کشتی کے پیچھے لگا ہوا وہ جتنے بھی شاید ٹوٹ چکا تھا جس کو ڈھیل کنٹرول کرتا تھا اور اس کی وجہ سے کشتی کا رخ بدلا جاتا تھا کیونکہ ڈھیل میں وہ تھی نہیں رہی تھی اور آسانی سے دائیں بائیں گھوم جاتا تھا۔

ہماری کشتی اللہ کے جھرو سے سمندر میں کسی

معلوم منزل کی طرف چلی جا رہی تھی۔ یہی بہت قیمت تھی کہ کشتی طوفان میں غرق نہیں ہوئی تھی اور ہماری جانیں بچ گئی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا طوفان کم ہوتا گیا۔ آخر طوفان آگے نکل گیا اور سمندر کسی حد تک پرسکون ہونے لگا۔ پاروٹی سر پکڑ کر بیٹھی تھی۔ اس کا سر چکر رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا۔

”فکر نہ کرو پاروٹی! طوفان نکل گیا ہے۔ ہم بہت جلد کسی نہ کسی جزیرے پر پہنچ جائیں گے۔“

پاروٹی نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اسے چکر آ گیا اور وہ دوبارہ جلدی سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔ سمندر اگر پرسکون بھی ہو تو بڑے سے بڑا جہاز بھی تھوڑا بہت ضرور ڈولتا ہے اور اس کے ڈولنے سے آدمی کی طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔ اس کو کسی سبک نہیں یعنی سمندری علالت کہتے ہیں۔ مگر بعض لوگوں کی سمندری سفر میں طبیعت بالکل ٹھیک رہتی ہے۔ یہ میں نے سن رکھا تھا۔ میری بھی طبیعت بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔ پاروٹی کو ضرور چکر آرہے تھے۔ میری نظر پر کہیں کے شیشے میں سے سمندر کو دور تک دیکھ رہی تھیں۔ مگر سامنے کی جانب جس طرف کشتی بہت چلی جا رہی تھی کسی جزیرے کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کشتی پر فلپیو جو مال لا کر لے جا رہا تھا وہ سارے کا سارا سمندر میں بہہ چکا تھا۔ کشتی ایک ویران پلیٹ فارم کی طرح بالکل خالی ہو گئی تھی۔ میں نے کہیں کے دروازے کی چنجی کھولی اور باہر نکل آیا۔ کشتی اب اتنی زیادہ نہیں ڈول رہی تھی۔

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ کسی طرف بھی زمین کی سیاہ لکیر نظر نہ آئی۔ میں جلدی سے کہیں میں آ کر

پاروٹی کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے اسے کہا۔ ”پاروٹی! کشتی خدا کے جھرو سے چلی جا رہی ہے۔ کہیں زمین نظر نہیں آئی۔“

پاروٹی نے کسی حد تک اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ کہنے لگی۔ ”بھگوان نے ہمیں بچایا۔“

اتنا کہہ کر اس نے اپنا سر ٹکٹوں میں دے دیا۔ میں کچھ دیر شکستہ کہیں میں پاروٹی کے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران سمندر کا جہان تقریباً ختم ہو گیا تھا اور کشتی معمول کے مطابق صرف اوپر نیچے ہوتی رہے جا رہی تھی۔ میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ میں نے آنکھیں کھلیں سیکڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ کہیں زمیں کے آثار نہیں تھے۔ میں دل میں سوچنے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ طوفان نے ہمیں اس وسیع و عریض سمندر میں لا کر ڈال دیا ہے جو براعظم ایشیا اور براعظم امریکہ کے درمیان پھیلا ہوا ہے؟ اس خیال ہی سے میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اگر ایسی بات بھی تو پھر ہمارا زندہ بچنا ناممکن تھا۔ یہ سمندر ہمیں بہت جلدی بھوکا پیاسا مار دے گا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اور پیاس بھی لگ رہی تھی۔ سمندر کا پانی اس قدر کڑوا ہوتا ہے کہ آپ ایک گھونٹ بھی نہیں پی سکتے۔ کشتی میں جو تھوڑا بہت راشن پانی رکھا ہوا تھا وہ سارے کا سارا سمندر کی نذر ہو چکا تھا۔

مجھے پاروٹی کی آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ کہیں کے دروازے میں کواڑ کے سہارے کھڑی تھی۔ میں جلدی سے اس کے پاس آ گیا۔

”اب کیسی طبیعت ہے پاروٹی؟“

”ہاں، اب مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔“

”ٹھیک ہوں۔“

پھر وہ سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔

”ہم کہاں آ گئے ہیں؟“

میں نے زلفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”کچھ معلوم نہیں۔ اب تو کشتی جہاں لے جائے لے جائے۔“

سمندر کی طوفان سے ہماری جان تو بچ گئی تھی

مگر اب ہمیں ایک ایسی موت کا سامنا تھا جس نے

آہستہ آہستہ ہمیں بھوک پیاس سے بڑھال کر کے

ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر مارنا تھا۔ یہ بڑی خوف کی

موت تھی۔ میں نے ایسے کئی واقعات رسالوں میں

پڑھے تھے کہ جہاز ڈوب گیا۔ کچھ آدمی کشتی میں

سوار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر سمندر کا

اذیت ناک سفر شروع ہو گیا۔ بھوک پیاس نے

انہیں بڑھال کر دیا۔ سورج کی تیش نے ان کے

جسموں کو خشک کر دیا۔ وہ ایک دوسرے کو بھوک

لگا ہوں سے دیکھتے رہے۔ جب کوئی مرجھاتا تو باقی

اس کی لاش کو نوچ کر کھا جاتے۔ میری روح اس

تصور ہی سے کانپ اٹھی۔ خدا نہ کرے کہ وہ وقت

ہم پر آئے کہ ہمیں ایک دوسرے کی لاشوں کو

کھانا پڑے۔ دن گزر گیا، رات آ گئی۔ بھوک تو

مجھ سے برداشت ہو رہی تھی مگر پیاس نے میری

زبان کو لکڑی کی طرح سخت کر دیا تھا۔ پاروتی بھی

ایک طرف بڑھال ہو کر پڑی تھی۔ آسمان پر بادل

اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ میں بارش کی دعا

مانگنے لگا۔ بارش کا پانی پی کر ہم زندہ رہ سکتے تھے۔

آدھی رات کے وقت بارش ہونے لگی۔

پاروتی اور میں دونوں آسمان کی طرف منہ کھول کر

بیٹھ گئے۔ ہم نے بالکل اسی طرح اپنے منہ کھول

رکھے تھے جس طرح چڑیا کیے بچے انہی ہاں کو دانہ

لاتے دیکھ کر گھونسلے میں منہ کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔

بارش کا پانی ہمارے حلق میں اتر رہا تھا اور

ہماری جان میں جان بڑھ رہی تھی۔

بارش کے پانی میں اگرچہ وہ طاقت نہیں ہوتی

جو زمین کے پانی میں ہوتی ہے لیکن اس وقت

بارش کا پانی ہمارے لیے آب حیات تھا۔ جی بھر کر

پانی پی لینے سے ہمارے اندر طاقت ہی آ گئی۔ ہم

وہیں لیمن میں آ کر لیٹ گئے۔ خدا جانے کب

ہمیں نیند آ گئی۔ آکھ کھلی تو لیمن کے ٹوٹے

ہوئے شیشے میں سے دھوپ اندر آرہی تھی۔

پاروتی سو رہی تھی۔ میں اٹھ کر باہر آیا۔ آسمان

بالکل صاف تھا۔ دھوپ سمندر پر چمک رہی تھی۔

سمندر کی لہریں پرسکون تھیں۔ میں نے ایک طرف

نگاہ ڈالی تو مجھے ایک سیاہ لکیر مشرق سے مغرب کا

طرف پھیلی ہوئی نظر آئی۔

یہ یقیناً زمین کے آثار تھے۔ کشتی اس طرف

جاری تھی میں نے جلدی سے پاروتی کو جگا کر سیاہ

لکیر دکھائی۔ اس کے چہرے پر بھی رونق آ گئی۔

ہم دہیں بیٹھ گئے اور سیاہ لکیر کو کھینچ کر دیکھنے

لگے۔ آہستہ آہستہ سیاہ لکیر سنسنی لگی۔ سنسنی سنسنی

سیاہ لکیر ایک دھبہ سا بن کر ابھر نے لگی۔ سمندر میں

درختوں کی کچھ جھاڑیاں بھی تیرتی نظر آئیں۔

میں نے خوش ہو کر پاروتی سے کہا۔

”یہ ضرور جاوا اسٹرا کا کوئی جزیرہ ہوگا۔“

اسنے میں دور سے دو تین کے ناریل لہروں پر

تیرتے دیکھے۔ جب وہ کشتی کے قریب آئے تو ہم

نے انہیں اٹھالیا۔ انہیں توڑ کر ان کا میٹھا پانی

پیا اور گودا کھا کر اپنی بھوک اور پیاس مٹائی۔ وہ

سے نظر آتا تھا۔ دھبہ اب اوٹھی اوٹھی پہاڑیوں کی

شکل اختیار کر گیا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد سمندر کی

لہروں نے ہماری کشتی کو زمین کے ساحل پر

چڑھا دیا۔

ہم نے خدا کا شکر ادا کیا اور کشتی سے اتر

کر وہیں پانی میں ریت پر بیٹھ گئے۔ پھر اٹھے اور

پانی میں چلتے ساحل کی خشک ریت پر آ کر دونوں

جانب نگاہ دوڑائی۔ یہ کسی جزیرے کا ساحل معلوم

ہوتا تھا۔ ریتلا ساحل دور ناریل کے درختوں تک

چلا گیا تھا۔ ہم درختوں کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔

پاروتی کہنے لگی۔

”کیسے پہ چلے گا یہ کونسا جزیرہ ہے۔ یہاں

تو کوئی آبادی نظر نہیں آئی۔“

جزیرے کا وہ ساحل جہاں ہم بیٹھے تھے غیر

آباد تھا۔ نہ کہیں کوئی جھوپڑی تھی نہ کسی جگہ کوئی

کشتی کھڑی تھی۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

”ساحل کے ساتھ ساتھ چل کر دیکھتے

ہیں شاید جزیرے کی دوسری طرف لوگ رہتے

ہوں۔“

ہم ساحل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ جزیرہ بڑا

پر اسرار تھا۔ ساحل پر ناریل اور ٹاٹر کے درخت

قطار در قطار لگے تھے۔ جزیرے کے اندر چھوٹی

چھوٹی پہاڑیاں اور ٹیلے تھے جن پر جھاڑیاں اگی

ہوئی تھیں۔ بہت جلد ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ جزیرہ

بڑا چھوٹا ہے اور سمندر میں گھرا ہوا ہے اور سب

سے زیادہ پریشان کر دینے والی بات یہ تھی کہ اس

جزیرے پر کوئی آبادی نہیں تھی۔ کہیں کسی جنگلی

قیلے والوں کے بھی جھوپڑے نہیں تھے۔ ہم نے

سارا جزیرہ گھوم کر دیکھ لیا۔ جزیرے کے اندر بھی

کافی درخت تھے۔ ان میں جنگلی کیلے کے درخت

تھے۔ ہم نے آکیلے توڑ کر کھائے اور لکڑی کو مٹائی۔

پاروتی کہنے لگی۔

”میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ تم یہاں بیٹھو میں

جنگل میں سانپ تلاش کرتی ہوں۔ یہاں سانپ

ضرور ہوں گے۔“

میں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ

درختوں کی طرف جا چکی تھی اور اونچی اونچی

جھاڑیوں نے اسے چھپا لیا تھا۔ میں ناریل کے

درخت کے نیچے گرے پڑے ناریل میں سے ایک

ناریل کو اٹھا کر ٹوڑنے لگا۔ اسے توڑ کر وہیں بیٹھ

گیا اور اس کا پانی پینے لگا۔

ناریل کا پانی اس قدر میٹھا اور عجیب سی پاکیزہ

خوشبو والا تھا کہ میں خدا کی قدرت پر حیران رہ

گیا۔ اللہ میاں نے انسان کو کیسی کیسی نعمتوں سے

نوازا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں زمین

پر صرف ایک ہی انسان باقی رہ گیا ہوں اور یہ

زمین کے درخت کا پہلا ناریل ہے۔ تھوڑی دیر

بعد پاروتی جھاڑیوں سے نکل کر آئی نظر آئی۔ اس

کے ہاتھ میں ایک بھورے رنگ کا سانپ تھا جس

کو اس نے گردن سے پکڑ رکھا تھا۔ میرے پاس

آ کر بیٹھ گئی۔

”بڑی مشکل سے یہ سانپ ملا ہے۔ اس سے

میں نے دوسرے ڈسوا یا ہے۔ اب اسے کھا جاؤں

گی۔“

میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ پاروتی ہنسنے

لگی۔

”کبھی تو مجھے سانپ کھاتے دیکھ لیا کرو۔“

میں نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم یہ مکروہ

عادت ترک کر دو۔ یہ شائستہ انسانوں کا کام نہیں

ہے۔“

”کلکتہ جاکر شاید یہ عادت چھوڑ دوں

وہاں میں دوبارہ اسکول میں داخل ہو جاؤں گی بس ایک بار میں کتنے پہنچ جاؤں۔“

ہم وہاں سے اٹھ کر ساحل سمندر پر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہاں سے اگر نکلیں گے تو آگے کس طرف جائیں گے؟“

ہماری بڑی سستی ابھی تک دور سمندر کے ساحل پر ایک طرف آدھی پانی میں اور آدھی ریت میں گھری تھی۔ پاروتی نے کہی۔

”اس سستی کو ہمیں کسی چیز سے باندھ دینا چاہیے۔ اگر سمندری موجیں اسے کھینچ کر لے گئیں تو ہم اس جزیرے میں پھنس جائیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”اس کی کیا ضرورت ہے۔ اتنی بڑی سستی ہے۔ سمندر بھی پرسکون ہے۔ سستی کہاں چلی جائے گی۔“

میں اس بات کی بالکل خبر نہیں تھی کہ سمندر کی لہریں جو سستی تک آ کر بار بار واپس چلی جاتی ہیں انہوں نے سستی کو آہستہ آہستہ اپنی طرف کھسکانا شروع کر دیا ہے۔ اس وقت آسمان پر ایک طرف سے بادل آنے لگے تھے۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

”چلو جزیرے کی دوسری طرف چل کر دیکھتے ہیں شاید وہاں لوگ رہتے ہوں جن کی جھونپڑیوں پر ہماری نظر نہ پڑی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ جزیرے کے دوسرے ساحل کا ایک بار پھر جائزہ لیتے ہیں۔“

جنگلی کیلے اور نارمل کھانے کے بعد ہمارے جسموں میں طاقت واپس آ چکی تھی۔ ہم اٹھ کر جزیرے کے دوسرے ساحل کی طرف چلے گئے۔ ہم جزیرے کے اندر سے چو کر جانے کے بہانے

ساحل کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اب ہم بڑے غور سے جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان دیکھتے جا رہے تھے۔ یہ جزیرے کا مشرقی رخ تھا۔ بادل اس طرف سے اٹھنا کر رہے تھے۔ اچانک تیز ہوا چلنے لگی۔ جزیرے کے اندر کی جانب درختوں کے نیچے ایک جھونپڑے کی چھت پر نظر پڑی۔ میں نے پاروتی کو وہ چھت دکھاتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے وہاں ضرور کوئی رہتا ہے۔ چلو چل کر معلوم کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیں ضرور بتاویں گے کہ یہ جزیرہ کس سمندر میں واقع ہے اور یہاں سے جاو اسٹرا کا ملک کس سمت کو ہے۔“

پاروتی نے کہا۔

”تم آگے آگے چلو میں کچھ فاصلہ ڈال کر تمہارے پیچھے آتی ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ تم پر حملہ کر دیں۔ اس صورت میں میں تمہیں بچا سکوں گی۔“

میں آگے آگے اور پاروتی کوئی سات اٹھ قدموں کا فاصلہ ڈال کر میرے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ میں جھونپڑے سے کوئی پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر ایک درخت کے پیچھے ہو گیا اور غور سے جھونپڑے کی طرف دیکھنے لگا۔ جھونپڑا پران لگتا تھا۔ میں نے نیچے سے ایک پتھر اٹھا کر جھونپڑے کے کچلے دروازے کے آگے پھینکا اس خیال سے کہ اگر کوئی جھونپڑے کے اندر ہوگا تو باہر ضرور نکلے گا۔ مگر کوئی باہر نہ نکلا۔ اس دوران پاروتی بھی میرے قرب پہنچ گئی۔ سرگوشی میں بولی۔

”کیا کر رہے ہو؟“

میں نے سکولائی لگتا ہے جھونپڑے میں کوئی

نہیں رہتا۔ میں نے پتھر پھینکا تھا کوئی باہر نہیں نکلا۔“

پاروتی بولی۔ ”تم یہاں ٹھہرو میں جا کر پتہ کرتی ہوں۔“

میں وہیں درخت کے پیچھے چھت کر کھڑا رہا۔ پاروتی درخت کے پیچھے سے نکلی اور آہستہ آہستہ جھاڑیوں کو پیچھے ہٹاتی جھونپڑے کی طرف چلنے لگی۔ میں سانس روکے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پاروتی جھونپڑے کے پاس آ کر ایک طرف ہو گئی۔ پھر اس نے زمین پر سے درخت کی ٹوٹی ہوئی ٹنٹی اٹھا کر جھونپڑے کے دروازے میں جھٹکی۔ اندر سے کوئی نہ نکلا۔ پاروتی آڑھ پھوڑ کر جھونپڑے کے سامنے آ گئی۔ اس نے جھک کر جھونپڑے میں نظر ڈالی۔ پھر میری طرف رخ کر کے بولی۔

”آ جاؤ۔ جھونپڑے میں کوئی نہیں ہے۔“

میں دوڑ کر اس کے پاس چلا گیا۔ میں نے بھی جھونپڑے کو اچھی طرح سے دیکھا۔ وہ خالی تھا۔ زمین پر خشک پتوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

”اس جھونپڑے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یہاں کوئی آدمی ضرور رہتا ہے۔ ہمیں ایک طرف چھپ کر اس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی آ جائے۔“

پاروتی نے جھونپڑے کے آگے جو خالی جگہ تھی اس پر نگاہ ڈال کر کہا۔

”میرا تو خیال ہے کہ یہ جھونپڑا دیوتوں سے خالی پڑا ہے۔ اگر یہاں کوئی آدمی رہا ہوگا تو یہاں آگ جلانے کے کوئی نہ کوئی آثار ضرور ملتے۔ مگر یہ جگہ تو بالکل صاف ہے۔“

میں نے سکولائی لگتا ہے یہ کوئی جنگلی آدمی ہو

اور جانوروں پرندوں کے گوشت کو شکار کے بعد کچا ہی کھا جاتا ہو۔“

پاروتی نے کہا۔ تو پھر تو یہ کوئی آدم خور قسم کا جنگلی آدمی ہوگا۔ میں نے اپنی سکول کی کتاب میں پڑھا تھا کہ جزیروں میں جنگلی لوگ زندہ انسانوں کو پکڑ کر کھا جاتے ہیں۔“

میں نے ہنس کر کہا۔

”جادو اسٹرا کے علاقوں میں ایسے آدم خور جنگلی نہیں ہوتے۔ ایسے لوگ تو افریقہ کے جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔“

ہم جھونپڑے کے پاس بیٹھ گئے تھے۔ اس دوران ہوا نے آدھمی کی شکل اختیار کر لی۔ درختوں کے اوپر کے حصے جھونپڑے لگے۔ ہم پر ان درختوں کے پتے اور خشک ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ پاروتی بولی۔

”طوفان پھر آ رہا ہے۔ چلو واپس کسی جگہ چھپ جاتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔“

ہم وہاں سے واپس چل پڑے۔ درختوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے ہوا کی شدت کا ہمیں زیادہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ جزیرہ کوئی اتنا وسیع بھی نہیں تھا۔ جیسے ہی ہم درختوں سے نکل کر ساحل پر کھلے سمندر کے سامنے آئے تو ہمیں پتہ چلا کہ ہوا آدھمی کی طرح چل رہی ہے۔ اتنے میں بارش بھی شروع ہو گئی۔ سمندر کی موجیں دور سے ابھو ابھر کر ساحل کی طرف آ رہی تھیں۔ مجھے اچانک اپنی سستی کا خیال آ گیا۔ میں نے پاروتی سے کہا۔

”کہیں ہماری سستی سمندر میں تو نہیں بہہ گئی؟“

پاروتی بھی فکر مند ہو گئی۔ ہم اٹھ کر درختوں کے ساتھ ساتھ سمندر کی لہرں جانب دوڑنے لگے

بدلتا ہے

ہمارے عمران احمد

تسلیمات:

امید ہے ملازم بکھر ہوگا ایک نئی کہانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ اس کہانی کا پس منظر اس شہر کے عین مطابق ہے۔

جو بچہ رہے وہ زبان بولتا ہوگا اس کا اہلکار کا جسم صاف صاف ہوتا ہے۔ صاف صاف اجاتا ہے تو بڑے بڑے انسان انہماک سے جڑواں ہیں۔ ان کے ہاں ایک ایسے ہی انسان کے لیے اس کے صاف ہونا، ناسخ و طوفان کے صاف اس کے صاف ہونا۔

انجیل فاروق صاحب
۱۹۹۷

تھا۔ بارش وقفے وقفے سے ہو رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا چھتری کی طرف بڑھنے لگا۔ چھتری کی چھت سے پھوٹنے والی روشنی میں میز پر شطرنج کی بساط بچھی ہوئی تھی اور دلیر خان اس سے بازی جیت چکا تھا۔ اسے شہ مات ہو چکی تھی اور اس کی کون لڑھکی پڑی تھی۔ دلیر خان اس کا دوست اور آج کی رات کا باڈی گارڈ تھا۔

”میجر گھبراؤ مت دلیر خان کے ہوتے ہوئے کوئی چوہا تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔“ نو جوان دلیر خان نے میجر کو تیشے کا اشارہ کیا اور سرخ مشروب جگ سے گلاس میں انڈیل کر اپنے دوست کو تھما دیا۔ شیر خان نے تھکے تھکے انداز سے اپنا آرام کرتے ہوئے میز پر سرخ مشروب گلاس تھام لیا۔ تیز ہوا کی سنسنی اور شائیں شائیں کے ساتھ ایک جھکڑ آیا اور گلاس جھلک اٹھا۔ مشروب میز پر گرا اسے سرخ قطروں کا بہاؤ ایسا محسوس ہوا جیسے سرخ خون اس کی رگوں سے پھوٹ رہا ہو۔ سرخ قطرے کی ایک لکیر کی صورت میں گھر گئے تھے اس نے چھلی ہوئی نگاہوں سے رومال نکالا اور مشروب کو مٹا دیا پھر غصہ سے آہ بھرتے ہوئے بولا۔

ریٹائرڈ میجر شیر خان نے اپنی قلعہ نما عمارت کے عقبی باغ میں وسطی مقام پر پہنچ کر چاروں طرف گھومتے ہوئے رہا اور اسے مسلسل فائرنگوں کی ایک راؤنڈ مکمل کیا۔ چھ کی چھ گولیاں بارود کی مہک کے ساتھ درختوں، جھاڑیوں اور داخلی مقام پر لگنے والے انسانی پتلوں سے لگائیں اور انہیں اپنے ساتھ لے کر زمین بوس ہو گئیں۔

اسی لمحے بجلی زور سے چمکی اور فلیش لائٹ جیسی روشنی میں میجر شیر خان کو باغ میں لگی مصنوعی آتش اور نورے کے باس چھتری کے نیچے بیٹھے دلیر خان کی ایک جھلک دکھائی دے گئی۔ شیر خان اپنے خون کو گرمانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس نے سفید واڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے محسوس کیا کہ جوانی اور بڑھاپے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اسی لمحے اس کی کمر اور ٹانگ میں درد کی لہر اٹھی اور وہ کانپ کر رہ گیا۔ اس نے بارش کے قطروں کو ہیٹ سے جھٹکا اور قلعہ نما عمارت کی دیواروں پر نصب خادارتاروں میں موجود برقی رد سے مرنے والے پردوں کو دیکھتا ہوا دلیر خان کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے آسمان پر بھی ایک نگاہ ڈالی آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا

بدلتا ہے ہماری کشتی ساحل کی ریت پر کھڑی تھی۔ جب ہم اس مقام پر پہنچے تو میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ہماری بڑی کشتی ساحل سے کھٹک کر سمندر میں داخل ہو گئی تھی اور سمندر کی موجیں تیز ہواؤں میں اسے ایک طرف بہائے لیے جارہی تھیں۔

پاروتی اور میں نے کسی کے عالم میں کسی کو اپنی پہنچ سے دور ہونے دیکھتے رہ گئے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ سمندر کی ایک موج اسے ساحل کی طرف لاتی تھی اور دوسری موجیں واپس جاتے ہوئے کشتی کو ساحل سے مزید دور لے جاتی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے کشتی ہماری آنکھوں سے دور ہو گئی۔ اور پھر دور ہی ہوئی چلی گئی۔ بارش کی بو چھاڑیں ہم پر پڑ رہی تھیں۔ ہوائے شور مچایا ہوا تھا۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر دوڑتے ہوئے جزیرے کے اندر آ کر ایک ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ ہمارے اوپر گھنے درختوں کی چھتریاں تھیں۔ یہاں بارش کے پانی سے ہم محفوظ تھے۔

پاروتی کہنے لگی۔ ”ہماری کشتی تو سمندر میں بہہ گئی۔ اب کیا کریں گے۔ کہیں ہم جزیرے میں قید تو نہیں ہو گئے؟“

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ جزیرے میں کھانے کو پھل اور پینے کو تاریل کا پانی بہت ہے۔ تمہارے واسطے سانپ بھی کہیں نہ کہیں سے مل جایا کریں گے۔ کچھ وقت یہاں رہنا پڑے گا پھر یہاں سے جانے کی ترکیب بھی سوچ لیں گے۔“

کوئی ایک گھنٹے بعد طوفان ختم گیا۔ ہم اٹھ کر ساحل پر آ گئے۔ طوفان باد و باران



”آج کی رات آہ.....“ میجر کیپکاپا سا گیا۔ اب اس کے ہاتھوں میں وہ طاقت نہیں رہی جس پر اسے فخر تھا اور آج کی رات وہ کافی ناتوانی اور احتیاج محسوس کر رہا تھا اس نے ریو الو کو ایک بھاری بوجھ سمجھ کر اٹھایا تھا اور پھر فائر کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ وہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اب بھی بہادر اور دلیر ہے لیکن دل کی گہرائی میں یہ خیال بھی جاگزیں تھا کہ اس کی بہادری اور دلیری بھی جوانی کا قصہ بن گئی ہے۔ دلیر خان ایک خوب رو اور وجیہہ نوجوان تھا۔

شیر خان سے اس کی ملاقات گلبرگ میں مارکیٹ کے شطرنج کلب میں ہوئی تھی۔ میجر کو شطرنج کا جنون تھا اور دلیر خان بھی شطرنج کا ماہر تھا چنانچہ دونوں میں بساط پر آنا سامنا ہوا اور یہ مصلحت دوستی میں بدلتا چلا گیا۔ دلیر خان نے متعدد بار محسوس کیا تھا کہ آگ اور بارود سے کھیلنے والا میجر شیر خان اچانک پریشان اور خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا اس کی نگاہ کھڑکیوں پر اٹک جاتی تھی۔ چلتے وقت پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا تھا کوئی خوف یا وہم اس کے اعصاب پر سوار تھا۔ جوانی گرفت مضبوط کرتا چلا جا رہا تھا۔

دلیر خان نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اس کا دوست حلقہ احباب کے معاملے میں بھی بڑا محتاط ہے ایک ماہ گزرنے کے بعد بھی اس نے اسے اپنے گھر نہیں بلایا تھا جب کہ دلیر خان چار بار بلا چکا تھا اور میجر نے ہر بار معذرت کی تھی۔

آج شیر خان کی اچانک اور فوری دعوت پر جب وہ اس کی کوٹھی میں آیا جو رات ڈیڑھ دو بج رہی تھی فارم اور گنجان باغ سے منسلک تھی تو اس نے محسوس کیا کہ شیر خان نے کوئی کوئی قصہ بنا رکھا ہے۔ باغ میں خونخوار کتے کھوم رہے تھے دو بج گارڈ باغ میں موجود تھا۔

ایک حبشی محافظ کوٹھی کے اندر شیر خان کے بلا سے کا خطرہ رہتا تھا۔ اس کے باوجود پسینے کے قطرے اس کے مساموں سے یوں پھوٹ رہے تھے جیسے موت اس کی طرف بڑھ رہی ہو۔ اس وقت اس کی بیوی سونیا خانم بھی قریب چلی آئی اس کا چہرہ بھی زرد زد تھا وہ خشک ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

آنکھیں ویران سی تھیں وہ تیسری نشست پر آکر بیٹھ گئی اور شطرنج کی بساط دیکھنے لگی۔ اس کی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں اور لکڑی میں ایک طلائی کڑاچیک رہا تھا جس سے خوشنما کر میں پھوٹ رہی تھیں اس میں بہت سے قیمتی اور نایاب نگ جڑے ہوئے تھے۔ شیر خان کے مہرے پٹنے لگے۔ ”نہیں ابھی آج کی رات میں جیت نہیں سکتا“ میجر نے مرتے ہوئے دزیر کو دیکھ کر شکست کا اعلان کر دیا۔

”آخر بات کیا ہے آپ کس چیز سے خوف زدہ ہیں اور آج کی رات کیا بات ہے؟“ دلیر خان نے استفسار کیا۔

”میں اب بتا دینا چاہتا ہوں۔“ میجر نے تجھے تجھکے لہجے میں کہا۔

”میجر صاحب ہرگز نہیں آج کی رات کچھ نہیں بتائیں گے ایک دراز ہے۔“ خاتم خج کر پوی۔

”نہیں اب میں مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتا ایسا لگتا ہے مرنے والوں کی رو میں مجھے پکار رہی ہیں۔“ میجر نے ادھر ادھر خلا میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”میں سوتے سوتے اچانک بیدار ہو جاتا ہوں میرا جسم پسینے میں بیٹھکانا شروع ہو جاتا ہے۔ نیند دوبارہ لاکھ بچن پر بھی نہیں آتی میرا لاشعور میرے شعور پر غلبہ حاصل کرتا رہتا ہے جب تک میں اپنے ضمیر کا روبرو نہیں کر لیتا مجھے نہیں آئے گا۔“

بجھنے شکت لہجے میں کہا۔ ”سونیا ڈیر! تم بے فکر رہو دلیر خان بہت مجھ سے کا آدمی ہے ایک مرتبہ جب ہم دونوں دوست گلبرگ میں مارکیٹ کے ایک ریستورنٹ سے کھانا کھا کے نکلے اور پارکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ایک تیز رفتار ٹرک بھرا میرے اوپر چلا آیا تھا دلیر خان نے فوراً ہی مجھے دھکا دے کر بچایا اور خود بھی لڑھک گیا۔ ہمیں چونک کر ریو الو رکالتے دیکھ کر ڈرائیور بھاگ نکلا چنانچہ دلیر خان میرا بہترین دوست بن چکا تھا۔ پچھلے بیس برسوں میں میں نے اس کے سوا کسی دوست کا انتخاب نہیں کیا نہ خود کسی کے نزدیک ہوا ہوں کیونکہ میرا ایک ناپیدہ دشمن.....“ میجر یہاں تک کہہ کر بانس سا گیا جیسے لمبی دوڑ لگا بیٹھا ہو۔

”اور ایک مرتبہ تو میں اتفاقیہ طور پر پتہ گیا تھا میں مون مارکیٹ علامہ اقبال ٹاؤن میں واقع میکڈونلڈ برگر ہاؤس سے باہر نکلا اور گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے بالکل بالقابل مون مارکیٹ کے پلازے لائن کی صورت میں پھیلے ہوئے تھے سامنے والے پلازہ کی چھت سے نامعلوم دشمن نے مجھ پر فائر کیا میں اسی لمحے میرا پاؤں سڑک پر پڑے کیلے کے بڑے سے چھلکے سے پھسلا اور میں گر پڑا۔ گولی ٹانگیں سے میرے سر سے گزر گئی میں سڑک کے کنارے کھڑی ایک کاری کی اوٹ میں چھلنگ لگا گیا۔ اس وقت برگر ہاؤس کے ساتھ واقع ریلائنس پلازہ میں چھلی کھاتے ایلینٹ فورس کے جوان متوجہ ہو گئے اور انہوں نے سامنے پلازہ کی چھت پر فائر کیا پھر حملہ آور کو گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی ایک ہی کاریاں تھا بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔“ شیر خان کا حلق خشک ہو گیا اور وہ سرخ مشروب پینے لگا۔ ایک لمحے کے لیے اسے جھرجھری سی آگئی اسے وہ سرخ رنگ کا خط یاد آ گیا جس خشک سی کے

دشمن نے لکھا تھا کہ وہ اس کا خون بہانے کے ور ہے اور بہا کر چھوڑے گا۔ خون کے لفظ کے ساتھ سرخ مشروب اسے انسانی لمبو محسوس ہونے لگا۔ اسے ابکاٹی سی آگئی اس نے ہاتھ روک دیا اور سر جھٹک کر خونی خیال کو بھلانے لگا۔

”میرے محترم دوست! آپ براہ مہربانی بتائیے اصل معاملہ کیا ہے؟ میں جان کی بازی لگا دوں گا“ میں وہ دھمکی آمیز خط تو دیکھ ہی چکا ہوں جس میں آج دسمبر کی دس تاریخ کا ذکر درج ہے اور آپ کی خاکہ تصویر بنانے کے ریو الوار سے فائر کر کے ہلاک کیا جا رہا ہے خون کے لیے سرخ روشنائی استعمال کی گئی ہے۔“ دلیر خان نے خط پر ایک نظر اور ڈالتے ہوئے کہا۔

شیر خان نے اپنے حواس بحال کیے اور اپنی بیوی کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ اب اس نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا چنانچہ شیر خان ادھر ادھر ایک غائرانہ نگاہ ڈالتا ہوا کہنے لگا۔

”آج سے بیس برس قبل دہشت گردوں کے خلاف لاہور اور کراچی میں ہونے والے آپریشن میں مجھے سربراہ کی حیثیت حاصل تھی۔ میرے ساتھ دوسرے کیپٹن کرنل اور میجر بھی شامل تھے خود بھی میجر تھا۔ میری خدمات زیادہ تھیں اس لیے مجھے انچارج بنا دیا گیا تھا۔ سنگین صورت حال کے باعث حکومت کو ہمیں میدان میں لانا پڑا تھا پولیس دہشت گردوں کے آگے بے بس ہو چکی تھی۔ دہشت گرد بچوں کے کھلونوں میں بم فٹ کر کے تحریری کارروائیاں کر رہے تھے۔ آئی جی پنجاب کے بیٹے کو اس کے ایک دوست کی طرف سے جو امریکا میں مقیم تھا ایک خوب صورت ریپوٹ کنٹرول چھانچے میں ملا۔ آئی جی کی بیوی اسپتال میں داخل ہوئی ڈیوری کیس تھا ان کا ملازم اسکول

سے بچے کو لے کر آئی جی صاحب سے ملانے کے لیے پولیس ہیڈ کوارٹر لے گیا کیوں کہ وہ بے حد اداس تھا، بچہ شوق ہی شوق میں جہاز بڑے میں ڈال کر اپنے دوستوں کو دکھانے کے لیے لے گیا تھا۔ آئی جی صاحب نے بیٹے کو پیار کیا اور ملازم کے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں لگے باغ میں کھیلنے کے لیے بھیج دیا، بچہ سمورٹ کنٹرول سے جہاز اڑا اڑا کر خوش ہونے لگا، جہاز بڑا خوب صورت اور برق رفتار تھا۔ فلا بازیاں بھی کھا جاتا تھا، ہلکی گرج بھی اس میں سے خارج ہوتی تھی اس جہاز میں شیشوں کے اندر ٹی وی ڈش کمرہ بھی شاید لگا ہوا تھا کیونکہ جیسے ہی بچے نے جہاز اڑا کر ایک مرتبہ مرکزی عمارت کے برآمدے کی طرف بھیجا، اسکرین پر منظر دیکھتے تخریب کار نے ہنسنے لگا، جہاز سرخ ہو کر ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا اور برآمدے کے پرچے اڑ گئے باہر آتے ہوئے بہت سے آفیسر ملازم اور دیگر بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور وہ بھی پولیس ہیڈ کوارٹر کے اندر اس واقعہ سے حکومت کی بڑی بدنامی ہوئی، اخبارات نے دفاعی نظام اور پولیس کو سخت ست اور بے پروا ہونے کے طعنے دیئے۔

میں دہشت گردوں کی بوسہ گھستا پھر رہا تھا، جگہ جگہ آدمی بھی مقرر کر رکھے تھے پھر ایک واقعہ ایسا ہوا جس سے ہم دہشت گردوں کے ایک گھر میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔ "شیر خان سانس لینے کے لیے رکا۔ اسے کھانسی آئی تھی۔" یہ بڑھاپے کی مصیبتیں۔" وہ بلفم خارج کرتا ہوا اٹھلایا پھر چند غلیبے خاموش رہ کر دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔ "ہاں تو دلیر خان دہشت گردوں کے حوصلے بہت بڑھ چکے تھے انہوں نے گورنر کے بیٹے عمران کو گلبلیک کے ایک اسکول سے اغواء کر لیا اور ان دہشت گردوں کی رہائی کا مطالبہ کیا، جنہیں گورنر سخت جزا نہیں دلائے

والا تھا۔ وہ گورنر ہاؤس میں تخریب کاری کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ ہمیں ابھی تک دہشت گردوں کے خلاف کوئی سرانجام نہیں مل سکا تھا، خوش قسمتی سے گورنر کا لڑکا عمران جو ساتویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ بڑا ذہین ثابت ہوا وہ جاسوسی ناول اور جاسوسی ڈائجسٹ پڑھنے کا شوقین تھا۔

اس نے بڑی مشکل مندی سے ایک کامیاب ترکیب سوچ لی۔ اس نے نائیکولن کی شرٹ پہن رکھی تھی اسے کسی سیاہ بلند عمارت کے اوپر والے لمبو ترے کمرے میں قید کیا گیا تھا، کمرے کی دو طرف ترچھی چھت میں ایک کھلا روشن دان وسطی مقام پر واقع تھا۔ عمران کمرے میں تنہا تھا دہشت گرد باسی رولی اور پٹی وال دے کر جا چکے تھے۔ عمران نے اس کھانے کو ہاتھ بھی نہ لگایا وہ ٹازوں کا پلا ہوا تھا، یہ خوراک اسے اپنی توہین محسوس ہوئی اس نے روشن دان کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی تیز کرچیں تن کر لیں اور کمرے کی بالکونی الماری کے ٹوٹے ہوئے کنارے سے پتلی پتلی لمبی کڑیاں کاٹ لیں اور پھر کمرے کے وسط میں اپنی نائیکولن کی شرٹ اتار کر اسے فرش پر بچھا کر پاؤں کے نیچے دبا کر شیشے کے ٹکڑے سے پٹنگ کی صورت میں کاٹنے لگا۔ پٹنگ کی تیاری میں سائز سے زیادہ اس کے تناسب کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے اسے یہ تناسب اسی طرح یاد تھا۔ کپڑے کو اس نے چو گوشت کی شکل میں کاٹا تھا اگرچہ شیشے کی کٹائی سے کنارے کٹے جھٹے تھے لیکن کام بخوبی چل سکتا تھا اس کی انگلیاں بھی ڈبھی ہوئیں لیکن اس نے بڑی ہمت سے کام لیا اور پتلی پتلی کٹڑی کے صہتر بنائے اور پٹنگ میں مطالبہ مقام پر سرورخ کر کے انہیں الماری سے ملنے والے موٹے دھماکے کی مدد سے ہاندھ دیا۔ کمرے میں موجود پٹنے آتش دان پر گھڑنے لگے ٹکڑوں کی مدد سے

اس نے پٹنگ پر اپنا اپنے والد کا نام عہدہ اور سیاہ روشن دان والے ترچھی چھت کے کمرے کا ذکر کر دیا کہ وہ وہاں مقید ہے۔ الفاظ شرٹ کی سفید پٹنگ پر واضح ہو گئے۔ پٹنگ بنانے کا طریقہ اس کے بچانے اسے بچپن میں ہی سکھایا تھا۔ اسے شوق تھا کہ وہ یہ کام سکھ لے اب الماری کو گھسیٹ کر لانا ایک مشکل کام تھا لیکن عمران وہ بھی کر گزرا تھک کر باپ گیا لیکن چند لمحوں بعد پٹنگ میں تناؤ ڈال کر لمبا دھاگا باندھتے ہوئے الماری کے خانوں پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھتا چلا گیا۔ الماری کے اوپر بیٹھ کر اس نے پٹنگ ٹوٹے شیشے والے روشن دان کی سلاخوں سے باہر تیز ہوا میں اڑا دی اور دھاگا تھری سے چھوڑنے لگا۔ اتفاق سے دھاگا اس کی زخمی انگلیوں سے چھوٹ گیا اور ایک جگہ الجھ کر ٹوٹ گیا لیکن ایک عمارت کی دوسری منزل کے صحن میں اپنے معذرتا نا کے پاس ڈھیل جیگر کے پاس کھڑے ایک لڑکے نے پٹنگ پکڑی اور الفاظ دیکھ کر تانا کو بتایا۔ اس طرح ہمیں اطلاع ہوئی ہم نے پہلی کا پٹر میں بیٹھ کر وہ سیاہ عمارت جس کے اوپر ترچھی چھت میں روشن دان تھا لاہور سے قصور جانے والی سڑک کے ساتھ ایک ویران حصے میں ڈھونڈ نکالی جہاں کئی بند فیکٹریاں موجود تھیں یہ علاقہ ایک مرتبہ شدید آگ سے متاثر ہوا تھا۔ یہاں فرنیچر کا کام بڑے پیمانے پر ہوتا تھا۔

ہم نے پہلی کا پٹر اور نیچے سے مسلح فورس کے ساتھ یہ جگہ گھیری یہاں جھلسی ہوئی عمارت کی چھت میں روشن دان اوپر کی طرف موجود تھا۔ ہم نے احتیاط سے آپریشن کیا اور لڑکے عمران کو چھڑا کر دہشت گردوں کو بھون کر رکھ دیا کافی مقابلہ ہوا تھا۔ اس بلڈنگ میں کرائے دار دہشت گردوں کے مالکان بھی گھسپائش پر میر تھے۔ یہ نیاں بیوی اور شاید لڑکی کا ایک لمبا سبھا جتو دق کھولنے لگا۔ جس میں

ایک بچے پر مشتمل گھر اڑ تھا۔ انہوں نے رات کے وقت ہمیں ڈاکو کچھ کر فائر کھول دیا، ہم نے انہیں گھیر لیا اب وہ سمجھے کہ ہم فوجی ہیں اور ان کے کرائے دار دہشت گرد تھے لیکن مجھے ان کی باتوں اور صفائی پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بے قصور ہیں چنانچہ میں نے ان میاں بیوی کو گولی مار دی، بچے کیسں ادھر ادھر چھپے ہوئے تھے انہیں تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

اس زمانے میں میری بیوی کو سونیا خاتم اخباری رپورٹر تھی وہ یہ سب سے پہلے موقع پر پہنچی اور مرے ہوئے میاں بیوی کی تصاویر دہشت گردوں کے ساتھیوں کے طور پر اخبارات میں دے دیں اب مجھے بھی ابھی ان میاں بیوی کی جھلک خواب میں دکھائی دیتی ہے جیسے وہ مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ ہم بے گناہ تھے تم نے ہمیں ناحق گولی مار دی بچوں کو قتل کیا۔ یہ بے گل کہانی۔ "میر شیر خان گھر سے گھر سے سانس لینے لگا۔ اس کا چہرہ زرد اور آنکھوں سے خوف لپک رہا تھا۔

"میر خیال سے ان کا بچہ بچ گیا ہوگا اور اب وہ تمہاری تاک میں لگا ہوا ہے۔" دلیر خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن گھبراؤ نہیں میرے ہوتے ہوئے پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ تم نے مجھ پر اعتماد کیا ہے تم مجھے اپنا محافظ پاؤ گے۔" "میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں تنہائی میں مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔" شیر خان کی آواز بھرائی۔

باہر تیز ہوا سے بارش کی بو چھاڑ کھڑکیوں سے نکلانی پھر اس میں سے ایک عجیب سی آواز کوئی۔ "کھٹ۔۔۔۔۔ کھٹ۔۔۔۔۔ کھٹ۔۔۔۔۔" باہر کتوں کے زور زور سے بھونکنے کا شور بھی سنائی دیا۔ وہ عجیب آواز خاصی بلند تھی۔ شیر خان کا جیشتی ملازم اندر آ اور مالکان بھی گھسپائش پر میر تھے۔ یہ نیاں بیوی اور شاید لڑکی کا ایک لمبا سبھا جتو دق کھولنے لگا۔ جس میں

گھالہ

جناب ایدہ بنی القہر و سرائہ احمد
اصابہ

اللہ تعالیٰ تلے اذق کو حق جو نہ رات چو کھت لرقہ دے۔
ہمارے یہاں ایک طبیکہ ایسا ہے جو ہر رات کو اپنا انا کا مسئلہ بنا کر عذلی کا
حامن چھوڑ بیٹھتا ہے۔ یہ کھانا بھی ایک ایسا ہے جس سے ہونے والے نوجوان کو یہ
جدا و تقاطع کسی آنہ میں انا کے لئے بڑھا گیا تھا کہ خود اپنا حامن وہ جلا بیٹھا۔ پس
میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گی کہ اب اس کھانہ کو نظر انداز نہیں
کرسکتے ہیں اس کھانہ کے تمام کمرہ دار زندہ و جاوید ہیں۔

فانقلاب
مصلحت فتنہ
مما جنت

چھوٹا بھائی اسکول روانہ ہو جاتا اور فائزہ اپنی فیکٹری
چلی جاتی جو گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ولید اسکول
سے نکل کر ایک درزی کے یہاں کام سیکھنے بیٹھ جاتا
تھا پڑھنے میں تو اس کا ریکارڈ بھی بہت اچھا تھا مگر
ماں کہتی تھی۔

”فارغ رہنے سے بہتر ہے کچھ کام سیکھ لو۔“ وہاں
وہ بن بن لگانا اور شلوار کی سیدھی سیدھی سلانی سیکھ گیا تھا
جہاں سے ہر ہفتے اسے دوسو روپے مل جاتے تھے اور
دوپہر کا کھانا ماسٹر صاحب کے ذمہ تھا۔

سب سے پہلے وریشہ گھر میں داخل ہوتی تھی
غریبوں کی ہستی بھی سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے
ساتھی بہادر اور محبت کرنے والے تھے۔ پڑ دن خالص
چالی لے کر وریشہ گھر کھولتی جو دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرہ درم
اور ایک چھوٹے سے صحن پر مشتمل تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا
کہ جب فلاحی اور دربنے لگے تو وہاں کے رہائشیوں کو
حکومت نے شہر سے دور 80 گز کے پلاٹ اور
پچاس ہزار روپیہ دیے تھے۔ فائزہ کے میاں نے کچھ
اور پیسے ڈال کر اور وہ پلاٹ بیچ کر بیستی میں 80 گز
کا گھر خرید لیا تھا کیونکہ اسے اپنے بچوں کو پڑھانے کا

وریشہ کے آگے چاروں کی پرات رکھی تھی جس
کے کنکر چتے چتے اس کی کمر تختہ ہو گئی تھی۔ سونے
چادل جو ڈالنے میں نہ مچ مگر قیمت میں کم تھے اور
جب زندگی کا مقصد زندہ رہنا اور ہیٹ کا ایندھن بھرنا
ہو تو خوش ذائقہ اور بڑا نقد کا تصور بے معنی
ہو جاتا ہے اماں کام پر گئی ہوئی تھیں وہ ایک غریب
بیوہ ماں کی کم عمر بیٹی تھی جس نے ایک سرکاری اسکول
سے اسے دن گریڈ میں میٹرک کیا تھا اور اب ایک
مشہور سرکاری کالج کی طالبہ تھی اور یہ سب اسے اپنی
قابلیت اور ذہنیت سے ملا تھا۔ وہ پڑھنے کے ساتھ
ساتھ گھر کے کاموں میں اماں کا ہاتھ بٹانے کی پوری
کوشش کرتی تھی بڑی تکی ترشی سے گزر رہی ہوتی تھی
اس کے ابا چار سال پہلے فیکٹری میں کام کرتے
ہوئے جان کنوا بیٹھے تھے ماکان شریف تھے انہوں
نے اس کی بیوہ کو کام کرنے کی آفر کی جو وریشہ کی ماں
فائزہ نے بغیر کسی حیل و حجت کے قبول کر لی اس
وقت وریشہ بارہ سال کی اور اس کا چھوٹا بھائی دس
سال کا تھا دونوں اسکول جاتے تھے صبح سویرے
تینوں ساتھ ہی گھر سے نکلے تھے اور وریشہ کالج اور

دعوت ہوتی تو وہ اصرار کر کے وریشہ کی امی کو بلا لیت تھی
اور وریشہ کی امی بلا معاذہ لحاظ مروت میں یہ خدمت
انجام دے دیتی تھیں۔ وریشہ کی خود ارا طبیعت کو یہ بھی
گراں گزرتا تھا۔

☆.....☆.....☆

وریشہ نے وال چو لھے پر چڑھائی اور مریج مسالا
ڈالا تو اس کی خوشبو پورے گھر میں پھیل گئی۔ گرمی سے
گھبرا کر وہ چھوٹے سے صحن میں نکل آئی اسی وقت
دروازے پر نازش کی آواز آئی جو اندر آنے کی
اجازت طلب کر رہی تھی اکثر وہ گھروالوں سے چھپ
کر وریشہ کے گھر آ جاتی تھی۔ وریشہ کے منع کرنے
کے باوجود وہ اس کی چادل چھٹنے میں مدد کرنے لگی اس
میں غرور و تکبر نام کو نہیں تھا۔

”نازش بچن سے نکلو یہاں بہت گرمی ہے۔“
وریشہ نے شرمندگی سے کہا۔ چوہا بلی چوہا کچن جو
چو لھے کی تپش سے تپ رہا تھا نزدیک ہی برتن
دھونے کی لیے ہودی بنی ہوئی تھی۔ کینسٹ اور فرنج
کی جگہ جالی والا تختہ رکھا تھا۔ نانی کے زمانے کا جسے
اکثر مذاق میں وریشہ تختیہ ادب کہا کرتی تھی جس
میں چاروں طرف سے ہوا نکلنے کی وجہ سے کھانا
خراب نہیں ہوتا تھا۔

”چھوڑو مجھے یہاں تمہارے ساتھ بیٹھنے میں مزا
آ رہا ہے اور سنو میں آج کھانا کھا کر جاؤں گی۔“
”نازش میں نے تو آج دال چادل بنائے ہیں بھلا
تمہیں کہاں ایچھے لگیں گے؟“ وریشہ نفرت سے بولی۔
”کیوں ایچھے نہیں لگیں گے آخر تم لوگ بھی تو
کھاتے ہو۔“ نازش بگڑ کر چیخی۔

”ہماری بات اور ہے۔“ وریشہ متانت سے گویا
ہوئی۔
”کیا بات اور ہے؟“ کھانا کھا کر کس چیز کی تم میں

بڑا شوق تھا۔ علم کی لگن اس کے خون میں رچی ہوئی تھی
وہ خود تو میٹرک سے زیادہ نہ پڑھ سکا لیکن اپنے اس
شوق کو وہ بچوں پر پورا کرنا چاہتا تھا اور خدا کی ہستی شہر
سے بہت دور تھی اور جہاں پر نہ بجلی تھی نہ پانی نہ گیس
اور نہ ہی کوئی اچھا اسکول کالج۔ اس کی زندگی نے وفانہ
کی لیکن اس کی بیوی اور بچے اس کے خوابوں کی تکمیل
میں رات دن ایک کر رہے تھے۔

فائزہ کا زواں زواں اپنے شوہر کی مغفرت کی دعا
کرتے نہ تھکتا تھا جس نے سر چھپانے کے لیے ایک
ٹھکانہ تو چھوڑا تھا۔ وریشہ کے پاس دو پہر چھوٹے
بچے نیوٹن کے لیے بھی آ جاتے تھے اس طرح پشتم
پشتم گزر رہی جاتی تھی پھر رات تک دونوں بہن
بھائی پڑھائی کرتے اور اماں اجرت پر سلائی۔

وریشہ جس کالج میں اپنی قابلیت کے بل بوتے پر
بجٹی تھی وہاں زیادہ تر متوسط فیس کی لڑکیاں آتی تھیں
یونین فارم یکساں ہونے کے باوجود ان کی بول چال ان
کا انداز گفتگو اور غرور و تکبر صبح چرخ کران کی حیثیت کا
چارے دیتا تھا۔ جب وہ باور دی ڈرائیور کے ساتھ
ایک لمبی قیمتی کار سے اترتیں تو ان کے انداز میں ایک
عجیب بے نیازی اور تمکنت ہوتا تھا جیسے ساری دنیا
ان کے قدموں سے تلے ہو۔ وریشہ لمبی لڑکیوں سے
فاسٹ پر ہی رہتی تھی اسے اپنی انا اور خودداری بڑی
عزیز تھی کیونکہ وہ پڑاؤ آف ہونے پر کینٹین سے برگر
اور چیز کھا سکتی تھی نہ کھلا سکتی تھی اس لیے وہ زیادہ تر
لاجریری میں ہی رہتی تھی اور ”پڑاؤ کو“ مشہور تھی لیکن
نازش اس کی ایک پرانی اور بچپن کی دوست تھی جس کا
تعلق ایک امیر گھرانے سے تھا اور روڈ کے دوسری
طرف اس کا عالی شان بنگلہ اس کی امارت اور دولت
مندی کا مزہ بولتا ثبوت تھا۔ وریشہ کی امی کھانا بہت
اچھا پکاتی تھیں اس لیے نازش کے گھر جب بھی

کسی ہے بلکہ بچ پوچھو تو دولت کے علاوہ ہر چیز تمہاری مجھ سے بہتر ہے۔ ذہانت، قابلیت، شکل و صورت ان معمولی چیزوں میں بھی تم اس طرح چمک رہی ہو جیسے گندمی میں لعل اور اس کا خزانہ لباس میں بھی میری شکل بھڑکا کر دکھاتی ہے۔“ نازش کے لہجے میں حسرت تھی کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ دریشہ بے حد خوب صورت تھی صاف رنگ سیاہ گھنے بال لمبا قد اور اس پر اس کا فیکر غضب کا تھا اکثر نازش مذاق میں کہتی تھی۔

”دریشہ تم بیوی کا سٹیسٹ کے معیار پر پوری اترتی ہو؟ مارے یہاں کہاں لڑکیوں کا قد پانچ فٹ ہوتا ہے اور پھر تمہارا سہرا؟ یقیناً کروڑوں کیٹ واک میں حصہ لو تو ماڈلز کے جیسے چمڑا دو۔“ اور نازش کے مذاق کو گھٹنے کے باوجود دریشہ کو غصہ آ جاتا۔

”اللہ نہ کرے کہ میں کسی مقابلے میں حصہ لوں اور خود کی نمائش کروں۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی مجھے دیا ہے چھپانے کے لیے نہ کہ دکھانے کے لیے اور اپنی ذہانت پر تو مجھے بھی فخر ہے۔ ان شاء اللہ میں ڈاکٹر بن کر اپنے بابا جان کے خوابوں کو تعبیر ضرور دوں گی۔“

”ویسے آج تم نے کون سی پرفیوم لگائی ہے زبردست خوشبو آ رہی ہے۔“ دریشہ نے اس کا دھیان بنانے کے لیے تعریف کی۔

”پتا نہیں اس قدر پرفیوم ہیں کون سا نام پر ہتی ہوں بس خود پر اپنا ٹیل لیتی ہوں۔“ نازش بے پروائی سے بولی۔ دریشہ کو اسے دیکھ کر فسوس ہونے لگا اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اپنی زندگی سے خوش نہیں تھی۔ وہ رو ہی بہن بھائی تھے مگر ماں باپ میں سے کسی کے پاس بھی اولاد کے لیے ٹائم نہیں تھا۔ ابا برنس میں مصروف اور مٹی مختلف این جی او کی روح رواں۔ بھائی کی اپنی دلچسپیاں تھیں نازش بے حد معصوم اور سیدھی سادی تھی اسے دریشہ کے گھر کا

ماحول بہت اچھا لگتا تھا۔ جہاں ان کی ماں گھر میں گھسے ہی اس طرح دونوں بچوں کو گلے لگاتیں جیسے برسوں کے بعد ملی ہوں۔ فیکٹری سے تھکی ہوئی آنے کے باوجود وہ گھر آنے کے بعد دریشہ کو کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھیں کہ انہیں پڑھنا ہے۔

اسے اچھی طرح یاد تھا جب بچپن میں وہ ننھے ننھے قدموں سے چلتی ہوئی اپنی ماں کے قدموں سے لپٹ جاتی تو وہ اسے پیچھے دھکیل کر میڈ کو زور زور سے آوازیں دے لگتیں۔

”نوزی کہاں مرگئی ہو بے بی کو دکھو۔ میری سہاری کی کیز خراب کر دی۔“ نازش کو یاد نہیں تھا کہ کبھی می نے اسے گلے لگا کر پیچھے پیچھے کر پیا کیا ہوا اس کی کسی فرمائش اور ضد پر لاڈ اٹھائے ہوں یا ڈانٹا ہو کہ کیونکہ انہیں اولاد سے زیادہ اپنے فکر جوانی اور انہیں کی فکر رتی تھی اور ڈیڈی تو تھے ہی کے برنس میں اور من موٹی۔ وہ سمجھتے تھے کہ پیسہ دے کر وہ ہر فرض سے بری الذمہ ہو چکے ہیں۔ ابتداء میں دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کی رفاقت میں بڑے خوش تھے ساتھ ہی دی دیکھتے ساتھ پڑھتے اور ساتھ کھیلتے

لیکن آہستہ آہستہ شہر و ز نے اپنی دلچسپیاں باہر ڈھونڈ لیں۔ اس کے بے شمار دوست تھے جن کے ساتھ اس کا وقت اچھا گزرتا تھا لیکن نازش کی سب سے زیادہ دوستی دریشہ ہی سے تھی اس کو اس کے گھر کا ماحول بھی بہت پسند تھا اور جب بھی وہ تنہائی کا شکار ہوتی دریشہ کے گھر آ جاتی اور اس کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں چار پانی پر کھانا کھانا اسے بہت اچھا لگتا۔

”اچھا سنو.....!“ نازش نے دریشہ کو مخاطب کیا۔ ”اگر تم مارنڈ نہ کرو تو میرے پاس بے شمار پرفیومز اور میک اپ کا سامان ہے تمہیں دے دوں؟“

”ہرگز نہیں.....!“ دریشہ جلدی سے بولی۔ ”اول

تو مجھے ان چیزوں کا شوق نہیں دوسرے میں اپنی کھال میں مست اور حال میں خوش ہوں۔ ویسے بھی تمہاری اہی کو تمہارا ہمارے ساتھ اٹھانا بیٹھنا پسند نہیں آیا نہ ہو وہ بالکل ہی تمہارا آٹا جانا بند کر دیں۔“ دریشہ شرارت سے بولی۔

”خیر وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتیں۔“ نازش نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”آئیں اور ڈیڈی کو اپنی سوشل اینکوائزیشنز سے فرصت ہی نہیں کہ وہ دو گھنٹوں میں کہاں جا رہی ہوں کیا کر رہی ہوں؟ کس سے مل رہی ہوں؟ ان کے پاس یہ سب جاننے اور دیکھنے کے لیے وقت ہی کب ہوتا ہے اور بچ پوچھو تو تمہارے گھر آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میرا دل یہاں آ کر شانت ہو جاتا ہے تمہاری اہی جس طرح تم دونوں بہن بھائیوں کا خیال رکھتی ہیں۔ تمہارے لیے فکر مند ہوتی ہیں مجھے وہ سب بہت اچھا لگتا ہے ساتھ ساتھ مجھے حیرت بھی ہوتی ہے کہ میں دنیا کی ہر آسائش اور نعمت ہوتے ہوئے بھی خوش نہیں اور کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی تم لوگ خوش اور مطمئن ہو ایسا کیا ہے تمہارے پاس جو تمہیں خوش رکھتا ہے؟“ نازش کے لہجے میں تجسس تھا۔

”صبر اور قناعت۔“ دریشہ نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ سب کو دینے والا تو ایک ہی ہے کسی کو دے کر آزماتا ہے تو کسی سے لے کر تو ہم ناشکری کیوں کریں اگر صبر اور قناعت سے کام نہیں لیں گے تو بے چین اور بے اطمینان ہی رہیں گے۔ ہم جانتے ہیں جو ہمارے نصیب کا ہے اور جو ہمارے مقدر میں لکھا ہے وہ ہمیں مل کر رہے گا اس لیے اس کے لیے کوشش ضرور کرتے ہیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھتے اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں صبر سے کام لیتے ہیں اور جو مل رہا ہے اس پر قناعت کرتے

ہیں۔“ دریشہ نے گل سے جواب دیا اور اسی وقت دریشہ کی آنکھیں اور دریشہ کو کچھ کر خوش ہو گئیں۔

”ارے میری بیٹی آئی ہے دریشہ تم نے چائے

دائے بھی پلائی یا باتوں پر غر خاری ہو؟“

”خالیہ میں تو کھانا کھا کر جاؤں گی۔“ نازش بے تکلفی سے بولی اور دریشہ کی اہی ہر ادھیڑ پودینہ اور ٹماٹر دریشہ کو دیتے ہوئے غسل خانے کی طرف بڑھ گئیں اسی دوران دریشہ کا بھائی بھی آ گیا اور دریشہ نے بگھاری ہوئی دال کے ساتھ ابلے ہوئے چاول سلاو اور اچار رکھا اور سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ ولید جب ماسٹر کی طرف چلا گیا تو نازش جھجکتے ہوئے دریشہ سے بولی۔

”دریشہ تم جانتی ہو پڑھنے میں میرا دل نہیں لگتا اگر تم میرے گھر روزانہ ایک گھنٹے کے لیے آ جاؤ تو شاید کہا نہ سنا سنی سے کچھ بہتری آ جائے۔“

”سوری نازش! میں یہ نہیں کر سکتی اگر تمہاری اہی اجازت دے دیں تو تم آ جایا کرو۔“ دریشہ نے نکاسا جواب دے دیا۔

”دیکھو تمہارے آنے پر تو راضی ہو جائیں گی لیکن می مجھے ہرگز نہیں آنے دیں گی پلیز مان جاؤ نا“

دو تین مہینے کی تو بات ہے پھر تو اثر کے امتحان ہی ہو جائیں گے۔“

”آ جائے گی بیٹا! تم پریشان نہ ہو میں خود چھوڑ دیا کروں گی اور واپسی میں ولید لے لے گا۔“ دریشہ کی اہی کو اس کا یوں نکاسا جواب دینا اچھا نہیں لگا اور دریشہ حاضر امانا کا کہا ٹال نہ سکی۔

دریشہ اور نازش پڑھ رہی تھیں جب نازش کی می کے چپنے کی آواز آئی۔

”ارے تمک حراموں! تم یہ کیا صفائی کرتی ہو

دیکھو کرسیاں کس طرح بے ترتیبی سے رکھی ہیں اور ہاں! کسی چیز پر معمولی سی بھی گر نہیں ہوئی چاہیے تم جانتی ہو میرا بیٹا چار سال بعد باہر سے پڑھ کر آ رہا ہے جہاں گروتام کی کوئی چیز نہیں ہوئی۔ صفائی کا بے حد خیال رکھنا صبح سے چنچ چنچ کر میرے داغ کی چوبیس بل گئیں۔“ وریشہ کی سوالیہ نگاہوں پر نازش ہنس کر بولی۔

”تم پریشان نہ ہو یہ ڈنڈہ ہمارے بھائی کی آمد کے سلسلے میں ہے کل جولنڈن سے آرہے ہیں۔ اسی لیے تو آج میری گھر میں نظر آ رہی ہیں صبح سے سیا پاؤلا ہوا ہے مجی کی توان میں جان ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ کسی کولفٹ ہی نہیں دیتے۔“

”پھر کل سے میں تمہارے گھر نہیں آؤں گی؟“ وریشہ نے صاف صاف کہہ دیا۔

”کیوں کیا بھائی تمہیں کھا جائیں گے اور بے وہ بالکل می کی کاپی ہیں دومنٹ جو گھر میں تک جائیں اور اب تو وہ باہر سے پڑھ کر آ رہے ہیں پتا نہیں کیسے ہو گئے ہوں گے۔“ نازش فکر مندی سے بولی لیکن وریشہ نے صاف منع کر دیا۔

اماں کا رخانے سے آئیں تو بخار میں تب رہی تھیں وریشہ اور ولید گھبرا گئے ان کو دوای مگر وہ بعد تھیں کہ انہیں نازش کے گھر جانا ہے ان کے ہاں دعوت تھی اور نازش کی امی نے انہیں کھانا پکانے کے لیے بلا دیا تھا۔

خانساں! پیار پڑ گیا ہے کھانا تو بھول ہی سے آئے گا بس ایک دو شزر جو انہیں میرے ہاتھ کی بے حد پسند ہیں وہی بنانے بلارہی ہیں۔“

”اماں! آپ کو بخار بھی تو کتنا ہو رہا ہے۔“ وریشہ کے لہجے میں تشویش اور فکر مندی تھی۔

”اچھا ایسا کرو۔“ وہ سوچتے ہوئے بولیں۔ ”تم چلی جاؤ میری جگہ ماشاء اللہ تمہیں سب کچھ پکانا آتا ہے اور تمہارے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت ہے درزی کی دکان سے لوٹتے ہوئے ولید تمہیں لے لے گا اور نازش کا گھر کون سا دور ہے سڑک کے اس پار ہمت ہوئی تو میں خود ہی لے لوں گی۔“

”اماں! میں نہیں جاؤں گی۔“ وریشہ نے صاف منع کر دیا۔

”یہ آئی نے خسرے کب سے رکھنا شروع کر دیئے۔“

”وہاٹ.....؟“ اس نوجوان کی وہاڑ نازش بھائی ہوئی لیکن میں آئی اور وریشہ کی شکل دیکھ کر ہنس کر بولی۔

”یہ میرے بھائی شہر ذری علی خان ہیں کل ہی تو لندن سے آئے ہیں۔“

”نازش! میں اب چلوں گی سب کچھ تیار ہے اور ولید بھی آئے والا ہوگا؟“ وریشہ نے بے پرواہی سے نرم آگے بڑھائے۔

”ابھی سے کہاں چلیں ابھی تو ہم سے آپ کا تعارف بھی نہیں ہوا۔“ شہر ذری نے اس کے راستے میں مائل ہوتے ہوئے کہا۔

”یہ آئی نے خسرے کب سے رکھنا شروع کر دیئے۔“

”وہاٹ.....؟“ اس نوجوان کی وہاڑ نازش بھائی ہوئی لیکن میں آئی اور وریشہ کی شکل دیکھ کر ہنس کر بولی۔

”یہ میرے بھائی شہر ذری علی خان ہیں کل ہی تو لندن سے آئے ہیں۔“

”نازش! میں اب چلوں گی سب کچھ تیار ہے اور ولید بھی آئے والا ہوگا؟“ وریشہ نے بے پرواہی سے نرم آگے بڑھائے۔

”ابھی سے کہاں چلیں ابھی تو ہم سے آپ کا تعارف بھی نہیں ہوا۔“ شہر ذری نے اس کے راستے میں مائل ہوتے ہوئے کہا۔

مجھ سے شکایت نہ کریں کیونکہ یہاں آپ کی دال
گھنے والی نہیں کہیں اور منہ ماری کریں۔“ نازش نے
کہا اور جھپا کے سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا جب وریشہ نازش کے
ساتھ کالج سے باہر نکلی تو دین کا دور دور پتا نہیں تھا
شاید کہیں بنگامو ہو گیا تھا اور آج ڈرائیور کی جگہ بہن کو
لینے شہر وز آیا ہوا تھا ویسے تو روز ہی نازش اس کو ساتھ
چلنے کے لیے اصرار کرتی تھی لیکن آج اس کے بے حد
اصرار پر وریشہ کو اس کی گاڑی میں بیٹھنا پڑا۔ پورے
راستے وہ جڑ بڑھتی رہی کیونکہ شہر وز کی بیک مر میں
نظریں دریشہ پر جمی ہوئی تھیں لیکن گاڑی جب سنبھان
راستوں پر رواں ہوئی تو دریشہ چپ نہ رہ سکی۔

”نازش! یہ تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو جاتی ہو
میں وقت پر گھر نہ پہنچی تو اماں پریشان ہو جاتی ہیں۔“
”ارے چھوڑو وہ ابھی کہاں کا رخا نے سے آئی
ہوں گی آج بڑی مشکلوں سے بھائی اتھ گئے ہیں۔
کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھا کر ان کی
جیب ڈھیلی کریں گے۔“

”نازش!“ دریشہ بڑھ کر بولی۔ ”تم جانتی ہو مجھے یہ
سب پسند نہیں، تم مجھے نہیں اتارو میں پبلک بس
سے چلی جاؤں گی۔“

”مس دریشہ! آپ ناراض نہ ہوں ہم جلدی
آپ کو ڈراپ کر دیں گے۔“ ایک جدید ہونٹ کے
سامنے گاڑی روکتے ہوئے شہر وز نے اتنی شانسی
سے کہا کہ وریشہ کو گاڑی سے اتارنا ہی پڑا۔ یونے میں
انواع و اقسام کے کھانے تھے جن کا نام بھی دریشہ
نہیں جانتی تھی مگر اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا اور
نوالے طاق میں پھنس رہے تھے اپنی پیٹنیوں میں ڈال
کر جب وہ میز پر بیٹھ گئے تو نازش کو اپنا کوئی شناسا

نظر آ گیا وہ ادھر بڑھ گئی اور دریشہ کی جان پر بن آئی
وہ بار بار پتا نہ کافر ٹھیک کر رہی تھی کیونکہ اسے شہر وز
کی نگاہوں سے انجھن ہو رہی تھی۔

”وریشہ آخر آپ مجھ سے اتنا کتراتے کیوں ہیں
اور کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھا رہیں۔“ شہر وز نے
سوال کیا۔

”سچائی تو یہ ہے کہ مجھے اس طرح کی مخلوق
جگہوں پر جانے کا نہ تجربہ ہے نہ شوق مجھے یہ سب
خرافات لگتا ہے۔“

”کمال ہے۔“ شہر وز نے حیرت سے کندھے
اچکائے۔ ”ایسی جگہوں پر جانے کے لیے تو لڑکیاں
مرتی ہیں آپ تو ویسے ہی اس قدر خوب صورت ہیں
کہ آپ کو تو ہر کوئی اپنے ساتھ لانے میں فخر محسوس
کرے گا۔“

”شہر وز صاحب!“ وہ چپکے لہجے میں گویا ہوئی۔
”آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے وہ
لڑکیاں کوئی اور ہوں گی۔“ وہ ڈرامائی پھر گل سے بولی۔
”آپ جانتے ہیں اسلام کی نظر میں عصمت و عفت
اور اخلاق و اعمال دین و دنیا کی بڑی دولت ہیں اور
میری نظر میں عورت کا یہی حسن ہے آپ کی نظر میں
خوب صورتی کا مطلب گوری رنگت اور رنگ روپ
ہے تو معاف کیجیے گا آپ کی سوچ بڑی سطحی اور عامیانہ
ہے مجھے اپنی شکل پر تو نہیں مگر اسے کردار پر فخر ہے۔“
”یعنی آپ عورت کی آزادی کی قائل نہیں۔“

”بالکل قائل ہوں مگر ای حد تک جس کی ہمارے
مذہب نے اجازت دی ہے نہ کہ۔“ تمنا چلا ہنس کی
چال اپنی بھی بھول گیا، علم کے بے شمار میدان ہیں
جہاں عورت اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑ رہی ہے
اپنی قابلیت اور ذہانت سے معمار قوم تعمیر کر رہی ہے
ایک بڑھی بھٹی ماں اپنی اولاد کی چٹی، جسنانی اور

اخلاقی تربیت زیادہ بہتر رکھتی ہے لیکن آپ جس
آزادی کی بات کر رہے ہیں اس نے ملک کی کیا
حالت کردی؟ آپ کو اندازہ ہے عصمت و عفت کے
فائدہ خاستان پارینہ ہو گئے اور مادر پدر آزادی نے
ملک کو تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا اور ہم اپنے اصل
سے ہٹ گئے ہم نے پاکستان کو بنانے کا مقصد
بھلا دیا آپ عورتوں کو علم حاصل کرنے کی آزادی
دیں انہیں ان کی قابلیت کے لحاظ سے ملازمت
کرنے کی آزادی دیں مگر فحاشی بے حیائی اور
عریانی کا مطلب آزادی نہیں ہے۔“

”آپ تو اچھی خاصی تقریر کر رہی ہیں مبلغ اور ملائی
اچھی ہیں۔“ شہر وز نے مذاق اڑایا۔ ”آخر آپ خود کو
سمجھتی کیا ہیں؟“ شہر وز جھنجھلا کر بولا، پچھلی کسی طرح
کا ٹائٹل کو تیار نہیں تھی۔

”ایک عام انسان جس کے پیچھے آپ خواہواہ اپنا
وقت ضائع کر رہے ہیں۔“ دریشہ طعینان سے بولی۔
”خوش فہمی ہے آپ کی آپ جیسی میرے آگے
پیچھے پھرتی ہیں۔“ شہر وز غصہ آ گیا۔

”میں بھی آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کر رہی
ہوں کہ میرے پیچھے دم نہ بلائیں مجھے پیٹ میں
چوہہ اکٹھن لگوانے کا طعنہ شوق نہیں۔“ دریشہ کی بات
سن کر شہر وز کے تلوؤں سے لگی تو وہ مڑی طرح جھج پڑا۔
”یوں اسٹوڈنٹ..... ج!“ وہ غصے میں دریشہ کی
طرف بڑھا کہ بھاتی ہوئی نازش درمیان میں آ گئی۔

”کیا ہو گیا ہے آپ لوگوں کو یہ پبلک پلٹس ہے
کیوں تماشا بن رہے ہیں۔“

”میں نہیں تمہارے بھائی کو تماشا بنانے کا شوق
ہے اور ان کو سمجھا دو میرے منہ نہ لگیں میں لحاظ نہیں
کروں گی۔“ دریشہ جھن کر بولی۔

”تم خود کو سمجھتی کیا ہو میں تو ایک اعلیٰ مقام دنیا جانتا

ہدایت اور اصلاح کا روشن چراغ

ملک کی منفرد دینی و اصلاحی رسالہ

الاسلام

تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے

ممتاز مفکر و دانشور مشتاق احمد قریشی کی زیر ادارت

قیمت: 20 روپے

دینی مسائل کا حل: مولانا سعید احمد جلال پوری
روحانی مسائل: حافظ شبیر احمد

دنیا اسلام کے تمام مسالک متعلق
علماء اہل انکارشات اور آراء پر مشتمل

ایک سو پچاس روپے کا سالانہ اشتراک

.....

alislamkhi@gmail.com

ذی قعدہ 2013 جنوری 2013

ذی قعدہ 2013 جنوری 2013

تھا تمہیں شادی کرنا چاہتا تھا تم سے۔۔۔۔۔ شہروز نے فوراً بیتردد اور نازش کا ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگی۔

”آپ یہ عنایت کسی اور پر کریں میں بچپن سے اپنے کزن سے منسوب ہوں اور جوں ہی میری تعلیم مکمل ہوئی میری شادی ہو جائے گی۔“ وریشہ نے اطمینان سے ہم پھوڑا۔

”کیا بچپنا ہے تمہارا فیاضی مجھ سے زیادہ دولت مند ہے خوب صورت ہے اعلیٰ مقام ہے۔“ شہروز نے چیختی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

”آپ کے لیے ایک شعر عرض ہے:

انسان کو دولت کے ترازو میں نہ تولو
انسان تو ہر دور میں اصول رہا ہے

میرا کزن ایک بااخلاق باکردار اور ایک اچھا انسان ہے اور میرے لیے یہی بہت ہے کہ وہ ایک اچھا انسان ہے دولت کا کیا ہے ہاتھ کا میل نہ میری نظر میں اس کی پہلے اہمیت تھی نہ اب ہے میں یہ سب آپ کو صرف اس لیے بتا رہی ہوں کہ آئندہ مجھ سے بات کرنے سے پہلے آپ سو دفعہ سوچیں۔ نازش! میں رکشہ لے کر گھر جا رہی ہوں مجھے روکنے کو شش مت کرنا اور یہ کھانا مجھ پر ادھار رہا بھی یہ بوجھ اتار دوں گی۔“ وریشہ نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

آج کل شہروز سانپ کی طرح بل کھا رہا تھا جس طرح ایک معمولی لڑکی نے اس کو ذلیل کیا تھا وہ اس سے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور وریشہ اور نازش دونوں میڈیکل کالج میں پہنچ گئیں وریشہ میرٹ پر اور نازش سیلف فنانس اسکیم کے تحت۔ شہروز نے نازش کو سختی سے منع کر دیا تھا وریشہ کے گھر جانے سے اور جب اس نے یہ سنا کہ وریشہ کی اپنے کزن سے ملگنی ہو گئی ہے تو اس کے سر سے جھرتک

آگ لگ گئی وریشہ اس کی ضد بن گئی تھی وہ اس کی اب اور خودماری کو توڑنا چاہتا تھا لیکن اس سے کوئی طوفانی قسم کا عشق نہیں ہوا تھا مگر اپنے ٹھکرائے جانے کا احساس اسے چین سے نہیں رہنے دیتا تھا۔ نازش اس کے خیالات جان کر خوف زدہ تھی وہ اس کا بھائی تھا مگر اس کو اپنی بیٹی بھی عزیز تھی وہ جس طرح کرید کرچہ کر وریشہ اور اس کے منگیتر کے بارے میں سوال کرتا اس سے نازش کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دو تین دن سے وریشہ کالج نہیں آ رہی تھی نازش نے موبائل پر فون کیا تو ہاکا اس کی طبیعت خراب ہے جب سے اس کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا تھا اس کے منگیتر نے تحفے میں اسے ایک قیمتی موبائل دیا تھا۔ فرحان اس کا سگایا چڑا اور خالہ زاد بھائی بھی تھا دو بھائیوں کی دو بہنوں سے شادی ہوئی تھی۔ وریشہ کے بچا کے مالی حالات ان سے کافی بہتر تھے اور وہ اکثر وریشہ کی امی کو امداد کی پیش کش بھی کرتے تھے مگر ان کی خوددار طبیعت نے کسی قسم کی مدد لینے سے انکار کر دیا۔

بلکہ جب بھی وریشہ کی خالہ نے جیکے سے مدد کرنے کی کوشش بھی کی تو فائزہ نے صاف منع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا۔

”دولت رشتوں کی اساس نہیں بلکہ سنگے رشتوں میں بھی دراڑیں ڈال دیتی ہے اور میں اپنے بچوں کو سرائھا کر جینا سکھانا چاہتی ہوں نہ کہ سر جھکا کر۔“ دونوں بہنوں میں مثالی تعلقات تھے۔ فرقان سے N.E.D سے B.E کر رہا تھا بے حد سلجھا ہوا نیک اور شریف لڑکا تھا۔ منگنی کے باوجود اس نے کبھی وریشہ سے کوئی انصاف یا عامیانہ گفتگو نہیں کی تھی۔

آج کل شہروز دو تین دن کے لیے شہر سے باہر گیا ہوا تھا وریشہ کی طبیعت بھی خراب تھی نازش نے مونہ غیبت چاہا اور اس کے گھر پہنچ گئی نازش کو دیکھ کر

وریشہ پھول کی طرح کھل اٹھی۔

”میں تمہیں بے حد یاد کر رہی تھی۔“ اس نے نازش کو گلے لگاتے ہوئے پیار سے کہا۔

”بس منہ دکھی محبت یہ نہیں کہ مجھے بلوای لیجی یا فون ہی کر لیتیں آج بھائی گھر پر نہیں تھے تو میں فوراً نکل آتی۔“

”اچھا تم بیٹھو میں تمہارے لیے پکڑتے بناتی ہوں کیونکہ یہ کھانے کا وقت تو ہے نہیں امی بھی بس آنے ہی والی ہوں گی۔“ وریشہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ارے رہنے دو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں بلکہ سچ پوچھو تو میرا خود دل چاہ رہا ہے منہ کا مزہ اتنا کڑا ہو رہا ہے کہ کچھا اچھا نہیں لگ رہا۔ رات امی نے ہرے دھنیے پودینے کی چٹنی بھی پیسی تھی دونوں مل کر کھائیں گے۔ کل ان شاء اللہ میں کالج بھی آؤں گی۔“ وریشہ اٹھ کر تین گھوٹے لگی اس نے تیزی سے ہری مرچیں پیاز کافی خشک دھنیا اور زیرہ اور کئی مرچ ڈال کر چو لہے پر تیل رکھا اسی وقت تیل بج اٹھی۔

”خالہ امی ہوں گی۔“ وریشہ اٹھنے لگی۔

”تم بیٹھو میں کھول دیتی ہوں۔“ نازش نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور چھوٹا سا صحن عبور کر کے جو کھی دروازہ کھولا اس کی جینوں سے گھر گونج اٹھا۔ کسی نے اس پر تیزاب پھینکا تھا۔ وریشہ گھبرا گئی اس نے چولہا بند کر کے سب سے پہلے اس کے موبائل سے اس کی بمی کو اطلاع دی اور اس کو لے کر برنس وارڈ بھاگی۔ نازش تکلیف سے مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی شکر ہے اس کی آنکھیں سچ گئی تھیں مگر چہرے کی ایک سائیز پوری گردن پر ہی طرح بل گئی تھی سفید چلی نکل آتی تھی۔

وہ خود ہونے والی ڈاکر تھی اس لیے اس کو ہاتھوں

ہاتھ لیا گیا وریشہ کا رو کر برا حال تھا کیونکہ حادثہ اس کے گھر پر ہوا تھا حالانکہ نازش ہوش میں تھی اور اس نے اپنے والدین کو سب کچھ بتا دیا تھا مگر بھی وریشہ دل میں شرمندگی محسوس کر رہی تھی اس کے بھائی کو اطلاع دے دی گئی تھی جس وقت وارڈ میں داخل ہوا نازش کے پاس صرف وریشہ ہی تھی۔

”کیا ہو گیا میری بہن یہ کیسے ہو گیا کس نے میری بہن کے ساتھ یہ ظلم کیا۔“ وہ نازش کی حالت دیکھ کر رو پڑا۔ وریشہ اس کو دیکھتے ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔

”بس بھائی! پتا نہیں کس کو مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ میں تو وریشہ کے گھر گئی تھی۔“ نازش روتے ہوئے بولی۔

”وریشہ کے گھر۔۔۔۔۔ شہروز چیختے ہوئے کھڑا ہو گیا۔“ میں نے تمہیں منع کیا تھا نا اس کے گھر جانے سے منع کیا تھا نا کیوں گئیں وہاں میں چھوڑوں گا نہیں ماجد کو زندہ۔“ اس نے غصے میں منٹھیاں جھنجھکیں اور دیوار پر گھونسنے مارنے لگا۔

”بھائی آپ جانتے ہیں مجھ پر کس نے اور کیوں تیزاب ڈالا۔۔۔۔۔“ نازش نے سوال کیا اور شہروز کا مشتاق ہو گیا۔

”بھائی یاد رکھیے جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتے ہیں خود ہی اس میں گر جاتے ہیں۔ شاید آپ کو آج کے واقعہ سے کچھ سبق مل جائے اور اللہ تعالیٰ آپ پر توبہ کے دروازے کھول دے۔“ شہروز کے پاس شرمندگی اور دکھ کے سوا کچھ کہنے کو نہیں بچا تھا۔

☪

انجمن خیر

مفتاحہ عثمان بھائی
محیر بنی اللہ کراچی
الضیاء علیہا

مذکر مشہور ہے کہ انکھ اوچھل پھانرا اوچھل یعنی کبھی کبھار انکھ کے سامنے موجود اشیاء بہت نظر نہیں آتیں۔ پولیس ڈفٹیش کے دوران عموماً ایسا ہوتا ہے کہ مذکر تو برفل میں موجود ہوتا ہے اور پولیس اسے سامنے دھرم میں پھانتی پھرتی ہے۔ مگر اس کھانسی میں ایسا نہیں ہے اس کیس میں کوئی مکرک پولیس کو ڈفٹیش کے خانے میں نہ نہیں پہنچ رہی تھی۔

پڑھنے اور دیکھنے کے وقتوں کے کہ پڑھنے کے انکھ میں مدح جرح نہ پہنچے تھے امید یہ ہے کھانسی ڈفٹیش کو دور پہلے آئے تھے۔

رہا ہوا
محسن بھائی

قارئین اس بار کہانی شروع کرنے سے پہلے کچھ باتیں میں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ ہم جب کسی کیس کے سلسلے میں مشتبہ اور متعلقہ لوگوں سے تفتیش کرتے تھے تو بال کی کھال اتارتے تھے۔ سوال کے اندر سے سوال نکالتے تھے اگر میں وہ تمام لکھنے لگوں تو کہانی بہت طویل ہو جائے۔ اس لیے میں صرف ضروری سوال و جواب ہی لکھتا ہوں۔ یہ تمہید صرف اس وجہ سے باندھنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ آپ میری کہانیوں کو سن گھڑت نہ سمجھیں۔ اس دن صبح سے مطلع ایر آلود تھا۔ بادل زیادہ گہرے نہیں تھے اور فی الفور بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اجانک سیاہی خورشید اندر داخل ہوا اور مجھے سلیوٹ کر کے گویا ہوا۔ ”سرا! ایک بندہ آپ سے ملنے کا خواہش مند ہے۔“ یہ میری عادت بن چکی تھی کہ جو بھی سائل تھا میں آتا اور مجھ سے ملنا چاہتا اسے میں بلا لیتا تھا۔ ”ٹھیک ہے بیچ دو۔“ میں نے میز پر بکھرے

آپ کے پاس آیا ہوں۔“ آپ اپنا مسئلہ بیان کریں یہاں سب کے ساتھ انصاف ہوتا ہے۔ امیری غریبی اور اونچ نیچ کی کوئی وقعت نہیں۔“ میں نے نرم اور دھمکے لہجے

میں کہا۔ ”میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

”کون سی تھری جناب!“ اس نے معصوم بننے ہوئے کپھر پھر شکایتی لہجے میں بولا۔ ”آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟ میں نے کوئی جرم نہیں کیا؟“ میں نے سیاہی کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک زور

دارلات اس کی کمر پر رسید کر دی۔ وہ اس اچانک افتاد سے متنبہ نہ ہو سکا اور منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ لیکن لگتا پھر تھلا تھا جلدی سے اٹھ گیا اور پیشانی سے بہتے ہوئے خون کو ہتھیلی سے صاف کرنے لگا۔ اب اس کی نظر میں ہنسی تھی۔

”کیوں کچھ یاد آیا؟“ میں نے اسے خوشخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

”تھانے دار صاحب آپ تو خواخوہا.....“ ”تم شگفتہ کے پیچھے نہیں پڑے ہوئے؟“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”وہ تو..... جناب! ایک دن اس سے صرف دو باتیں کی تھیں۔“

”کون سی دو باتیں.....؟“ میں نے اسے گھسنے کے لیے پوچھ لیا تھا درنہ مجھے احساس تھا کہ یہ بد بخت ہاتھ دھو کر لڑکی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

”جناب! کیا پیار کرنا جرم ہے؟“ اس نے سوال کر دیا۔

”زبردستی کا پیار جرم ہے بھولے بادشاہ!“ سیاہی خورشید نے اسے ہنسی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

پھر ہم نے اسے ٹھیک ٹھاک چھتروں کر کے جانے کی اجازت دی تھی اور ساتھ ہی یہ بات بھی اس کے بھیجے میں بٹھادی تھی کہ اگر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو اسے حوالات میں بند کر دیا جائے گا۔

”ہاں تو ٹیپو صاحب! تم نے یہ کیا تھری مچائی

”ایک بد معاش ہاتھ دھو کر میری بیٹی کے پیچھے پڑا ہوا ہے ابھی بات زیادہ چھٹی نہیں آپ اسے سمجھا لیں۔ میری صرف دو اولادیں ہی زندہ بچی ہیں باقی مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر اللہ کو پیار کی ہو چکی ہیں۔“

اس نے اپنا جو مسئلہ بتایا وہ مختصر اس طرح ہے کہ سائل کی دو اولادیں شگفتہ اور آفتاب زندہ تھیں۔ آفتاب پنجاب کے ایک شہر میں واقع جوتے بنانے والے ایک کارخانے میں ملازم تھا اور مہینے میں دو تین چکر لگاتا تھا وہ کارخانے والوں کی طرف سے ملی ہوئی رہائش گاہ میں رہتا تھا۔ یہ مسئلہ مین بیر کس تھیں۔

شگفتہ کے پیچھے ایک آوارہ جوان ٹیپو (جس کا اصل نام طارق تھا) پڑا ہوا تھا۔ طارق عرف ٹیپو کے متعلق یہ پہلی شکایت تھانے تک آئی تھی اس سے پہلے اس کا نام بھی میرے کانوں تک نہیں پہنچا تھا۔ میں نے سائل کو کسلی دلا دے کر رخصت کر دیا۔ جاتے جاتے وہ مجھے ایک خطرے سے آگاہ کر گیا تھا کہ وہ نہیں چاہتا بات آفتاب تک پہنچے۔ نہیں تو اس کا بیٹا یا تو قاتل بن جائے گا یا مقتول۔

اس کی بات میں وزن تھا اس لیے کسی قسم کی گڑبڑ سے پہلے میں معاملے کو سلجھانا چاہتا تھا۔

شام چار بجے ہمارا مطلوبہ جوان ہمارے سامنے تھا۔ اس کو خورشید نے لکڑا یا تھا اور اس وقت کسی ایسے جن کی طرح ٹیپو کے پیچھے کھڑا تھا جو میرے حکم کا منتظر ہو۔

جوان دیکھا ہی تھا جیسے فلموں میں ولن ہوتے ہیں شاید پنجابی فلمیں کثرت سے دیکھتا تھا۔ عمر پچیس سال کے ادیب قریب تھی۔

”ہاں تو ٹیپو صاحب! تم نے یہ کیا تھری مچائی

اور اس پر مقدمہ بنایا جائے گا۔
 میں تو سمجھا تھا کہ چلو بات ختم ہوگئی لیکن چار پانچ دن بعد ہمیں اطلاع ملی کہ ٹیڈ لاپتا ہو گیا ہے۔
 اطلاع اس کا باپ اور چچا لے کر آئے تھے۔ میں نے ٹیڈ کے باپ کو آڑے ہاتھوں لیا۔
 ”بزرگو! آپ نے اپنے بیٹے کو بے لگام چھوڑا ہوا تھا اب میرے پاس کیا لینے آئے ہیں؟“
 ”مجھے لگا تھا کہ ٹیڈ کرم دین کہہاں کی بیٹی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں اور میرے بھائی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔“ اس نے اپنے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”پھر.....؟“ میں نے پیپر دیٹ کو کاغذات پر رکھتے ہوئے کہا۔
 ”اس نے کہا تھا کہ وہ شگفتہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“
 ”آپ کو رشتہ لے کر جانا چاہیے تھا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا یہ سوال میں نے ان کے خیالات جاننے کے لیے کیا تھا۔
 ”جناب! آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ کہاں ہمارا اونچا خاندان اور کہاں وہ کہہاں.....؟“ ٹیڈ کے چچا نے دعویت سے کہا۔
 مجھے بہت غصہ آیا اس کی بات پر۔ بڑی مشکل سے اپنے غصے کو قابو کیا اور روکھے لہجے میں انہیں کہا۔
 ”اپنے آوارہ نخت جگر کو ڈھونڈیں میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“
 مجھے احساس ہوا کہ ٹیڈ کا باپ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اس کا بھائی اسے لے کر چلا گیا۔
 مجھے ٹیڈ کا چچا ایک مغرور شخص لگا جب کہ ٹیڈ کا باپ اس کے مقابلے میں ایک معقول آدمی لگتا تھا۔

ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ اس وقت اسے ایس آئی میرے پاس نہیں تھا ورنہ بات بڑھ جاتی۔
 دونوں بھائیوں کے رویے اور باتوں سے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ ٹیڈ کی جو خاطر تواضع ہم نے اٹھانے میں کی تھی اس سے وہ واقف ہیں۔
 رانا تو رونا کو گلے دن جب وہ آیا تو میں نے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ حسب معلول سگریٹ کا کش لے کر بولا۔
 ”سر! یہ معاملہ ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔“
 اور واقعی دو روز بعد ٹیڈ کا باپ ایک معزز آدمی کے ساتھ میرے کمرے میں موجود تھا اور التجا بھرے لیجے میں کہہ رہا تھا۔
 ”تھانیدار صاحب! آپ میرے بھائی کی باتوں کے لیے مجھے معاف کر دیں وہ تو جھوٹا ہے۔“ اس وقت وہ میرے سامنے کچھ سیڑیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور رانا تو رونا سگریٹ سے شغل کر رہا تھا۔
 ساتھ آئے ہوئے معزز آدمی نے پہلی دفعہ لب کو شامی کرتے ہوئے کہا۔
 ”تھانیدار صاحب! آپ مہربانی کر کے ٹیڈ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کریں۔ وہ اتنے دن بھی بھی غائب نہیں رہا۔“ میں نے رپورٹ درج کروانے انہیں محرر کے پاس بھیج دیا۔
 ”سر! لگتا ہے آفتاب نے کام دیکھا دیا ہے۔“ رانا نے سگریٹ کی رائگھ اس بڑے میں جھانپتے ہوئے کہا۔
 ”بھئی ابھی یہ بات قبل از وقت ہوگی ذرا رپورٹ سامنے آنے دو پھر کچھ سوچا جائے گا۔“
 رپورٹ سامنے آئی تو ہمیں پتا چلا کہ طارق عرف ٹیڈ سمات تاریخ سے لاپتا ہے آج بارہ تاریخ تھی۔

کچھ کی کہانی میں میں نے اپنے تجربہ مند کا ذکر کیا تھا وہ جاسوسی کہانیاں پڑھ پڑھ کر خود کو بھی ایک جاسوس کی طرح سمجھتا تھا۔ وہ کس پائے کا جاسوس تھا اس بار اس کے امتحان نے اس بات کا فیصلہ کرنا تھا۔
 ہم نے اسے بلا کر ساری صورت حال اس کے گوش گزار کر دی اس نے کہا۔
 ”سر! آپ بالکل فکری نہ کریں ٹیڈ کے متعلق الف سے کی تک آپ کے سامنے آجائے گا۔“
 اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا کہ وہ اسے ڈھونڈ لے گا۔
 ڈھونڈنا تو ہمیں ہی تھا بس ذرا اس کی سرگرمیوں سے آگاہی لازمی تھی۔
 ویسے یہ بھی ممکن تھا وہ کہیں دور نکل گیا ہو اور خود ہی واپس آ جائے۔ اگلے دو دن تک ٹیڈ تو واپس نہ آیا البتہ اس کے متعلق معلومات بذریعہ ندیم ہم تک پہنچ گئیں۔
 اور اس وقت ہم اپنے سامنے رکھی کافی کی پیالیوں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو گھورتے ہوئے انہی معلومات کی روشنی میں آئندہ کاروبارام ذہن میں ترتیب دے رہے تھے۔ لیجے آپ کو بھی ان معلومات سے آگاہ کریں۔
 ٹیڈ ایک آوارہ گرد لا امالی اور جواری تھا۔ کبھی کبھی چھوٹی موٹی بد معاشی میں بھی ہاتھ مار لیتا تھا۔ شگفتہ کے علاوہ کسی اور لڑکی کے متعلق کوئی بات کسی کے علم میں نہیں تھی۔ شگفتہ والا معاملہ چار پانچ بندوں کو پتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ بات شگفتہ کے بھائی تک بھی پہنچ چکی ہو۔ جو تے کا ڈھ بھئی تھا نے کی حدود میں تھا یہ بات بھی پتا چلی کہ گم ہونے سے ایک دن پہلے ٹیڈ نے ایک بھاری رقم جیتی تھی۔
 ”سر! کافی پیئیں۔“

کافی پینے کے بعد رانا چلا گیا۔
 جو پروگرام ہم نے ترتیب دیا تھا اس کا ذکر ضروری نہیں ہے آہستہ آہستہ سب کچھ آپ کے سامنے آتا جائے گا۔ جس دن ٹیڈ غائب ہوا تھا اس دن آفتاب آیا ہوا تھا اس بات کو بھی ہم نے اپنے ذہن میں رکھا ہوا تھا۔
 جوئے کا ڈھ ہم نے بند کر دیا تھا ڈھ کے کا مالک ہمارے ہاتھ نہیں لگ سکا تھا وہ کہیں روپوش ہو چکا تھا۔
 اگلے دن ہم نے آفتاب کے والد کو اٹھانے بلایا۔ وہ بہت پریشان تھا اس سے پہلے کہ ہم اس سے کوئی بات کرتے وہ بولا۔
 ”تھانیدار صاحب! اگر آپ مجھے نہ بلا لے تو میں آج خود ہی حاضر ہو جاتا۔“
 ”کیوں کوئی خاص بات؟“ رانا نے چونک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ٹیڈ کے باپ نے ہمیں بہت پریشان کیا ہوا ہے۔ وہ براہ راست آفتاب کو مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں۔“
 ”کیا یہ ممکن نہیں ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”جناب! آپ بھی وہی بات کر رہے ہیں ہم ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔“
 ”کیا یہ بات سچ ہے کہ جس دن اسے ٹیڈ غائب ہے اس دن آپ کا بیٹا آیا ہوا تھا۔“ میں نے ایک اور زاویے سے سوال کیا۔
 ”لیکن جناب! اس سے کہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ.....؟“ پھر اس نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔
 ”آڈل تو میرے بیٹے کو کسی بات کا پتا ہی نہیں ہے اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے تو وہ لکار کر وار کرنے والا

بچہ ہے۔“ اتنا کہ کردہ اس طرح میری طرف دیکھنے لگا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو کہ اسے ایسی بات تھانے میں بیٹھ کر نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن بات نکل چکی تھی اس کے بعد اس کو چپ لگ گئی۔

”دیکھو بزرگوار! ہمیں فوری طور پر آفتاب چاہیے اسے بلوائے ورنہ ہم آپ کو تھانے میں بٹھالیں گے۔“ وہ سر جھکا کر چلا گیا اور وعدہ کر کے گیا کہ جلد از جلد آفتاب کو حاضر کرے گا۔

کسی مشتبہ کو لینے ہم خود جاتے تھے لیکن ہم نے اس دوران جو تے بنانے والے کارخانے سے پتا کروا لیا تھا۔

وہاں سے معلوم ہوا تھا کہ آفتاب اس بار واپس ڈیوٹی پر نہیں پہنچا تھا یہ بھی ممکن تھا کہ آفتاب گھر میں ہی چھپا ہوا ہو۔ ہم نے دانستہ آفتاب کے باپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ آفتاب ابھی تک ڈیوٹی پر نہیں پہنچا ہے ہم رد عمل دیکھنا چاہتے تھے۔

ویسے ہمیں پکا شبہ نہیں تھا کہ آفتاب نے نیپو کو غائب یعنی قتل کر کے لاش کہیں وبادی ہے۔ اس کے متعلق پتا چلا تھا کہ دلیر ہے غیرت اور رانا پر سر ملنے والا ہے۔

”سر! میرے خیال میں ہمیں کچھ اور باتوں پر غور کرنا چاہیے۔“ رانا نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”بھئی سب سے پہلے تم نے ہی آفتاب پر شک کا اظہار کیا تھا۔“ میں نے ہنستے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”سر! یہ کوئی حتمی بات نہیں ہے غائب یا گم ہونے سے ایک دن پہلے اس نے ایک بھاری رقم جوئے میں جیتی تھی۔

”اگر اس دن غائب ہوا ہوتا تو کسی رہزن کے متعلق سوچا جاسکتا تھا۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ گفتگو کے علاوہ کسی اور لڑکی کا معاملہ بھی نہیں ہے کہ اس طرف تفتیش کے گھوڑے دوڑائے جائیں۔ فی الحال لے دے کے آفتاب ہی رہ جاتا ہے۔ دوسرے وہ بھی غائب ہے۔“ اس رات ہم اچھے ذہنوں کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اگلی صبح سردی مزاج پوچھ رہی تھی ہم نے آفتاب کی سُن گن لینے کے لیے خبروں کے جال پھیلائے ہوئے تھے۔

وہ بجے کے قریب جب رانا آیا تو اس کے ہاتھ میں نکلن کیر بیز تھا اور جب اس نے اسے کھولا تو اس میں سے گرم گرم طوہ برد آمد ہوا۔

”واہ بھئی! موسم کے لحاظ سے بہترین انتخاب ہے۔“ نکلن کیر بیز بڑا تھا یعنی تین ڈبلوں والا اور طوہ اتنا تھا کہ تھوڑا تھوڑا سب کے حصے میں آ گیا۔ سردیوں میں خاص کر جس علاقے میں ہمارا تھا تھا طوہ پکڑنے خشک میوہ جات اور کافی ضرورت تھی اس کڑا کے کی سردی میں ہم اپنے فرائض سے غافل نہیں تھے۔ آفتاب کے باپ کو ہم نے بلا بھیجا۔

”تھانیدار صاحب! آفتاب کو بلانے کے لیے میں نے ایک بندہ رات کو ہی روانہ کر دیا تھا۔“ وہ آتے ہی بولا۔ ہم نے اسے اب زیادہ اندھیرے میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا اور اسے بتا دیا کہ آفتاب ڈیوٹی پر نہیں پہنچا، وہ حیران ہو کر ہماری طرف دیکھنے لگا۔

”تھانیدار صاحب! میرا آفتاب کہاں گیا؟“ اس کی آنکھوں سے گہری تشویش ظاہر ہو رہی تھی اور یہ ایک فطری رد عمل تھا۔

ہم نے اسے واپس نہیں جانے دیا بلکہ کانسٹیبل سلطان محمود کی ہیرک میں پابند کر کے بٹھا دیا۔ اس کے بعد یہ بات ارد گرد پھیلا دی کہ آفتاب کے باپ کو پولیس نے تھانے میں بٹھا لیا ہے۔ جب تک وہ حاضر نہیں ہو جاتا اس کے باپ کا گھر جانا ممکن نہیں ہے ویسے ہم نے اسے عزت سے بٹھایا تھا اس کے قریب کونکوں والی ٹائیلیٹ رکھوا دی تھی اور کھانے اور چائے پانی کا بندوبست کر دیا تھا۔ اگر اس کے بیٹے نے کوئی جرم کیا تھا تو اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔

”اس کو بٹھانا ہماری مجبوری تھی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب مجھے اطلاع دی گئی کہ ایک جوان مجھ سے ملنا چاہتا ہے اس وقت رانا تو میری کیس کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔

جب جوان میرے سامنے آیا تو میں بغور اس کا جائزہ لےنے لگا، بہت خوب صورت جوان تھا۔ رنگ گورا، آنکھیں موٹی موٹی اور بال تھکھریا لے تھے ماتھے پر ٹکائیں پڑی ہوئی تھیں۔

”تھانیدار صاحب! میرا نام آفتاب ہے پتا چلا کہ آپ کو میری تلاش ہے سو میں حاضر ہو گیا ہوں میرے باپ کو چھوڑ دیں۔ وہ بزدل ہیں اگر وہ مجھے پہلے بتا دیتے تو انہیں یہ دن دیکھنا نہ پڑتا آج فجر سے گردن اونچی کر کے کہتے کہ میرے بیٹے نے شیروں والا کام کیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا یہ پتا تو لگ گیا تھا کہ جوان دلیر ہے۔

”تھانیدار صاحب! آپ میرے والد صاحب کو بلائیں ان کے سامنے باتیں ہوں گی۔“

میں نے اس کی خواہش پوری کر دی۔ ”آفتاب تم کہاں تھے؟“ باپ نے چھوٹے ہی

سوال کر دیا۔ ”ابا جان! آپ نے تو مجھ سے گفتگو والی بات چھپائی تھی لیکن مجھے اس بار آنے پر پتا چل ہی گیا۔“ آفتاب نے گویا شکایت کی۔ ”تو کیا تم نے نیپو کو.....“ باپ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ابا جان! میں بے غیرت نہیں ہوں میں اس لیے ایک دوست کے پاس چھپا ہوا تھا کہ جو بھی نیپو مجھے نظر آئے میں اسے قتل کر کے تھانے میں حاضر ہو جاؤں۔“ آفتاب نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”تو کیا تم نے نیپو کو قتل یا غائب نہیں کیا۔“ میں نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں تھانیدار صاحب! آپ میرے والد صاحب کو چھوڑ دیں اور مجھے چند دن کی مہلت دے دیں میں نیپو کو قتل کر کے گرفتاری دے دوں گا۔“ میں نے اس کی ایک خواہش پوری کر دی اور اسے فی الحال حوالات میں بند کر دیا۔

یہ تو وہی معاملہ ہو گیا تھا کہ جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے تھے۔ میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

اگلا دن ایک روشن دن تھا آسمان بالکل صاف تھا۔ بڑی گفتگو گفتگو دھوپ لگی ہوئی تھی اور ہم گفتگو سے شروع ہونے والے کیس کے متعلق سوچ رہے تھے۔

”سر! ذرا نیپو کے گھر کا ایک چکر نہ لگا آئیں۔“ رانا نے جیب سے سگریٹ اور ماچس نکالتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا ہوں کہ اس دوران کئی بار نیپو کا باپ آچکا تھا اور ہر بار یہ کہتا تھا کہ خدا را نیپو کو ڈھونڈیں اور ہم اسے تسلی دلا سہے

کر رخصت کر دیتے تھے اس کے علاوہ ہم کبھی کیا سکتے تھے۔

اب تک ہماری تنقید کا محور آفتاب تھا اس کے پاس ٹیپو کوئل کرنے کی معقول وجہ تھی اور اس بات کا امکان تو بہر حال شروع سے تھا ہی کہ شگفتہ والا معاملہ زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم ٹیپو کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ تین کمروں پر مشتمل ایک کھلا کھلا گھر تھا مچھن میں بیری کا ایک درخت تھا۔

ہم نے ٹیپو کا کمرہ دیکھنے کی خواہش کی باپ نے بتایا کہ کمرے کو تالا لگا ہوا ہے۔ چابی صرف ٹیپو کے پاس ہوتی تھی ہم نے ضروری کارروائی والے یعنی دو معزز پرنوسیوں کی موجودگی میں کمرے کا تالا توڑ دیا۔

کمرے میں ہر چیز بے ترتیب تھی ایک صندوق کا تالا بھی ہمیں توڑنا پڑا اور صندوق میں ہمیں نوٹوں سے بھرا ایک کپڑے کا چھوٹا سا تھیلہ مل گیا۔ یہ تھیلہ ایسے بند کیا ہوا تھا جیسے بیروں کے کپڑے والے پنجرے بند کیے جاتے ہیں۔

گواہوں کی موجودگی میں ہم نے وہ تھیلہ اپنے قبضے میں کیا اس کے علاوہ کوئی اور قائل ذکر چیز ہمیں نہیں ملی۔

اتنے نوٹ کو دیکھ کر ٹیپو کا باپ بھی حیران ہوا تھا لیکن وہ یہ نہ بتا سکا کہ اس کے بیٹے نے اتنے نوٹ کہاں سے لیے تھے وہ بتا بھی کیسے سکتا تھا یہ تو ہمیں بتاتا تھا۔

جب ہم نکل رہے تھے تو شوکی نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”سرا! دیکھیں کتنا خوب صورت کتاب ہے۔“ میں نے چونک کر اُٹھ کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ ہمارے استفسار پر ہمیں بتایا گیا کہ یہ کتنا ٹیپو نے رکھا

ہوا ہے اور اس کے ساتھ بہت زیادہ مانوس ہے۔ کتنا شکاری لگتا تھا۔ یہ تو اندھے کے ہاتھ شیر آنے والی بات ہو گئی تھی۔ کتے کو دیکھ کر اور یہ جان کر کہ کتا ٹیپو سے مانوس ہے میرے ذہن میں ایک اسکیم آئی میں نے ٹیپو کے باپ سے کہا۔

”کل صبح اس کتے کو اور ٹیپو کی کوئی قیص لے کر تھانے میں آ جانا۔“

پھر ہم اسے ہکا بکا چھوڑ کر تھانے میں واپس آ گئے۔ جو اسکیم میرے ذہن میں آئی تھی اس کے لیے یعنی اس پر عمل درآمد کرنے سے پہلے ایک کام اور کرنا تھا۔ ہم نے سپاہی خورشید کو بلا کر اسے بتایا کہ اسے یہ پتا کرنا ہے ٹیپو نے کتنے پیسے جیتے تھے تمام جواہری ہماری ہتھی میں تھے۔

دو گھنٹے بعد ہمیں پتا چل گیا کہ ٹیپو نے تقریباً بارہ سو روپے جیتے تھے۔ ہم نے ٹیپو کے صندوق سے برآمد ہونے والے روپے گنے تھے وہ سات سو پندرہ روپے تھے یہ اس دور کے حساس سے کافی بڑی رقم تھی۔

تقریباً چار سو پچاسی روپے کم تھے اس کو اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ چار سو پچاسی روپے بھی ٹیپو کے ساتھ کم تھے۔

اگلے دن ہم نے اپنی اسکیم پر عمل کر ڈالا۔ کانسیبل سلطان محمود اور دو سپاہیوں کو کتا دے کر بھیج دیا کیونکہ صبح ٹیپو کا باپ کتے لے کر آ گیا تھا۔

کتا جا ہی نہیں رہا تھا لیکن جب ہم نے اسے ٹیپو کی قیص سنا کھائی تو اس نے پہلے تو چاروں طرف دیکھا تھا پھر تھانے کے گیٹ سے باہر کی طرف چل پڑا تھا۔

تقریباً چار گھنٹے بعد ایک سپاہی ہانپتا ہانپتا آیا اور مجھے کچھ بتانے کے بعد بولا۔

”سرا! آپ کو ہیڈ کانسیبل صاحب نے یاد فرمایا ہے۔“

میں نے ایک اور سپاہی ساتھ لیا سپاہی کے پاس کچھ ضروری سامان تھا۔

ہماری منزل ایک الگ تھلگ مکان ثابت ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ کتے کو ایک درخت کے ساتھ باندھا گیا ہے وہ ایک طرف جانے کے لیے زور کر رہا ہے۔

”سرا! اس درخت کے پاس کتا کافی باؤلا ہو گیا تھا۔“

میں نے دیکھا یہ ایک پتیل کا درخت تھا اور اس کے آس پاس کی مٹی نرم تھی۔ وہاں ہم نے کھدائی شروع کر دئی ایسے لگتا تھا جیسے یہاں کچھ دن پہلے ہی کھدائی کی گئی ہے اور ہماری توقع کے عین مطابق کچھ دیر کے بعد ٹیپو کی لاش برآمد ہو گئی۔

ایک سپاہی کے ساتھ لاش میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی اور خود اس مکان میں ڈیرہ لگا لیا۔ ہمارے لیے چار پائی اور کرسیوں کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔

وہاں ڈیرہ درجن کے قریب مرد و زن جمع ہو گئے تھے عموماً کو باہر نکال کر ہم نے مردوں کو اپنے پاس بٹھالیا۔ ان میں اس مکان کا مالک بھی شامل تھا جس کا نام کبیر معلوم ہوا۔

”ہاں تو کبیر صاحب! یہ مکان آپ نے جن کو کرائے پر دیا تھا ان کا اتنا پتا معلوم ہے؟“ میں نے کبیر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”جناب! وہ میاں بیوی لگتے تھے اور کہہ رہے تھے ہمارا سامان اور سب کچھ سیلاب میں بہہ گیا ہے ہم لٹے پٹے آئے ہیں ہم نے ترس کھا کر انہیں مکان کرائے پر دے دیا تھا اور کرایہ بھی آدھا لیا تھا۔“

”کیا وہ واقعی میاں بیوی تھے؟“

”جناب! ہم نے ان کی زبان پر اعتبار کیا تھا نکاح نامہ نہیں مانگا تھا۔“

”بچوں وغیرہ کے متعلق کیا کہتے تھے؟“

”کہتے تھے ہمارے بچے نہیں ہیں ہم بے اولاد ہیں۔ جناب! ہمیں کیا پتا تھا ہم نے تو ترس کھا کر انہیں دو چار پائیاں بستر اور برتن دے دیے تھے۔“

کبیر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

مختصراً کہانی یوں جتنی ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت نے مکان کرائے پر لیا تھا پورے مہینے کا کرایہ دیا تھا لیکن دس دن بعد ایسے غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

میں نے دونوں کے حلیوں کے متعلق پوچھا مرد کے حلیے کے متعلق تو کبیر نے بتا دیا لیکن عورت کے حلیے کے متعلق وہ واضح طور پر کچھ نہ بتا سکا۔ میں نے اسے کہا کہ گھر والوں سے پوچھ کر آئے۔ کبیر سے اس کی گھر والی زیادہ تیز لگی اس نے عورت کا سر سے پاؤں تک حلیہ بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ عورت کے پاؤں کی چھوٹی انگلی نہیں ہے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی وجہ سے کٹ گئی ہو۔

یہ تشابہ بہت بڑی تھی۔ ہم نے مکان کو سیل کر دیا اور تھانے واپس آ گئے۔ یہاں اے ایس آئی رانا تمویر میرا منتظر تھا۔ میں نے اسے اب تک کی کارروائی کے متعلق بتا دیا۔

”سرا! ٹیپو وہاں کیا کرنے گیا تھا اور لگتا ہے اس مرد اور عورت نے اسے قتل کر کے لاش دبا دی ہے۔“ رانا نے سگریٹ کی راکھ جھاتکتے ہوئے کہا۔

”سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ٹیپو کے ساتھ ان کی کیا جھنجھی تھی؟ ہم اس قسم کی باتیں کرتے رہے ہمیں بھروسے میں سے سوئی ڈھونڈنی تھی۔ اسی دن

ہم نے عورت اور مرد کے خاکے بھا کر دور و نزدیک کے تھانوں میں بھجوا دیے۔

ایک خاکہ ہم نے اپنے بچہ (ندیم) کو بھی دے دیا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے تک اس کیس کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق نیپو کی موت سات تاریخ کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور یہ وہی تاریخ تھی جس دن وہ لاپتا ہوا تھا۔ اس کے سر میں پیچھے سے گولی ماری گئی تھی۔ فاصلہ تقریباً ایک فٹ رہا ہوگا۔

لاش درجائے کر چلے گئے۔ آفتاب کو ہم نے چھوڑ دیا تھا اور اسے پاکیزگی تھی کہ قدرت کے کاموں میں جو صلیمت ہوتی ہے وہ بندہ نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے جلد اشتعال میں آنا بھی بات نہیں ہوتی۔

وہ ہمارا اشارہ سمجھ کر سر جھکائے چلا گیا تھا۔ آج ہم نے دیر تک تھانے میں رہنا تھا اس لیے رات کا کھانا ہم نے تھانے میں ہی منگوا لیا۔ ابھی میں اور رانا تنویر کھانے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ میری میز پر رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف ندیم بول رہا تھا۔ اس نے کوڑو ورڈ میں پیغام دیا کہ ضروری تیاری کے ساتھ فلاں گاؤں میں نفری پہنچ دیں۔ میں نے اے ایس آئی رانا تنویر کی سربراہی میں چار چاک و چوبند ہلکار روانہ کر دیے۔

گاؤں ہمارے تھانے سے چار گھنٹہ دور شمال کی طرف واقع تھا اور ہمارے تھانے کی حدود میں آتا تھا۔ اس وقت لیڈی الیکار کا فوری بندوبست نہیں ہو سکتا تھا اس لیے معاملہ رانا پر چھوڑ دیا۔ وہ ذہین تھا اسے پتا تھا کہ چار اور چار یواری کے تقدس کا خیال رکھتے ہوئے گھر کے اندر سے کس طرح گرفتار عمل

میں آتی ہے۔

ہماری چنگی ہوئی پارٹی مجرموں کو گرفتار کر کے لے آئی۔ ایک عورت اور ایک مرد ان کی شناخت پر پڑ کروانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم انہیں سیدھے ٹرائل روم میں لے گئے کیونکہ ایسے طرم یا مجرم لاتوں کے بھوت ہوتے ہیں بہر حال ہماری لاتوں سے تو بڑے بڑے بھوت بول پڑتے تھے۔ وہ کیا چیز تھے وہ بولے اور خوب بولے۔

مرد کا نام چنگیز اور عورت کا نام نادرا تھا۔ وہ کافی عرصہ سے لوگوں کو ٹھگ رہے تھے کسی گاؤں یا شہر میں مکان لیتے تھے اور خود کو حالات کے مطابق مظلوم یا لاپتا ظاہر کرتے تھے ان کے پاس کوئی سامان نہیں ہوتا تھا رات کو عورت کسی نہ کسی مرد کو پھانس کر گھر لے آتی تھی باہر تالا لگا کر جاتی تھی جب کہ مرد یعنی چنگیز اندر چھپا ہوتا تھا۔

وہ سیدھا سا دھادور تھا اس لیے لوگ یعنی حسن پرست مرد و عورت کے جال میں آ جاتے تھے۔ عورت بلا کی حسین تھی وہ ایک ماہ سے زیادہ کہیں نہیں رہتے تھے اب ان کا طرہ بقیم وار دات سینے۔

عورت نیپو کو اپنی چنگی چھری باتوں میں لا کر گھر لے آئی۔ اسے چائے پلائی چائے میں بالکل معمولی سی مقدار نیند کی دوائی ڈالی۔ چائے پی کر نیپو اتنا غصیل ہو گیا عورت نے مرد کو بلایا انہوں نے نیپو کی جیب سے دو چار روپے چھوڑ کر سارے پیسے نکال لیے۔

پندرہ منٹ کے بعد نیپو کی آنکھ کھلی پہلے تو وہ کچھ نہ سمجھ سکا لیکن جب وہ کچھ سمجھنے کے قابل ہوا تو اپنے سامنے ایک گینڈا نما مرد کودیکھا۔ یہ چنگیز تھا۔ ”تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“ مرد نے کراہت آواز میں کہا۔

”میں..... میں.....“ نیپو پو کھلا گیا تھا۔

”میری بیوی نے مجھے بتایا ہے کہ تم زبردستی اندر گھس آئے تھے اور میری بیوی پر دست درازی کی کوشش کی تھی۔“

نیپو کا خیال فوری طور پر اپنی جیب کی طرف گیا اور جب اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی اس کا پارہ چڑھ گیا۔

”بلاؤ اس حراف کو وہ مجھے درغلا کے لائی تھی شرافت سے میرے پیسے واپس کر دو۔“

”تم دودھ پیتے بچے ہو جسے درغلا کر لایا گیا چلو دفعہ ہو جاؤ۔ درنا بھی پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“ نیپو ڈرنے والا کہاں تھا اس نے پستول نکال لیا اور چنگیز کی طرف تان کر بولا۔

”پیسے نکالتے ہو یا.....؟“ پستول کی نال پر سائنٹر فٹ تھا۔

”ارے تم کیوں آگئیں؟“ اچانک چنگیز نے پو کھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ یہ ایک نفسیاتی اور کارگر حربہ تھا جو نیپو پانا چنگیز نے اسے چھاپ لیا اگلے ہی لمحے پستول چنگیز کے ہاتھ میں تھا۔

”مب بولو.....“ اس نے قبضہ لگاتے ہوئے کہا۔

نیپو نے عورت کو بلانے پر اصرار کیا۔ وہ اچانک خود ہی آگئی شاید شور شراب سن کر آگئی تھی کیونکہ پہلے تو کبھی اتنا ہنگامہ نہیں ہوا تھا۔ نیپو نے نادرا کو ایک گندی سی گالی دیتے ہوئے کہا۔

”اب اپنے پار کو بچ بٹاؤ کہ کیا ہوا تھا؟“ عورت نے وہی بات دہرائی جو مرد کہہ چکا تھا۔

”تم.....“ وہ عورت کی طرف لڑکا۔ ادھر چنگیز نے سائنٹر لگے پستول سے نیپو کو ڈرانے کے لیے ایک ہوائی فائر کرتے ہوئے

اسے لٹکا رہا۔

”جہاں ہو ہیں رکو۔“

نیپو نہ صرف رک گیا بلکہ چاروں خانے چت گر پڑا وہ گولی اندازے کی غلطی سے اس کی کھوپڑی میں گھس گئی تھی۔

دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے تڑپتا دیکھتے رہے وہ جلد ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ اب دونوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ کافی دیر سوچتے رہے کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ انہوں نے آخر وہی کیا جس کا ذکر آچکا ہے۔

اور وہاں سے نکل کھڑے ہوئے جانے سے پہلے سارے نشان مٹا گئے۔ کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جب انہوں نے یہ بتایا کہ دونوں نے ایک پھل والی چھری اور سریے کے ٹکڑے سے زمین کھودی تھی تو مجھے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی انہوں نے آکھل بھی برا کر دیا تھا۔ وہ کافی عرصہ سے واردتیں کر رہے تھے لیکن کبھی پکڑے نہیں گئے تھے لیکن سیانے کہتے ہیں کہ سیر کو سوا سیر مل جائے تو انجام سبکی ہوتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

قارئین! یہ بات میں آپ کی ذہانت پر چھوڑنا ہوں کہ ندیم نے کیسے ان کو ڈھونڈا ہوگا۔ ویسے میری طرح آپ بھی مان گئے ہوں گے کہ ندیم پورا نہیں تو آدھا جاسوس بن گیا تھا۔ ایک اشارہ میں آپ کو دے دیتا ہوں کہ اس گاؤں میں بھی ہماری ایک بچہ رہتی تھی۔



روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

معدیہ فیاض..... فیصل آباد

ج: رشتے کے لیے:- بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف دعا بھی کریں۔

گھر میں آسب نہیں ہے۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مؤمن اول و آخر 77 مرتبہ درود شریف پڑھ کر دم کر دیا کریں۔ چینی سب گھر والوں کے استعمال میں آئے۔ یہ عمل ہمیشہ رہیں ان شاء اللہ گھر میں لڑائی جھگڑے نہیں ہوں گے۔ بھائی یا رزاق یا فصاح کا درود بھیجیں۔

نسرین اختر..... میانوالی

ج: لحاظ و مروت اتنی ہو کہ اپنا نقصان نہ ہو۔ سورۃ الاخلاص ہر فرض نماز کے بعد 21 دفعہ پڑھ کر بچا کے لیے دعا کریں۔ کم از کم 3 ماہ تک۔

غیم اختر..... میانوالی

ج: سورۃ الاخلاص روزانہ اول و آخر 11'11 بار درود شریف 1001 بار پڑھیں۔ 3 ماہ تک۔ جائیداد کا حصہ اور بھائی کو اپنی طرف مال کرنے کے لیے۔

محمد سلیم..... ساہیوال

ج: "یا سکھ" ہر نماز کے بعد 121 بار پڑھ کر بچے کا تصور کریں کہ وہ ٹھیک اور کھانا منے لگا ہے۔ شوہر کو سورۃ طہ کی پہلی 5 آیت ہر نماز کے بعد ایک گھونٹ پانی پہ 11 بار پڑھ کر پلائیں۔

نسرین شریفان بٹالی..... حجرہ شاہ مقیم

ج: "یا لطیف یا ودود" 101 مرتبہ روزانہ رات کے وقت تہائی میں اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف نیت شوہر کے تمام برے کام چھوٹ جانے کی اور ان کے دل میں آپ کی محبت لگے گھر کا مذہب داری پیدا ہو سکے۔

ہے۔ خلوص کے ساتھ یہ وظیفہ کریں اور دعا بھی کریں۔

جب نعمان سو جائے اس کے سر ہاتے کھڑے ہو کر سورۃ المعصر 21 مرتبہ پڑھیں اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف نیت یہ رکھیں کہ فرما نیر بار ہو رہا ہے۔ وظیفہ با آواز پڑھیں ساقی آواز سے کہ کڑ کا نیند سے اٹھ نہ جائے۔

فازہ صدیق..... نامعلوم

ج: نیم کے 41'41'41 سے لے کر پھر سات نکلوں کا پانی لے کر (اتنا ہو کہ تین بار غسل کر سکیں) سب کو کس کر لیں۔ ایک کو پانی لے اس میں 41 نیم کے پتے جس پر آخری 3 ل 3 بار پڑھ کر چوں پر پھونک ماریں اور اتنا سرسوں کا تیل لیں کہ آپ کے پودے جسم پر مالش ہو جائے۔ پانی میں پتے اور تیل ڈال دیں اور پکائیں۔ اتنا پکائیں کہ تیل اور پتے ترہ جائیں۔ تیل سے رات کو جسم پر مالش کریں صبح ہی نہائیں۔ تینوں بار یہی عمل دہرائیں۔ اس کے بعد بعد فجر کی نماز 70 بار سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74 پڑھیں 3 ماہ تک۔ پڑھنے کے بعد اچھے رشتے کی دعا کریں۔

شمرین شہزاد..... کینڈا

ج: شہزاد کھلے ہاتھ کے ہیں (میانہ روی اختیار کریں)۔ آپ برکت کے لیے کچھ نہ کچھ اللہ کی راہ میں برکت کا کہہ کر نکالیں روزانہ معمول بنائیں۔

سورۃ الفرقان: الفا جہ ہر نماز کے بعد 11'11 بار پڑھا کریں۔

صنم ناز..... گوجرانوالہ

ج: نوکری کے لیے 41 بار سورۃ لیل (تیسواں پارہ) اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف بعد نماز عشاء دعا کریں۔

ہر نماز کے بعد سورۃ القدر 11 مرتبہ پڑھا کریں ان شاء اللہ تنگدستی ختم ہو جائے گی۔

ناویدہ بانس..... رحیم یار خان

جواب: بعد نماز فجر سورۃ الفرقان 74'70 مرتبہ (اول و آخر) شریف گیارہ گیارہ مرتبہ دعا کریں کہ

جہاں رشتہ بہتر ہو وہاں ہو جائے۔

بعد نماز عشاء تین مرتبہ سورۃ یٰسین (تیسواں پارہ) پھر درود شریف پڑھیں نیت جو رکاوٹ ہے رشتہ میں وہ ختم ہو جائے اور رشتہ ہو جائے۔ ان شاء اللہ آپ کا مسئلہ جلد حل ہو جائے گا وظیفہ میں پابندی لازمی ہے۔

ارم کوثر..... سرگودھا

جواب: والد کے لیے دعا کیا کریں آپ نماز کی پابندی کریں نماز کے بعد "یا قوی" سر پر ہاتھ رکھ کر گیارہ مرتبہ پڑھا کریں ان شاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

شمالہ..... بلدیہ نادون کراچی

جواب: بعد نماز عشاء 313 مرتبہ سورۃ حدید آیت نمبر 9 (اول و آخر) گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھ کر دعا کریں۔ تراویح میل کا حساب ٹھیک آ رہا ہے بہتر ہے استخارہ بھی کر لیں۔ ہر نماز کے بعد سورۃ الاخلاص گیارہ مرتبہ پڑھ کر دعا کریں۔

رضیہ..... فیصل آباد

جواب: وظیفہ صرف نماز کے ساتھ۔ امی کو یسین شریف آیہ انکری آخری تین قل پڑھ کر پانی پر دم کر کے پلائیں اور تیل پر دم کر کے جسم پر ملیں اور پانی دکانوں پر چھڑکوائیں۔

صائمہ..... خانوالہ

جواب: بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ پڑھیں اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف کے ساتھ۔ (دعا یہ کریں کہ جہاں مقدس بہتر ہو وہیں رشتہ ہو۔ سورۃ یٰسین شریف کی آیت نمبر 65'313 بار روزانہ پڑھیں۔ والدہ والد بھائی بہن سب اس رشتہ سے برگشتہ ہو جائیں۔

شائمہ..... حسن ابدال

جواب: بہتر ہے والدہ پڑھ لیں۔ میں دعا کروں گا۔ سکھائی رفیق..... مقام معلوم جو دلچسپ آیت انکری سورۃ الفرقان سورۃ 33 (نکاح) یا مرغاً حسب حیثیت۔ نیت یہ ہو کہ قرضہ اتر

اخلاص۔ سورۃ الناس 41'41 بار پڑھ کر تیل پر دم کر کے اپنی باقی کے سر میں صبح و شام مالش کریں ان شاء اللہ دو ماہ میں آرام ہوگا۔

بشری ملک..... فیصل آباد

جواب: سورۃ الجن ایک بار پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر پورے گھر میں چھڑکیں روزانہ والدہ کی پہلی جھٹکے سے ہی صبح ہو جائے گی۔ ٹولی نہیں ہے اگر ٹولی ہوئی تو سوچن ہوئی۔

جب گھر میں چینی آئے اس پر تین مرتبہ سورۃ المنزل پڑھ کر دم کر دیں اول و آخر تین تین مرتبہ درود شریف پڑھتے وقت تصور کریں کہ دلوں میں محبتیں پیدا ہو رہی ہے۔ لڑائی جھگڑے ختم ہو رہے ہیں۔

نماز کی پابندی کریں عشاء کی نماز کے بعد استغفار تسبیح درود شریف ایک تسبیح تیسرا کلمہ کا معمول بنائیں تمام افراد گھر کے۔ بے برکتی ختم ہو جائے گی ان شاء اللہ۔ غلام قادر..... خانوالہ

جواب: آیہ انکری سورۃ الفلق سورۃ الناس ہر نماز کے بعد گیارہ گیارہ بار پڑھ کر پانی پر پھونک مار کر تینیں۔ رات کو سوتے وقت 41'41 بار پڑھ کر ہاتھوں پر پھونک مار کر پورے جسم پر ملیں۔

نیت: جو کچھ بھی آپ کے ساتھ ہے وہ سب ختم ہو۔ یاسین..... جہلم

جواب: ڈیڑھ پاؤں سرسوں کا تیل اس پر 41 بار سورۃ الفاتحہ مع بسم اللہ کے۔ 41 بار آیہ انکری۔ 41 بار سورۃ الاخلاص۔ 41 بار سورۃ الفلق۔ 41 بار سورۃ الناس پڑھ کر دم کریں اور شوہر کے ناف سے لے کر پاؤں تک پوری اچھی طرح مالش کریں 41 روز۔ ان شاء اللہ فائدہ ہوگا۔

شاپین..... میر پور خاص سندھ

جواب: بعد نماز فجر سورۃ یٰسین اور سورۃ منزل ایک ایک مرتبہ ہمیشہ کا معمول۔ ہر ماہ صدقہ دیں پابندی سے جو دلچسپ آیت انکری سورۃ الفلق سورۃ 33 (نکاح) یا مرغاً حسب حیثیت۔ نیت یہ ہو کہ قرضہ اتر

خوشبو سنجن

عمر اسرار

سال نومبارک

گزرتی آخری دسمبر کی

شب میں

بارہا میں نے تمہیں سوچا

پھر شائستہ ہوئی

کہ بچے سال کی گزری ساعتوں

اور پرانی یادوں کی مانند

تمہیں بھول جاؤں گی

مگر

سال نو میں بھی

پھر وہی یادوں کی برسات ہے

وہی شب و روز اور موسم

بچے سال سے ہیں

اور

آنسوؤں کے دیپ سے

روشن میری آنکھیں

سال نو میں بھی

تمہاری منتظر ہیں

اس دل کے کہن

میرے دل کی ہر دھڑکن

اور خون کی ہر گردش

نئی دعاؤں اور آرزوؤں کے ساتھ

کہہ رہی ہے

تمہیں نیا سال مبارک ہو

ریحانہ سعیدہ..... لاہور

میت

پیار اک فریب ہے جیون کا

مرتبہ سورۃ بقرہ کا پانی دم کر لیا کریں پورا ہفتہ استعمال کیا کریں تین ماہ تک۔ صدق بھی دیں بگرا یا مرغا۔ جواب ان کے شائع نہیں کیے جاتے جن کے کوہن نہیں ہوں (گھر کا کوئی ایک فرد کرے)۔

مس ناز..... کراچی

جواب: رشتوں کے لیے سورۃ الفرقان آیت نمبر 74 مرتبہ بعد نماز فجر اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف۔ جن کے رشتوں کا مسئلہ ہے وہ خود پڑھیں اور دعا بھی کریں۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ سورۃ بقرہ پڑھ کر پانی پر دم کریں وہ پانی ایک مرتبہ پورے گھر میں چھڑکیں اور پورا ہفتہ وہ پانی پینے کے لیے استعمال کریں۔ گھر کے تمام افراد کے استعمال میں آئے۔ آئندہ ہفتہ پھر اسی طرح یہ عمل تین ماہ کرتا ہے اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف۔ (حمام کے علاوہ)۔

منہج

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں اللہ کی صورت مذموم ہوگا۔ ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔ rohanimasail@gmail.com

جائے۔ بے برکتی قسم ہو جائے ان شاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

جب فصل آگائیں ایک ہار لینین شریف پڑھ کر پانی میں پھونک مار کر وہ پانی فصل والی زمین میں چھڑکیں پھر ایک ایک ماہ کے وقفے سے تین بار یہ عمل دہرائیں اللہ مسبب الاسباب ہے۔

جواب نمبر 2: بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74 70 مرتبہ پڑھیں اچھے رشتوں کے لیے دعا کریں رشتہ آجائے تو دیر نہ کریں (اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف۔

لبنی شہزادی..... وزیر آباد سولجیوگر انوالہ جواب: بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74 70 مرتبہ پڑھیں (اول و آخر گیارہ گیارہ مرتبہ درود شریف۔ دعا بھی کریں ان شاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

فجر اور مغرب کی نماز کے بعد 21-21 مرتبہ سورۃ الاخلاص سورۃ اقلق اور سورۃ الناس پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں۔ اگر مونا یا زیادہ ہو تو اس نمبر پر حکیم صاحب سے رابطہ کریں۔

من ر..... سبھرات

جواب: فجر کی نماز کے بعد تین مرتبہ سورۃ لینین ایک مرتبہ سورۃ مزمل و داخلہ کے بعد ایک مرتبہ سورۃ لینین ایک مرتبہ سورۃ مزمل۔ اچھے نمبروں کے کامیابی کے لیے اول و آخر تین مرتبہ درود شریف۔ بعد نماز عشاء تین مرتبہ سورۃ یس بغیر درود شریف کے۔ تصور جو مل ہو وہ قسم ہو جائے (صرف پاکی کی حالت میں)۔ بعد میں ایک

روحانی مسائل کا حل کوہن برائے فردی 2013ء

گھر کا مکمل پتا

نام والدہ کا نام

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں

پھر یار کوئی نہیں تن من کا
تجھ کو پا کر کھوتا دیکھا
کھو کر دل کا رونا دیکھا
بجوردی الفت کے ہاتھوں
دل کے کلڑے ہوتا دیکھا
انتہار دل لگی ہے تیری چلن کا
پھر یار کوئی نہیں تن من کا
پیار اک فریب ہے جیون کا
وعدے قسمیں بھول ہوئے سب
دن رات اپنے دھول ہوئے سب
تہائی کے عالم سے..... یوں
خاک جذبوں کے پھول ہوئے سب
اقرار اک عذاب ہے تیرے سخن کا
پھر یار کوئی نہیں تن من کا
پیار اک فریب جیون کا
اپنے جلوؤں کی چاہت سے
ساعت سے اک اک آہٹ سے
دکشی کے جو صنم ہوئے تم
پھر شب تیرہ ہے امارت سے
انتظار اک سراپ ہے تیرے ملن کا
پھر یار کوئی نہیں تن من کا
پیار اک فریب ہے جیون کا
سید عبداللہ شاہد..... حیدر آباد
غزل

ہر اک غم کو دل میں سموتا رہا
مگر جج الفت کا بوتا رہا
جسے میں نے پھولوں کا تھکا دیا
وہی شخص کاٹنے چھوٹا رہا
وہ آنسو جو شبنم گرانی رہی
وہی عارض مکمل کو دھوتا رہا

ہوا کوئی زخمی کہیں چھت گری
میں بارش میں خود کو بھگوتا رہا
کبھی زخم دل بھرنے پایا جمال
نیا حادثہ روز ہوتا رہا
صبح جمال..... کراچی

خیال مصور

اے حسن فطرت دے اتنا ذوق اختیار مجھے
عیاں ہو حسن ترا عطا ہو ایسا شاہکار مجھے
اس لگن و چاہ میں مری فتوے نہ ہوں کفر کے
یوں ہو کہ سب کہیں ترا ادنیٰ خاکسار مجھے
مادائے عقل ہے احاطہ تری وسعتوں کا
کم مانگی مری کر دیتی ہے بے قرار مجھے
بصارت محدود کا تو ہے ٹھکانہ آس پاس
بصیرت شوق لے چل بخر کے اس پار مجھے
لگاؤ شوق ذوق ترقی ہے کس ہستی چین کو
کن وادوں کہہ روں کا ہے انتظار مجھے
سکوں مل جائے یوں مرے نخل بے تاب کو
گر ہو جائے راز بزم جہاں آشکار مجھے
آتا ہوں کا اندھیرا چھا جائے جب بھی
دل ہو روشن ملے وہ نگینے آب دار مجھے
لبیہ جو نکھر جائے خار دار شاخوں پہ اگر
عین نہیں مطلوب ایسے گل و گلزار مجھے
عصمت اقبال عین..... منگل ڈیم

غزل

دعائے قتل پہ انداز سلف کھینچتا ہے
ایک صحرا سا مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے
اک طرف کھینچتی ہے مجھ کو مری عمر رواں
دوسری سمت مجھے تیغ بکھ کھینچتا ہے
مجھ کو ماں تیری دعا میں نہیں جانے دیتیں
ورنہ اک عمر سے اعداء کا ہدف کھینچتا ہے

تنگی کھینچتی جاتی ہے سمندر کی طرف
اور اک پیاسا سر سینہ صاف کھینچتا ہے
ایک آواز بلاتی ہے تہہ تیغ مجھے
دوسرا جاں سے گزرنے کا شغف کھینچتا ہے
میں غم علی آغا

غزل

پیار چاہت عاشقی رکھتا ہوں میں
اپنے دل میں کیا کی رکھتا ہوں میں
تم جلا کر دیکھ لینا ایک دن
اپنے اندر روشنی رکھتا ہوں میں
فاسلوں کو دیکھ کر ڈرتا نہیں
حوصلہ ابھی دل میں رکھتا ہوں میں
اس بڑے پین کو نہ سمجھو بزدلی
دشمنوں سے دوستی رکھتا ہوں میں
جب بھی چاہا لوٹ کر چاہا مجھے
کب محبت عارضی رکھتا ہوں میں
کل بھی تھی سینے میں منزل کی تڑپ
آج بھی جذبہ دہی رکھتا ہوں میں
بہت جاتا ہوں درپچھ کھول کر
دھیان تیرا ہر گھڑی رکھتا ہوں میں
تو بھی عاطر خوش نصیبی ہے میری
تنگو میں چاشنی رکھتا ہوں میں
رانا حنیف عاطر..... جھڈو

غزل

اترا ہوا کیوں آپ کا چہرہ حضور ہے
آخر بتا کون سا میرا قصور ہے
سینے پہ فرقتوں کا اٹھائے گا بوجھ کون
مانا کہ غم کے بعد مسرت ضرور ہے
ہو جائے مجھ پہ لطف و عنایت کی اک نظر
مغموم آج میرا دل نا چھوڑ ہے

دیکھا ہے صحن دل میں سدا جلوہ گرا سے
ہر چند کہ وہ میری نگاہوں سے دور ہے
پھلی ہوئی ہے روشنی اس کے وجود سے
ان مختصر وہ شخص سراپائے نور ہے
رانا کہو یہ کون سی دنیا کے لوگ ہیں
نام وفا زبان پہ دل میں فتور ہے

غزل

آیا تھا زندگی میں واپس لوٹ کر چلا گیا
وہ بے وفا میرا آشیان گرا کر چلا گیا
کہتا تھا خوشیوں بچ کر خریدوں گا تیرے غم
عمر بھر کا غم میری زندگی کو لگا کر چلا گیا
کبھی جو لکھتا تھا ہواؤں میں میرا نام
اب اپنے دل سے میرا نقش مٹا کر چلا گیا
دونوں کی رونقوں میں بھی جو میرا ہم سفر رہا
صحراؤں کے رستے پہ مجھے لگا کر چلا گیا
لاتا تھا چمن سے چمن کے وہ میرے لیے پھول
اب کانٹے میرے رستے میں بچھا کر چلا گیا
وہ بچ کر میری وفاؤں کو سر عام
غیردوں میں اپنی قیمت بڑھا کر چلا گیا
سوچا تھا اسے سنائیں گے داستان دل مجاہد
وہ میری ہی زندگی کا افسانہ بنا کر چلا گیا
مجاہد ناز عباسی..... سحر پور

غزل

ہم تیری یاد سے خود کو بچا نہ سکے
اور تیری محبت کو چھپا نہ سکے
یہ بھی معلوم تھا تجھے پا نہ سکیں گے
مگر پھر بھی امید کے دیئے بچا نہ سکے
تنگی حسرت بھی کہہ دوں کہ تم جی نہیں سکتے
مگر سامنے تیرے نظریں ہم اٹھا نہ سکے

لاکھ کوشش کی دل نے کہ بھول جاؤں تجھے
مگر اک شام بھی تجھے ہم بھلا نہ سکے
انتخاب عبدالرحمن..... اکبر دؤ، کراچی

غزل

کبھی خوشی نہ ملے اس کو جس نے دل توڑا
میری وفاؤں سے چاہت سے جس نے منہ موڑا
ہمیشہ لاج وفاؤں کی ہم نے رکھی ہے
کسی کا دل ہم نے صنم نہیں توڑا
بڑے غلوں سے اپنا اسے بنایا تھا
بہت فریب سے اس بے وفائے منہ موڑا
تمام عمر کہاں چین پا سکو گے تم.....!
قدم قدم پہ ملے گا وہ جس نے دل توڑا
دکھا کے خواب محبت کا لحد لحد صحاب
کسی بھی کام کا اس نے مجھے نہیں چھوڑا
صلاح الدین صحاب..... راولپنڈی

غزل

چاہتوں کے گھر میں میرا کوئی ہمو نہیں
فریاد لے کر جاؤں کہاں کوئی سنتا نہیں
خود غرض ہیں لوگ بے کار ہیں ان سے دوستی
تیری پلکوں تلے دیپ کوئی جلا نہیں
ملوں میں کس سے تیرے شہر میں اے ہمنشین
وستور ہے انوکھا پچھڑ کے پھر کوئی ملتا نہیں
ہی تو بھی زمانے کے ساتھ غم بھلا کے
پھر خوشی کا لمحہ عمر بھر کوئی رہتا نہیں
میں اکیلا ہوں جانب منزل اے جاوید
ساتھ میرے دو قدم پھر کوئی چلتا نہیں
محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد

غزل

وہ جو دل میں ہے تمہارے
مجھے ایک بار بتا کے دیکھو

دوسروں کی باتوں میں نہ آجائے
مجھے ایک بار آزما کے دیکھو
سچ بات کہو گے اگر تم
اپنی زبان پھر سکنا کے دیکھو
رہبر بن گئے ہو جب رہزن
اپنا وطن پھر بچا کے دیکھو
دیدہ دل کیسے فرش راہ کرتا ہوں
مرے پاس ایک بار آ کے دیکھو
آج کل کے بچے عجیب ہیں
انہیں کوئی بات سمجھا کر دیکھو
جس اندھیرے شہر میں آئے ہیں ہم
اس میں اک چراغ جلا کے دیکھو

دہم اختر..... راولپنڈی
غزل

صاحب ایمان ہے تو دقت کی رفتار دیکھ
بن کے رہنا ہے ہمیں اب صواب کردار دیکھ
دھوپ میں جلنا ہمارا کیوں مقدر ہو گیا
اب نہیں ملتا نہیں ہے سایہ دیوار دیکھ
ساز کی لے پر تھرتا ہے ابھی تیرا بدن
تیرے ہاتھوں میں تو ہوئی چاہیے تلوار دیکھ
تو جو اپنے حال سے واقف نہیں ہے ان دنوں
تم کو ہونا چاہیے تھا واقف اسرار دیکھ
ختم کرتا ہے چمن سے اب خزاؤں کا اثر
تو نے ہی کرنا ہے اب اس کو گل و گلزار دیکھ
پاس تھا تیرے علاج تنگی دامانِ قمر
کیا ہوا کہ ہو گیا ہے خود ہی تو بیمار دیکھ
ریاض حسین قمر..... مشکاڈیم

غزل

دام خوش بو میں گرفتار صبا ہے کب سے
لفظ اظہاری الجھن میں پڑا ہے کب سے

اے کڑی چپ کے در و دام جانے والے
منتظر کوئی سر کوہ ندا ہے کب سے
چاند بھی میری طرح حسن شناسا نکلا
اس کی دیوار پر حیران کھڑا ہے کب سے
بات کرتا ہوں تو لفظوں سے ٹھک آتی ہے
کوئی انفاس کے پردے میں چھپا ہے کب سے
شعبہ بازی آئین احساس نہ پوچھ
حیرت چشم دہی شوخ قبا ہے کب سے
دیکھیے خون کی برسات کہاں ہوئی ہے
شہر پر چھائی ہوئی سرخ گھٹا ہے کب سے
کور چشموں کے لیے آئینہ خانہ معلوم
ورنہ ہر ذرہ تیرا عکس تمنا ہے کب سے
کھوج میں کس کی بھرا شہر ہے لگا واجد
ڈھونڈتی کس کو سر دشت ہوا ہے کب سے

پروفیسر واجد گنگوئی..... ملیر، کراچی

”نیاسال“

گزرتے ہوئے لحات کو بھول کر

نیک تمناؤں کے ساتھ

اس کی اک مثال قائم کریں

آؤ مل جل کر

اک ایچھے سال کا آغاز کریں

(منزلہ باہمی..... جنگ صدر)



ذوقِ آگاہی

عنان احمد

حق تعالیٰ کی فرماں برداری

اے انسان! رات میں روشن چاند اور دن میں دُنيا
کو روشن کرنے والا سورج تیرے آرام کے لیے ہے
بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان تمام کے تمام اپنے
کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ تو روزی حاصل کر سکے
اور غفلت سے نہ کھائے۔

اے انسان! اللہ تعالیٰ تیرے لیے خاک سے
رنگ، خوش بو اور کھانے کی چیزیں پیدا فرماتا ہے
کھس سے شہد، کانٹے سے پھول، نافہ سے مشک،
کان سے مونا اور خشک لکڑی سے بڑے پتے تیرے
لیے پیدا کرتا ہے۔

یہ انصاف کی بات نہیں ہے کہ جس خدا نے ساری
کائنات کو تیرے نفع کے لیے بنایا تو اس کی فرماں
برداری نہ کرے۔

سن! جب آدمی اللہ کے حکم کے مطابق زندگی
گزارتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا محافظ اور مددگار ہو جاتا
ہے۔ (من کمال للہ لے جو اللہ کا ہو گیا اللہ اس کا
ہو جاتا ہے)

مرزا تو صیف بیگ..... حیدرآباد

طاقت

طاقت ایک اندھا انتھار ہے مگر احق کے ہاتھ
میں لیکن دانا شخص طاقت کو حسن خیز اور مساوات کے
لیے استعمال کرتا ہے۔ طاقت بزرگی کی علامت
ہے۔ تم نے اس بزرگ کا قصہ نہیں سنا جو جبروت کے
دیناؤں کی احمقانہ طاقت کا رخ اپنی دانائی اور حکمت
سے بدل دیتا تھا۔ یاد رکھو طاقت بزرگی کے ساتھ عقل
کا تقاضہ کرتی ہے اگر عقل ساتھ نہ ہو تو طاقت جنوں

کی طرف پیش قدمی کرتی ہے اور اگر عقل طاقت کی
پاسبان نہ ہو تو طاقت پائل ہاتھ کی طرح ہے جو
پورے جنگل کو تاراج کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیتا
ہے۔ اس طرح عقل سے عاری شخص ایسا رخ اختیار
کر لیتا ہے جو اس کے ارد گرد تباہی اور بربادی کے سوا
کچھ نہیں رہنے دیتا۔

جبرانیات سے اقتباس
ریاض بیٹ..... حسن ابدال

بدعت

ایک دفعہ بابا بھلے شاہ رحمۃ اللہ علیہ ایک شہر میں
پہنچے۔ قریب ہی ایک مضافاتی علاقہ تھا۔ آپ ایک
درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ ابھی چند لمحے گزرے
ہوں گے کہ ڈھول بجنے کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک
راستے پر انہیں ڈھول اڑتی نظر آئی۔ آپ نے دیکھا
کہ ایک مجمع بڑھا چلا آ رہا ہے ان کے آگے چار آدمی
چل رہے تھے ان چاروں نے ایک خوب صورت
رنگ برنگی چادر اٹھا رکھی تھی۔ چادر کے چاروں کونے
ان چاروں نے تمام رکھے تھے۔ چادر کو عملی ستاروں
اور جھانڈوں سے خوب سجایا گیا تھا۔ ان کے پیچھے کئی
مٹیلے ڈھول کی تال پر ہتھکڑاؤں سے ڈھولے چل رہے
تھے۔ پیچھے مرد و خواتین تالیاں بجاتے ہوئے آ رہے
تھے۔ آپ نے بغور ان سب کا جائزہ لیا اور اپنی جگہ
سے اٹھ کر ان کے راستے میں جا کھڑے ہوئے۔
جب مجمع قریب پہنچا تو انہوں نے دریافت کیا کہ یہ
سب کس خوشی میں ہو رہا ہے۔ ایک آدمی نے کہا۔
جناب سامنے والے مزار میں مدفن ولی کی منت پوری
کرنے جارہے ہیں۔

”کیسی منت؟“ آپ نے وضاحت طلب کی۔
”وہ آدمی بولا۔

”ہمارا ایک آدمی بیمار تھا ہم نے منت مانی تھی
کہ وہ تندرست ہو گیا تو دینی کے مزار کی چادر پوشی

شہزادہ شہزادہ

ناز سلووش ڈی

قلمبر ارمہد لکے ہجر محبت کا قصہ جس سے ہونے والی محبت کا خوش ہو کر وہ میں ان ایسا شہزادہ اور عمار ہجر محبت سے جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ مگر وہ ہجر خود محبت سے مبرور تھا۔
ایسا ایسا ناول جو آپ کو سینوں کا وہ ایسا وادہ میں لے جائے گا جہاں آپ کو محبت کی سوا کچھ مخصوص نہیں ہوگا۔
تمہارے آپ کے حریفان اس لئے والی محبت کا وہ ایسا وادہ کہ محبت حاصل

نہ ان کی رشتوں کا میں ایک ایسا ثابت ہے آپ دونوں یاد رکھیں گے

شام کے سائے تیزی سے اپنے پر پھیلا رہے تھے۔ سورج کی تپش ماند پڑتی جا رہی تھی۔ ماحول ابتر ہو رہا تھا۔ ابتر سے مراد بہت کچھ ہے لاہور جیسے گنجان آباد شہر میں ابتر سے مراد بہت کچھ لیا جاسکتا ہے۔ بارشوں کی کمی کی وجہ سے ماحول جس زدہ سا تھا۔

گرد کے طوفان سرد پہراند آتے ہیں اور شام کے ہوتے ہی وداقی کناروں پر دھند کا سا لگان ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ میں اس وقت کمین آباد میں مقیم ہوں مگر میوہیل کارپوریشن کی نااہلی کا شکار ہوں۔ اس پر بھی لوگ خفا ہیں کہ لاہور بیمار یوں کی آماجگاہ ہے۔ خیر اس چیز کا میری داستان سے قطعاً کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ سو ذکر فضول ہے۔

میں بات کر رہی تھی ڈوبتے سورج کی یاد دہرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں اپنی داستان سنانے کے لئے تمہید باندھ رہی ہوں۔

افق پر پھیلی لائی گھروں کو لوٹتے پرندوں کی قطاریں آندھی چکاوڑوں کے غول جو زن سے میرے سر پر سے گزر کر گئے ہیں۔ یہ سب شام کے منظر کو پر کیف بنا رہے ہیں۔ ہاں میں بھی کسی قدر ان سے لطف اندوز ہو رہی ہوں۔ شاید اس لیے کہ یہ منظر

داور بھائی اور دو بی کو بہت پسند تھا۔ روٹی کا تعارف بھی اس شخص کے الفاظ و خیالات جو زندگی بھر اس دن

سے لڑتا رہا ہو کہ آیا اس نے محبت کی بھی تھی یا محض وقت گزاری تھی وہ۔ (میں یہاں داور بھائی کی بات کر رہی ہوں) تجا نے اس جذبے کو وہم کہنا درست بھی ہوگا یا نہیں۔

میں تو گزرے ۵۰-۶۰ سالوں میں اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکی۔ کیونکہ نہ وہ کروار رہے نہ وہ حالات شاید آپ کے۔ پہلے کچھ پڑ جائے۔ یا شاید اس داستان کو لکھنے کے بعد میں بھی کچھ فیصلہ کر پاؤں۔

میرا خیال ہے میں آج کھل کر وہ سب بیان کر دوں جو میرے دل میں اور اندر رکھی لکڑی کی بوسیدہ الماری میں ہے۔ اس بوسیدہ الماری میں کہ جس میں سوکھے رنگوں کے ڈبے آئندہ آئیں اور تاریخوں کے تیل سے آدھ بھری چٹکی بوتلیں کچھ سوکھے کچھ نئے برش اذھری لاقعدا تصویریں۔ اسناد تحائف قلم کیے ٹوس گولڈ میڈلز اور اسی طرح کی بے شمار چیزیں جو کبھی داور بھائی کے استعمال میں رہی تھیں۔ اس بوسیدہ الماری کا ایک خانہ صرف خطوط سے بھرا پڑا ہے۔

لے..... طویل..... انتہائی طویل خط..... جن کو پڑھتے پڑھتے داور بھائی کی رات بیت جاتی تھی۔ اس وقت کا مہنگا ترین قلم جس کی نوک آگے سے مخصوص انداز میں ترشی ہوتی تھی۔ نیلی روشنائی اور عمدہ سفید کاغذ پر لکھے خطوط جواب وقت کے ہاتھوں زروئی نائل ہو چکے ہیں۔

لفظ لفظ موتی "حرف حرف تمہیں....." سچ مایے یوں کہ جسے دیا سے بے پروا ہو کر انتہائی محنت سے رقم کیے گئے ہوں۔

اف خدا میں بھی کن باتوں میں پڑ گئی۔ اصل داستان کہیں تم نہ ہو جائے۔ سچ میں دل بھر بھرا رہا ہے۔ میں کہنا چاہتی ہوں آج دل کی گہرائیوں سے ان تھنوں کو آنکھ لگنا چاہتی ہوں جو یہاں کی دھول

تھے جسے جا رہے ہیں۔ فقط اس لیے کہ کوئی ملال باقی نہ رہے۔ ملزم اور مظلوم کا فیصلہ ہو جائے۔

سورج ڈوبنے سے پہلے میں اس داستان کا آغاز کر دینا چاہتی ہوں تاکہ انجام بھی جلد ہو جائے۔

یہ آج سے برسوں قبل کی بات ہے۔ زمانے کی گروتے آئی سالوں قبل 1955ء کی۔ جب بھائی جان نے نیا نیا جوانی کی دلیز میں قدم کر رکھا تھا۔ ہم چار بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ تین بڑی بہنیں اور دو بڑے بھائی اپنا اپنا گھر سا چکے تھے۔ پھر داور بھائی تھے پھر

میں اور آخر میں عمر عزیز۔ داور بھائی ہم سب بہن بھائیوں سے زیادہ خوبصورت تھے۔ بالکل خواہوں کے شہزادے جیسے۔ کسرتی بدن شہابی رنگ۔ شہد رنگ آنکھیں اور ان سب سے بڑھ کر ان کے خوبصورت لمبے ہاتھ تھے۔ گورے چنے غرولی ہاتھ یہ سب داور بھائی کی شخصیت کا خاصہ تھے۔ پورے خاندان میں فقط ان کے پتلے اور لمبے ہاتھ تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے میرے دادا کہا کرتے تھے کہ ہادی پتر! ایسی انگلیاں میں لوگوں کی ہوتی ہیں۔

"سرجن کی اراکری کا یا پھر پیٹرن کی.....! ہاں تو ان میں سے کیا ہے؟"

تو داور بھائی جھٹ سے کہہ دیتے کہ "داکی! میں پیٹرن ہوں گا۔ مصوری کروں گا۔ دنیا کی خوبصورتی کو رنگوں میں قید کر دوں گا۔ چاند تاروں کو زمین پر اتار لاؤں گا اور کہکشاؤں کو اپنے گینوں پر بکسیر دوں گا۔"

یہ سب باتیں ہی نہیں تھیں انہوں نے یہ سب کر دکھایا تھا۔ انہوں نے رنگوں کو اپنے پوروں پر اس طرح سجایا تھا کہ کوئی بھی رنگ ان کی مرضی کے بغیر اپنا اثر چھوڑنا ہی نہ تھا۔

یہ پاکستان بننے کے ۸ سال بعد کی بات تھی۔ جس وقت پاکستان معرض وجود میں آیا بھائی

جان فقط ۱۰ سال کے اور میں ۵ سال کی تھی۔ یادداشت میں کچھ باتیں باقی ہیں۔ ہم لاہور کے ہی رہائشی تھے۔ اس قربانی میں تو شامل نہ ہو سکے جو پاک افلاکی سرحدوں پر دی گئی ابدیت لٹ کر آئے والوں کو ہم نے اپنے دلوں میں جگہ دی تھی۔

بلیں بچھادی تھیں ان کی راہ میں۔ اپنی بساط سے بڑھ چڑھ کر ہر ایک نے ان کی مدد کی تھی۔ مجھے یاد ہے اپنے حصے کا ناشتہ ہم مہاجر کیمپ میں روتے ٹپکتے بچوں کو دے آتے تھے۔ اس وقت ہمارا آبائی گھر مزنگ روڈ پر واقع تھا۔ اور گرد کے علاقوں میں صنم آدکیز اور چوہدری شال تھے۔

ہم نے خود ایک ذہنی خاندان کو گھر میں پناہ دی تھی۔ ان کا میری عمر کا ایک لڑکا تھا جسے پیٹ میں ایک ظالم سکھ کی کرپان لگی تھی۔ استریاں باہر کو ابھی بڑی تھیں۔ حکیم اور دوا دارو دارو۔ جنرل ہسپتال قریب تھا۔ سوادھر ہی وائل کروادیا گیا۔ بس وہ غریب اذیت میں رہا اور آخر کار موت کے گلے لگ کر سکون سے سو گیا۔

بھائی اس وقت پرائمری کے طالب علم تھے۔ ایک دو سال یونیویرسٹی کی خرابی کی نذر ہو گئے اور وہ اسکول نہ جاسکے۔ کرتے کرتے انہوں نے ۱۶ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اردو کے ساتھ ساتھ انہیں انگریزی اور فارسی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ ان کا دل حسین اور روح حسن کی دلدادہ تھی۔ جب کبھی قریبی پارک میں جاتے فرہمت اور قدرتی ماحول ان کے ذہن کو ان کا نہ رہنے دیتا۔ روح معطر ہو جاتی اور قہری رو بہک جاتی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ کوئی نہ کوئی شعر یا نظم لکھ ڈالتے۔

جب مجھے اس بات کا بتاتے تو میری ہنسی نکل جاتی۔ چٹکی، لمبی انگلیوں کے مالک داور بھائی (جن کو

داوایا سے ہادی کہتے تھے) مصور بننے کے بجائے شاعر بن گئے تھے۔ شاعر بھی وہ جس کی کوئی نازک اندام مجبور بھی ہی نہیں۔

میں اکثر دیکھا کرتی تھی کہ بھائی کے اندر ایک تحریک اٹھا کرتی تھی کہ ان لکھی نظموں میں رنگ بھریں۔ لفظ لفظ رنگوں کا حجاج کر دیں۔ ہر مصرع کو کیوں کی دنیا میں قید کر لیں مگر باوجود چاہت کے وہ ایسا نہ کر پاتے۔

اپنی بے بسی پر کڑھتے۔ داجی سے اس بات کا تذکرہ چھڑا تو انہوں نے مشورہ دے ڈالا۔

”ہادی پترا تو میری مان N.C.A میں داخلہ لے لے۔“

داجی نے ٹھیک کہا تھا۔ NCA میں داخلہ لے کر وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو اجاگر کر سکتے تھے۔ فن کا مادہ تو ان میں تھا۔ ذرا سی پاش ان کے خیالات کو عملی جامہ پہنا سکتی تھی۔ وہ اپنی سوچوں کو رنگوں میں ڈبو سکتے تھے۔

کچھ دن بچانے انہوں نے کس سوچ میں گزار دیے۔

پھر ایک دن انہوں نے عمر عزیز کو اپنے ساتھ لیا اور NCA کے ایڈمنسٹریشن آفس تک پہنچ گئے اور یہ جان کر انہیں انتہائی کوفت ہوئی کہ داخلے کی تاریخ گزر چکی ہے۔

داجی کے کہنے پر انہوں نے اگلے سال کے انتظار میں وقت گزارنے کے بجائے ایک خطاط سے رابطہ کیا اور خطاطی (کیلی گرافی) سیکھنے لگے۔

ذہن آزاد تھا نہ کوئی مجبور بھی نہ آج کے دور جیسی گرل فرینڈ۔ سو بہت کم عرصے میں انہوں نے خطاطی کی تمام طرز پر عبور حاصل کر لیا۔

خطاط رشید صاحب کی چوہدری کے پاس چھوٹی سی دکان تھی۔ خام ویٹرز اور خطاط کی نسبت بہت عمدہ شخصیت کے حامل تھے وہ۔ ماحول بھی دیرا ہی خوشگوار اور نفس سنا تھا۔

یہ بہار کے دنوں کی بات ہے۔ مجھے بہت شدت سے بھائی جان کا انتظار تھا۔ ایک تو گھر میں مجھے ویسے ہی ان کا سب سے زیادہ انتظار ہوتا تھا۔ دوسرا آج ان کی ایک انانت میرے پاس تھی۔ سو میں بڑی بے تابی سے ان کی راہ تک رہی تھی۔ مغرب سے عشاء کا وقت تھا کہ جب وہ گھر میں داخل ہوئے۔ میں سیز حیوں پر کھڑی تھی۔ اشارے سے ان کو چپ رہنے کا کہا اور چھت پر لے آئی۔

وہ محسوس میں ڈوبے چھت پر پہنچے تو میں نے جھٹ سے ایک گلابی رنگ کا لفافہ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ انہوں نے حیرت سے خوشبوؤں سے معطر اس گلابی لفافے کو دیکھا۔

ان کا رد عمل بجا تھا۔ کیونکہ نہ تو ہمارے بڑوں میں کوئی لڑکی رہتی تھی نہ ان کا کہیں عشق و عاشقی کا کوئی چکر تھا کہ گھر بیٹھتے ہی ان کا ایک عدد خط سے واسطہ پڑتا۔ سو حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔

”مجھے نہیں پتا وہ آئی تھی۔ یہ وہ کر چکی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ ہادی صاحب کو دے دینا۔“ میں نے ڈر سے ڈرے لہجے میں بتایا تو ان کی ہنسی نکل گئی۔

”اگر یہ وہ دے کر گئی ہے تو اس ”وہ“ کا کوئی نام بھی تو ہوگا۔ نام پوچھا بھی تھا کہ نہیں؟“

”روبی۔۔۔۔۔ روبینہ نام ہے اس کا۔ میرے ساتھ پڑھتی ہے۔“

انہوں نے ایک نظر مجھے دیکھا شاید اس طرح وہ روبی کی عمر کا اندازہ لگانا چاہ رہے تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تو وہ کوئی جواب دینے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے اور خط کھول کر دیکھنے لگے۔ پڑھا تو شاید انہوں نے بہت بعد میں تھا لیکن گھنٹہ بھر اسے نکتے رہے تھے۔

وہ کہتے تھے کہ ”میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں کس طرح اس خط کی خوبصورتی کو بیان کر دوں۔ معطر لفافہ کسی مصنوعی خوشبو سے نہیں بلکہ اندر پڑی موتی کی کلیوں سے مہک رہا تھا۔ اندر ایک سفید اچھے معیار کا کاغذ نفاست سے تھپکا ہوا پڑا تھا۔ جب میں نے اسے کھولا تو لگا جیسے موتیوں کی ایک لڑی تھی جو کاغذ پر بکھر گئی۔ حرف حرف موتی، لفظ لفظ نفاست لیے ہوئے۔ مجھے شدید حیرت ہوئی۔

ایک کم سن لڑکی کے ہاتھ میں اتنی نفاست دیکھ کر مجھے شرم بھی آئی۔ کہنے کو اب میں بھی خطاط بن گیا تھا مگر میرے ہاتھ میں اتنی نفاست نہیں آئی تھی۔ چند لائنیں مجھ پر غصہ کی تھیں۔

یہ بھائی جان کے الفاظ تھے۔ وہ خط واقعی بہت مختصر سا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد اگلے بیس سال تک روبی نے جتنے بھی خط لکھے تھے وہ ایک کہانی سے کم برگر نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے کچھ خط ابھی میرے پاس موجود ہیں۔ کچھ حوادث کی نذر ہو گئے۔ بہر حال پہلا خط ان الفاظ پر مشتمل تھا۔

12/3/1956

اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور میری دعاؤں کے زیر اثر ہمیشہ خوش و خرم رہیں۔

تسلیمات!

اگرچہ ناچیز کی نوک قلم اس قابل نہیں کہ کچھ عرض کر سکے بس چند الفاظ ہیں وہ بھی بحالت مجبوری رقم کر رہی ہوں کہ کہیں آپ کو ناگوار نہ گزریریں۔

آپ کی ذات ایک ہیرو اپنے دعا ہے کہ اس ہیرے

لوگوں کی ماہر آ کر تراش دے تاکہ تمام ہنر نکھر جائیں۔
 فقط آپ کی پرستار.....!.....
 عجیب سا خط تھا..... نہ حال احوال پوچھا گیا تھا نہ
 دل کا حال بتایا گیا تھا۔ فن کی ولدادہ تھی، سونے کی
 تعریف کروئی تھی، بہت عجیب انداز میں۔
 میں بھائی جان کی بہن ہی نہیں ان کی دوست بھی
 تھی۔ بڑی بے تکلفی تھی ہمارے درمیان۔ روٹی کے
 آنے کے بعد میں ان کی رازدار بھی بن گئی تھی۔ میں
 جانتی تھی بھائی جان (جنہیں ہم سبھی ہاوا بھائی تو بھی
 داور بھائی کہتے تھے۔ بڑی نفیس طبیعت کے مالک
 تھے۔ مزاج یوں کہ جیسے روٹی کا کوئی گلاب ہو۔ اسی لیے
 جب انہوں نے خط بڑھا تو ان کے چہرے پر شرارت یا
 غصے کے بجائے شگفتگی سی تھی۔ یوں کہہ لیں کہ بھائی
 جان کی زندگی میں آنے والی کسی لڑکی کا یہ پہلا خط تھا جو
 اس کی عمر کی نسبت کافی پختگی لیے ہوئے تھا۔
 انہوں نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ نہ مجھ
 سے روٹی نے جواب کا مطالبہ کیا اور یوں ایک دو ماہ
 کے بعد میں اور بھائی جان اس خط کو بھول بھی گئے۔
 برقی بھولی تھی تو روٹی نہیں بھولی تھی۔ وہ اندر ہی
 اندر لا شعوری طور پر جواب کی منتظر تھی، مگر دل کی بات
 لبوں تک لاتے اس کا جواب مانع آتا۔
 آہ! بہت عجیب تھی وہ بھی۔ نجائے صبر کی کس مٹی
 سے اس کا خمیر اٹھا تھا۔ جان پر ہر دکھ سہہ لیا مگر زبان
 سے اف نیک نہ نکالی۔ ہماری طرح روٹی لاہور کی
 رہائی نہیں تھی۔ بلکہ انڈیا سے ہجرت کر کے پاکستان
 آئی تھی۔ وہ دلی کے ایک بہت بڑے نواب کی بیٹی
 تھی۔ طبیعت میں سادگی تھی ادب سے لگاؤ تھا فن
 اور فنکار کی پہچان اسے ورثے میں ملی تھی۔ وہ نواب
 حشمت علی خان کی ساتویں صاحبزادی تھی۔ بھائی
 کوئی نہ تھا۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے باپ کی محبت
 کے زیادہ قریب بھی تھی۔ شریف خاندان کی اولاد تھی
 شرافت رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھی۔
 پاکستان ہجرت کر کے آنے والوں کی طرح وہ
 بھی اپنے ساتھ کہانیوں کا ایک انبار سمیٹ کر لائی
 تھی۔ ہر مہاجر کی کہانی کے کردار الگ تھے مگر داستان
 ایک تھی۔
 ہندوستان کا بٹوارہ..... مسلمانوں پر ظلم و ستم.....
 ہندو نہ تعصب کا شکار مسلمان..... سکھ نفرت سے
 بھرے دل لیے۔
 کرپانوں سے کٹتے بدن.....
 سر بازار عزت سے محروم ہونے جسم..... کنوؤں
 اور بادلوں..... میں تیرتی لائیں..... جلے مکانوں
 میں راکھ ہوتے خاندان..... ہوس کے پھار یوں کے
 ہاتھوں بھینٹ چڑھتی لڑکیاں..... اور جو اس مرحلے
 سے گزر گئے..... وہ ٹرین کے حادثوں کے شکار
 ہوتے گئے۔
 پاکستان بٹ گیا جو لوگ قیامت معرٹی سے گزر
 کر مرحد پار آ گئے وہ مہاجر کہلائے گئے۔ کوئی تیر بوا
 تو کوئی مسکین..... کوئی نواب سے فقیر ہوا تو کسی کے سر پر
 اینٹوں کا سائبان تک نہ رہا۔ دولت کے اتار تو وہاں
 سے کیا لاتے لوگ اپنی ہی ذات کو بڑی مشکلوں
 سے بھینٹے کھاتے مہاجر کمپ پیٹتے تھے۔
 سرزمین وطن کو پھر ویسے جدے نصیب نہ ہوئے
 ہوں گے کئے اعضاء دے لے جدے.....
 خون سے نہائے جسموں کے لرزتے کانپتے
 جدے.....
 نومو لوگوں کے سسکتے بلکتے جدے..... ہر طرف
 جدے.....!
 شور و غوغا سے لبریز سفر کی مٹی تیلے دے جدے
 کوئی نہ تھا۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے باپ کی محبت

انہی بچوں میں ایک سجدہ اس ۵ سالہ روہینہ کا تھا
 جو اس وطن پر آباد ہونے کے لیے اپنے چچیس
 عزیزوں کی لاشوں کو ناپ کر آئی تھی۔ چچیس گردنیں
 سرحد کی بھینٹ چڑھا کر اسے یہ سجدہ شکر نصیب ہوا
 تھا۔
 خالی ہاتھ..... جسم پر فقط دو دھجیاں لینے وہ اپنے
 ہی جیسی ایک معمر خاتون کے ساتھ مہاجر کمپ میں
 شامل ہوئی تھی۔ دلی کے نواب کی بیٹی کہ جو بھی
 پھولوں کے بستر پر سوئی تھی آج اس کا بچھونا سخت
 زمین تھی۔
 وہ کچھ ہی دن کمپ میں رہی تھی معمر خاتون اپنے
 ساتھ اپنی جائیداد کے کاغذات لے آئی تھیں سو جلد
 ہی انہیں چو پرچی میں ایک دو منزلہ مکان کلیم میں مل
 گیا۔
 چند دن مزید گزرے تو معمر خاتون کے چچسٹے
 بچے بھی ان سے آن لے۔ روہینہ کو انہوں نے اپنی
 بہن مان لیا اور یوں یہ چھوٹا سا خاندان اس دو منزلہ
 مکان کے نچلے حصے میں مقیم ہو گیا۔
 اوپر کا حصہ سال تک بند رہا بعد میں اسے بھی
 کمرائے پر چڑھا دیا گیا گر نجائے کیوں ادھر کوئی
 کرائے دار نہ پاوہ عرصہ تک نہ تھا۔
 پاکستان جب دو برس کا ہوا تو میں اس وقت
 سات برس کی تھی۔ ابو جان نے مجھے گورنمنٹ کیری
 ہینس اسکول میں داخل کرادیا۔ اتفاق سے جس دن
 میرا پہلا دن تھا روٹی کا بھی پہلا دن تھا۔ اور یوں
 ہماری دوستی پروان چڑھی۔
 کچھ دن اور آگے سر کے تھے تو بھائی جان
 نے NCA میں دوبارہ لپٹائی کیا اور یوں انہیں داخلہ مل
 گیا۔ کالج کے بعد وہ اپنا بقیہ وقت خطاطی کو دے دیتے
 تھے اس سے جو آمدنی ہوتی وہ اپنے تعلیمی اخراجات پر
 لگا دیتے۔
 ایک روز میں اور بھائی جان محن میں بیٹھے کچے
 کھیل رہے تھے کہ روٹی کا ذکر چھڑ گیا۔
 ”تمہاری دوست کیسی ہے؟“
 ”کون سی بھلا؟ میری تو بہت سی دوستیں ہیں؟“
 ”بھائی جان نے سر کھمایا۔“ ”روٹی“
 ”وہ..... ہاں ٹھیک ہے..... خیریت؟“
 ”آں خیریت ہے اس کا خط آیا تھا نا۔ ادھورا
 سا تھا۔ نہ حال احوال نہ تعارف..... بس مجھے میرے
 کی مثل کہہ کر بھاگ گئی۔“ بھائی جان ہنسے۔
 ”پیغام دے دوں پھر آپ کا؟“ میں نے
 شرارت سے پوچھا۔
 ”کیسا پیغام؟“ وہ چونکے۔
 ”یہی کہ حال احوال بھی پوچھ لے اور تعارف بھی
 دے دے۔“ بھائی جان نے ایک کچا اٹھا کر میرے
 سر پر مارا۔
 ”چلو بھگواوہر سے بہت تیز ہوتی جا رہی ہو۔“
 اور میں ہنستے ہوئے بھاگ آئی۔
 اگلے دن سارا قصہ جب روٹی کو سنایا تو انہیں اس
 کی آنکھوں میں زندگی کی جوت جگ گئی۔ بڑے
 دلغریب انداز میں وہ مسکرائی اور دو دن بعد ویسا ہی
 گلابی لٹافہ چیکے سے میرے پیگ میں ڈال دیا۔
 شام کو بھائی جان مجھے پڑھانے بیٹھے تو میرا ایک
 کھولے ہوئے چونکے۔ معطر گلابی لٹافے نے ان
 کے خون کی گردش تیز کر دی تھی۔ میں نے ان کی
 نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو لٹافہ نکال کر ان کے
 ہاتھ پر رکھ دیا۔ انہوں نے خاموشی سے کیوں سے بھرا
 خط کھولا۔

9/8/56



انہوں نے اپنی ایک نظم منتخب کی جو کہ شاعری کے وزن، تلفظ اور الفاظ کے چناؤ اور درجہ میں غالب اور میر کو بھی مات دیتی تھی۔ ساتھ میں روٹی کی بھی ایک نظم کی جوان کی نظم کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ 30x60 کا کیونٹس لکرا انہوں نے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ بھائی چارکول کا استعمال بہت اچھا کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ سب کی طرح رنگوں کو استعمال کریں گے مگر انہوں نے سب کے برعکس چارکول نیم کا کوئٹہ B3, B2, HB پینسلز کا استعمال کیا تھا۔

کیونٹس کے آدھے حصے میں انہوں نے اپنی نظم کی منظر کشی کی اور آدھے حصے میں روٹی کی نظم کی اور دونوں نظمیں لکھ دیں۔

آرٹ کی دوسرے کتبے ہیں کہ ایک پینسل سے کم از کم 100 ٹونز نکلتی ہیں۔ بھائی جان نے واقعی وہ 100 ٹونز نکال لی تھیں۔ اپنے حصے کو انہوں نے Negative اور روٹی کے حصے کو انہوں نے Positive رکھا تھا۔ انہوں نے پورا مہینہ اس پر محنت کی تھی۔ راتوں کو جاگے تھے۔ مجھے یاد ہے جس دن انہوں نے اسے کالج میں سمٹ کر رکھا تھا اس سے ایک دن قبل ہی وہ اسے مکمل کر پائے تھے۔ چارکول سے کام بہت مشکل ہوتا ہے۔ ذرا سا ہاتھ پاپائی کے چھینٹے پڑیں پوری پینٹنگ کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔

جس دن بہترین پینٹنگ کا انتخاب ہونا تھا وہ رات روٹی نے جاگ کر دعائیں مانگ مانگ کر گزار دی تھی اور بھائی جان مزے سے سوئے تھے۔ کیونکہ انہیں یقین تھا کہ بہترین مصور میں انہی کا انتخاب ہوگا۔

اور ہوا انہی کی وہ اول نمبر پر آئے۔ اس دن وہ خوش تھے بے تحاشا خوش کالج کے اندر ہی ان کی

کے ہاتھ لگ گئے۔ اس نے شاعری کی تعریف کی اور مجھ سے پڑھنے کو مانگے۔ شاید بعد میں اس نے ان کو نقل کر لیا ہو۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ آپ کو یہ سب اتنا برا لگے گا ورنہ میں اسے بتاتی ہی نہیں۔

بات کرتے کرتے میرے گلے میں آنسوؤں کا ایک گولہ سا انگ گیا۔ انہوں نے مجھے جیب کرا کر نیچے بھیجا اور کاغذوں کے اس پلندے میں کھو گئے۔

ان کے لیے حیرت کا باعث ان کی اپنی شاعری نہیں بلکہ وہ شاعری تھی جو جواب میں لکھی گئی تھی۔

گویا شکوہ اور جواب شکوہ والا معاملہ تھا۔ یوں کہ جیسے شاعرانہ انداز میں مکالمہ ہو رہا ہو۔

بھائی بڑے گلے تھے۔ اس سمندر کی مانند جس میں طوفان تو برپا تھا مگر ساحل پر سکون تھا۔

پر یہ سلسلہ چل نکلا اور حیرت انگیز طور پر ان کے اندر ایک تبدیلی آ گئی۔ اب انہیں روٹی کے خطوط کا انتظار رہنے لگا۔ حالانکہ انہوں نے اب تک کوئی خط جواب کے طور پر نہیں لکھا تھا۔ مگر ان کی شاعری پینٹنگز اور میں..... پاگل روٹی کے لیے ان کے جذبات کے اظہار کے سبب دیکھتے بہت تھے۔

یہ 1958ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ بھائی جان اپنی پڑھائی کے دوسرے درجے میں تھے کہ ان کے کالج والوں نے خلیفانی ہسٹریکال مقابلہ منعقد کر لیا۔ جو بھی اسٹوڈنٹ اس میں شامل تھا ان کو ایک ماہ قبل ہی بتا دیا گیا تھا کہ مقابلے کی نوعیت کیا ہوگی۔ تنہم کی بھی پابندی نہیں تھی۔ بس اس پینٹنگ کو زیادہ تر بن دی جاتی تھی جس میں لاشعور کو استعمال کر کے خیال کی اثر ان کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہو۔ حد بس اتنی تھی کہ کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہو۔ اس مقابلے نے برسوں بعد انہیں اپنے خیالات کو رنگوں میں ڈھالنے کا موقع دیا تھا۔ وہ خوش تھے۔ بہت خوش۔

تھا۔ روٹی نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ میں سرک پار کر کے اس کے پاس گئی تو ایک گلابی پھولا ہوا لفافہ اس نے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور بنا کچھ کہے واپس چل دی۔

واپسی پر وہی لفافہ میں نے عمر عزیز سے نگاہ بجا کر بھائی جان کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ اس لفافے کو دیکھ کر انہیں چند ماہ قبل والا گلابی لفافہ یاد آ گیا۔ چہرہ مسکرا اٹھا پھر بھی مردت میں پوچھ دی لیا۔

”اب یہ کس نے دیا ہے؟“

میں نے جاسوسانہ نگاہ عمر عزیز پر ڈالی اور نہایت دھیمے لہجے میں کہا۔ ”اسی نے۔“

میرے انداز پر وہ مسکرا دیئے۔

گھر واپسی تک رات ہو چکی تھی۔ دوسرا تھکن بھی بہت تھی۔ اس لیے لفافہ پس نظر چلا گیا۔ اگلے دن میں ناشتے کے کر بھائی جان کے کمرے میں گئی تو انہوں نے میری موجودگی میں اسے چاک کیا اندر دبی مویسے کی کلیاں اور کاغذوں کا ایک پلندہ۔

کھول کر دیکھا تو انہیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ تجسس میرے اندر بھی تھا۔ پوچھا۔ ”کیا ہے بھائی؟“

”بے بی بی..... یہ کس نے لکھا ہے؟“

”بھائی اسی روٹی نے دیا ہے۔“

میری بات پر وہ جھلائے۔

”پاگل وہ تو مجھے بھی پتا ہے میری شاعری اس تک کیسے پہنچی؟“ ان کی بات سن کر میں چوری بن گئی۔

خاموشی کا ایک لمبا پھر گزرا۔

”بھائی آپ کے کمرے کی صفائی کے دوران اکثر کاغذوں کے ٹکڑے ہاتھ لگتے ہیں۔ جن پر کچھ نہ کچھ اشعار لکھے ہوتے ہیں اور آپ کا نام بھی۔ میں وہ جمع کرتی رہتی ہوں۔ بس کچھ دن قبل وہ کاغذ روٹی

پینٹنگ پر بولیاں لگائی جائے گی۔ حالانکہ یہ سب ایگزیشن والے دن ہوتا تھا۔ مگر فن کے والدہ اچھی چیز کو پہلے ہی اڑانا چاہتے تھے۔ بھائی راتوں رات شہرت کی بلند یوں کو چھوٹے چارے تھے۔ کالج میں ہر جگہ ان کی واہ واہ ہونے لگی تھی۔ گھر میں سب سے زیادہ خوش داجی تھے۔ بھائی کی اس محنت میں داجی کا بہت ہاتھ تھا۔

مگر پھر ہوا کچھ یوں کہ آسمان پر پہنچا کر ان کے نیچے سے بیڑھی بھٹی گئی۔ ساری شہرت و دولت کے ہوائی قلعے زمین ہوں ہو گئے۔

بھائی جان مضطرب مضطرب سے رہنے لگے۔ کھانا پیٹا چھوڑ دیا۔ زندگی میں پہلی بار بھائی جان نے شراب پی اور بے تحاشا شراب پی۔ گھر والوں کے سامنے نہیں بس میری گود میں وہ سر رکھ کر روئے اور بہت روئے۔ مجھے بھی دلایا، مگر بولے کچھ نہیں۔ ساری رات وہ کبھی روتے کبھی ہستے، کبھی اٹھ کر اپنے آرٹ کے سامان کو ٹھوکریں مارنے لگتے۔ پر بتاتے کچھ نہیں تھے۔ ان کی یہ حالت ایگزیشن والے دن سے تھی۔ وہ ہمیں کہہ کر گئے تھے کہ ایک گھنٹے بعد آ کر ہم سب کو بھی لے جائیں گے مگر وہ نہ آئے پھر جب آئے تو بہت بری حالت میں تھے۔ ہم سارا دن منتظر رہے ایک داجی ہی تھے جو سارا دن صبح پڑھتے رہے اور دروازے پر چھوٹکتے رہے۔ آدھی رات کو وہ گھر داخل ہوئے تھے۔ ایک ہفتہ فقط روئے کے انہوں نے کچھ نہ کیا تھا۔ میں سارا سارا دن ان کی پیٹی سے لگ کر بیٹھی رہتی۔ بخار نے ان کے وجود کو آن لیا۔ مگر انہوں نے زبان نہیں کھولی۔

روٹی کو پتا چلا تو وہ بھی آ گئی۔ بھائی ہوش میں ہوتے تو خوشی سے کھل اٹھتے۔ مگر وہ حواس میں تھے

ہی کب..... روٹی آئی ان کی پیٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ روٹی رہی۔ رو کر رہی رہی۔ صدقے اتار رہی۔ مگر بھائی صاحب نہ اٹھے۔

اگلے دن انہیں ہوش آیا تو میں نے روٹی کا بتایا۔ ان کی شہد رنگ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ”بے بی بھئی اس دن کا بہت انتظار تھا۔ مگر دیکھو تو سوچا کیا اور ہو کیا گیا۔“

وہ خود میں کھوئے کھوئے سے تھے۔ میں کچھ نہ بولی۔ بس ان کے بالوں کو سہلاتی رہی۔

وہ خاموشی سے ایزل پر لگے خالی کیڑوں کو دیکھتے رہے۔ پھر جو بولے تو ان کی بات سن کر میرا بھی دل کٹ کر رہ گیا۔

”بے بی میں نے ایک مہینہ اس پر محنت کی تھی۔ خون سے میٹھا تھا میں نے اسے۔ بہترین مصور بھی میں بنا۔ پر دیکھو تو عین وقت پر میرے ساتھ کیا ظلم ہوا۔ بولی میں میری پینٹنگ پندرہ ہزار میں تھی۔ (اس وقت کے پندرہ ہزار آج کے لاکھوں بنتے تھے) پر رقم مجھے ایگزیشن کے بعد ملنی تھی۔ مگر جانتی ہو کیا ہوا؟ جب صبح میں ایگزیشن کی لوپنگ میں گیا تو ادھر ساری تصاویر موجود تھیں سوائے میری کے۔ میں نے پوری آرٹ گیلری جھان ماری مگر وہ نہ ملی۔ جب گیلری کے اندر سے پوچھا تو اس نے عام سے لہجے میں کہا کہ ”ہاں ایک پینٹنگ تم ہو گی کالج والوں سے۔“ ایک پینٹنگ مالی فٹ! بے بی وہ میرے خواب تھے فقط ایک کیڑوں پر پھیلے نقش و نگار نہیں۔ بے بی تم جانتی ہونا ہاں فقط تمہی جانتی ہو میں نے اس پر کتنی محنت کی تھی۔ راتوں کی نیندیں اس بات پر قربان کر دی تھیں کہ مجھ سے پینٹل کی ٹونز ٹھیک سے نکلیں۔ میں نے اپنی اور روٹی کی نظم کو پہلا بار منظر عام پر لانے کا ارادہ کیا تھا عمل کیا تھا میرے

دل میں خواہش تھی کہ ایگزیشن میں دن روٹی کو بھی لے کر جائیں گے۔ میں اسے سر پر اتر دوں گا پھر اسے وہ پینٹنگ بھی گفت کر دوں گا جو میں نے سب سے پہلے بنائی تھی مگر سب خاک میں مل گیا۔ بے بی وہ خیال وہ محبت وہ پینٹنگ کسی نے چوری کر لی۔ کتنے بے حس ہیں یہ لوگ! کہتے ہیں پھر بن جائے گی کالج والے تو سو رہے کہہ کر ایک طرف ہو گئے۔ بے بی! میں نے سارا دن اس پینٹنگ کو ڈھونڈنے میں لگا دیا مگر وہ نہ ملی۔ ”بھائی اسے زمین کھا گئی یا آسمان۔ پر بے بی میں انہیں کبھی معاف نہ کروں گا۔ میں اب بھی کالج کا منہ تک نہ دیکھوں گا تم دیکھ لینا۔“

اور پھر وقت نے ثابت کر دیا کہ بھائی جان اپنی ضد کے کتنے بکے نکلے گھر والوں نے نہیں کر سکتے ہیں پاؤں پڑی داجی سے بھائی جان کالج والوں نے ہر جگہ نہ دے ڈالا مگر بھائی جان کی نہ ہاں میں نہ بدلی۔ انہوں نے سب چھوڑ دیا تھا۔ آرٹ کے سارے سامان کو انہوں نے ایک کمرے میں بند کر کے تالا ڈال دیا تھا۔ اب سارا وقت وہ آوارہ گردی میں گزارنے لگے تھے وہ بہت دل گرفتہ ہو گئے تھے اور ہوتا بھی چاہیے تھا مگر اس قدر بھی نہیں کر زمانے سے کٹ کر رہا جائے۔ جب وہ کسی طور نہ مانے تو میں نے اور روٹی نے انہیں راہ راست پر لانے کا پلان بنایا۔

ایک روز جب وہ دوپہر کو آوارہ گردی سے تھک کر اپنے کمرے میں آرام کرنے کو لگے تو میں نے آرٹ روم کا تالا کھول دیا۔ کچھ دیر بعد انہیں جب کھڑ پڑی آوازیں سنائی دیں تو وہ غصے سے اٹھے اور باہر جھانکا۔ آرٹ روم کا دروازہ کھلا دیکھ کر پہلے تو انہیں تعجب ہوا۔ پھر انہوں نے نیچے صحن میں جھانکا سب اپنے اپنے کمروں میں دسکے پڑے تھے۔ انہوں نے

اس سوچ سے کہ دیکھیں تو اندر کون ہے؟ قدم آگے بڑھائے تو چوکھٹ پر آ کر ٹپکے۔ سیاہ لبادے میں لپٹا ایک وجود ایزل پر کیڑوں لگانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ آہٹ سن کر اس وجود نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو بھائی جان کو دروازے پر استاء دیکھ کر کیڑوں چھوٹ کر پاؤں پر آن لگا۔

”کی؟ تیرا آواز پر بھائی جان چوکنے۔“

”کون ہو تم؟“ بے زاری یکدم ان پر غالب آئی۔ وہ چیخے۔

”بھائی جان..... داور بھائی! یہ دوست ہیں میری۔“

بھائی جان نے غصے میں مجھے پلٹ کر دیکھا۔ یہ وہی داور بھائی تھے جو کبھی بہت نرم طبع تھے۔ مگر اب ہر وقت بے زار اور غصے میں رہا کرتے تھے۔

”دوست ہے تو اپنے کمرے تک محدود رکھو اس کمرے میں کیوں لائی ہو لے؟“

”بھائی اصل میں ان کو ادب سے اور آرٹ سے بہت لگاؤ ہے۔ میں نے آپ کی تعریف کی تھی اسی لیے جب آج یہ ہمارے گھر آئیں تو آپ کا کمرہ دیکھنے کی خواہش کی۔“

”بے بی آپ نیچے جاؤ۔“ اندر سے آواز آئی۔ میں نے ایک نظر بھائی جان کو دیکھا اور پلٹ کر بیڑھیاں اتر گئی۔

”مجھ سے پوچھیے جو پوچھنا ہے۔“ وہ بولی۔ ”تمہیں اندر آنے کی ہمت کیسے ہوئی؟“ بھائی صاحب نیچے گرے کیڑوں کو اٹھا کر دیوار سے لگاتے ہوئے بولے۔

”آپ مجھے اس بات کا جواب دے دیں کہ آپ نے پڑھائی کیوں چھوڑی۔“ بھائی جان پلٹے۔
”کیا مطلب ہے تمہارا! تم کون ہو پوچھنے والی۔“
”وہ ہنس۔“

”میں پرستار ہوں اس لیے کسی بھی فنکار کو ادھورا نہیں دیکھ سکتی۔ آپ وہ بارہ کالج جانا شروع کروں۔ قسم سے آج اگر میرے والد زندہ ہوتے تو میری بھی کسی ایسے ہی ادارے سے پڑھنے کی خواہش تھی۔ آپ کے پاس تو موقع بھی ہے اس موقع کو اپنی ناجائز ضد کے حوالے مت کریں۔“
”تم جانتی ہو میری ضد کے بارے میں؟“ بھائی جان نے اسے ترجیحی نگاہوں سے دیکھا۔

”ہاں سب ضدوں کے بارے میں جانتی ہوں۔ اچھا میری ایک بات مانیں گے؟“
”وہ رکنی اور بیک سے کچھ کاغذ لائے گی۔“
”کیا؟“ بھائی جان شاید اس کے سحر سے متاثر ہو چکے تھے۔

”میں نے یہ ایک نظم لکھی تھی اسے رنگوں میں قید کروں گے؟“ بھائی جان دنگ رہ گئے۔ جب ذرا سنبھلے تو وہ دروازے سے نکل رہی تھی۔
”رکو... رکو... کون ہو تم؟“
”وہ ہنس۔“

”رکونی۔ آپ کی پرستار۔“
بھائی جان لرز کر رہ گئے اس کے پیچھے لپکے مگر وہ چھٹا وے کی طرح دروازے سے نکلے اور غائب ہو گئی۔
بھائی جان تھیر تھیر تھے انہوں نے روٹی کو دو سال بعد پہلی بار دیکھا تھا۔ اب سے پہلے وہ صرف اس کے خطوط ہی پڑھتے آئے تھے۔ اگلے دن ان کے اندر

آنے والی تبدیلی کو سارے گھر والوں نے دیکھا۔
”بے بی ناشتہ لے آؤ۔“ تیار ہو کر وہ نیچے اترے تو ناشتے کے لیے ہمیشہ کی طرح مجھے آواز لگائی۔
ایسی جان نے پراٹھے بناتے ہوئے حیرت سے انہیں باہر جھانک کر دیکھا۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔
”ان کے روٹی کی دوا کی ہے۔ ٹھیک ہو گئے ہیں مابودلت۔ لایے ناشتہ دیجیے ان کی طرح مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔“

میں نے ناشتے کی ترے لا کر ان کے سامنے رکھی تو انہوں نے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔
”روٹی کو دے دیجئے۔“ اور پھر خاموشی سے ناشتہ کرنے لگے۔

اسکول آ کر میں نے وہ لفافہ روٹی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ خوشی سے اس کا چہرہ گنار ہو گیا۔ کیونکہ گزشتہ دو برسوں میں اس کے خطوط کا بھائی جان کی طرف سے یہ پہلا جواب تھا۔

اس نے خط چوما، آنکھوں سے لگایا دھڑکتے دل کے ساتھ تہہ کیا ہوا خط نکالا بہت مختصر سا خط تھا باوجود ضبط کے روٹی کی آنکھوں میں ستارے جھلکانے لگے۔

”کیا ہوا؟“ اضطراب میرے بدن میں پھیل گیا۔

روٹی نے خط تہہ کر کے اسے چوما اور بیک میں ڈال دیا۔

”بتاؤ تو کیا کہا بھائی جان نے؟“
”کچھ نہیں۔“ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
”پھر رو کیوں رہی ہو؟“
”قسمت ایسی ہے۔“
”بھائی نے کیا کہا؟“ میرے اندر کھلبلی سی بچی

ہوئی تھی۔
”میرے صبر کا امتحان لینا چاہا ہے انہوں نے۔“
پھر وہ ہنسی۔ ”پاگل مجھے جانتے نہیں۔ پورے خاندان کو اس ارض وطن کے لیے قربان کر کے زندہ ہوں تو وہ کیا سمجھتے ہیں میں ایک فٹس کو نہیں مار سکتی۔ چلو جیسے میرے فنکار کی مرضی۔ میں تو ہر حال میں راضی ہوں۔“
اس کی بے ربط باتیں میرے ذرا بھی پلے نہیں پڑ رہی تھیں۔ ہاں اگر خط کا ذرا سا دیدار ہو جاتا تو پھر شاید کچھ ممکن ہوتا۔

وقت گزرتا گیا۔ بھائی جان نے دو ماہ بعد کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ مگر مزاج یکسر بدل گیا تھا۔ اب تو وہ مجھ سے بھی قطعاً بات نہیں کرتے تھے۔ روٹی کے خط و قلم وقفے وقفے سے آتے رہتے تھے۔ جواباً بھائی جان بھی کچھ نہ کچھ لکھتے مگر دونوں اپنے خط اکیلے میں پڑھتے مجھے خط کے متن کی خبر نہ ہونے دیتے سو میں اصل بات سے بے خبر تھی کہ ان کے درمیان کیا ٹھنڈی پک رہی ہے۔

پھر یوں ہوا کہ روٹی کی طبیعت بوجھل رہنے لگی۔ اس نے بنتا کھیلنا تو دور کی بات بات کرنا بھی چھوڑ دی۔ بس گرم بیچھی رہتی۔ اس کی توجہ فقط دو کاموں تک محدود ہو گئی۔ تعلیم اور بھائی جان کو تو اتر سے خط لکھنا۔ ہفتے میں بعد نہیں بلکہ ہر روز لکھنا۔ باقی ہر کام پس پشت چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سال گزر گیا اور ہمیں دسمبر میں بڑے دنوں کی چٹھیاں مل گئیں۔ دن بھر بھائی جان گھر سے باہر رہتے رات کو گھر آتے تو اپنی پڑھائی میں جت جاتے۔ عجیب عجیب پراجیکٹ بناتے رہتے۔

مجھے کاغذوں کو گوندھ کر پیپر ماسی کا کام کر رہے ہوتے تو کبھی سرکنڈوں کے چھلکے اُتار کر کوئی سیمز (لینڈ اسکریپ) بنا رہے ہوتے۔ کبھی سانپ

کی کچلی پر تجربے کر رہے ہوتے۔ تب مجھے NCA کوئی آرٹ کالج نہیں بلکہ کچرا گھر ہے۔ ہر دنیا کا اعلیٰ علم ادھر سکھایا اور پڑھایا جاتا تھا۔ ۲۰ دسمبر ہفتے کو ہمیں اسکول سے چٹھیاں ہو گئی تھیں۔ ۲۲ تاریخ کی بات تھی میں صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی کہ دستک ہوئی۔ عمر عزیز کو دروازے پر بھیجا تو تھوڑی دیر بعد وہ ایک کتاب اٹھائے چلا آ رہا تھا۔
”بائی پی آپ کی دوست نے بھجوائی ہے۔“

میں نے ہاتھ دھو کر کتاب پکڑی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ گھر میں صرف میں اور عمر تھے۔ بھائی صاحب روزانہ کی طرح غائب تھے۔ جبکہ باقی گھر والے اوکاڑہ خالہ کے گھر گئے ہوئے تھے۔ فرصت تھی جو کتاب کا معائنہ کرنے لگی۔ کوئی انگلش ناول تھا۔ پتا نہیں بلکہ دائر تھا یا بلیک شرٹ بس اسی طرح کا کوئی نام تھا اس کا۔ انگلش ناول سے مجھے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پھر ابتدائی صفحے پر میں نے دیکھ بھی لیا تھا یہ روٹی نے بھائی جان کو لکھا تھا۔

میرا جنس بڑھا حالانکہ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی۔ پر میں نے وہ خط کھول لیا۔ اب سوچتی ہوں تو بہت شرمندگی ہوتی ہے مگر کیا کرتی تھیں ان دونوں کے بیچ چلنے والی سرو جنگ کا ٹھونج لگا نا چاہتی تھی۔ انسان تھی پھر مزاج بھی جاسوسانہ تھا سو کرہ بند کر کے خط کھول کر بیٹھ گئی۔

خط کیا تھا ہیرے موتیوں کی لکھائی سے لگا ایک طویل نامہ تھا۔ وہ خطاب بھی میرے پاس ہے۔ شاید یہ اس لیے لکھا گیا تھا کہ بھائی جان نے اس کو پڑھ کر دائیں اسی کتاب میں رکھ دیا تھا اور وہ کتاب میں نے پڑھنے کے بہانے مانگ لی تھی۔ غیر جو بھی تھا خط نے میرے بہت سے سوالوں کا جواب دے دیا تھا۔

میری نامید اور بے بس تمناؤں کے سہارے خوش و خرم رہو۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور دنیا کی تمام راحتوں اور مسرتوں سے لبریز کرے اور میری بقایا زندگی بھی خداوند تعالیٰ اپنی رحمت سے آپ کو عطا کر دے اور میری بے رحم زندگی پر رحم کھاتے ہوئے مجھے موت کے گھاٹ اتار دے تاکہ میں اپنی نامید اور بے بس تمناؤں کا خاتمہ کرتے ہوئے اس دنیا فانی جو کہ دکھوں کا ایک گھر ہے اور ان دکھوں پر قابو پانا خواہشات کا خاتمہ کرنا ہے اور یہ خاتمہ موت ہے جو کہ دنیا کی تمام خواہشات کو خاک میں ملا سکتی ہے۔ لیکن خواہشات رنگ بھی لاسکتی ہیں جبکہ انسان ذرا بہت حوصلہ صبر و اجر و تحمل اور عقلمندی سے کام لے تو کوئی ایسی وجہ نہیں ہے کہ اسے خواہشات کو مناکر موت کی راہ دکھائے۔ اب خواہشات کیوں پیدا ہوتی ہیں تو یہ آپ خود بڑے قابل ہیں اور مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ خواہشات قدرتی طور پر انسان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہیں جس پر قابو پانا اس کے بس سے باہر ہوتا ہے اور اگر وہ خواہشات پر قابو نہ پاسکے یعنی کہ وہ خواہشات کے پورا ہونے سے نامید ہو جائے اور وہ دنیا کے رحم و کرم پر زندہ ہو اور دنیا اسے ویرانہ نظر آئے ایسی دنیا جہاں اس کا کوئی شریک غم اور پرسان حال نہ ہو تو وہ جتنی طور پر موت کی آرزو کرے گا۔ بس جان من خدا سے دعا فرمائیے کہ ایسے انسان کو موت بھی نہ ٹھکرائے اور جلد از جلد اسے اپنی آغوش میں لے کر ابدی نیند سلا دے۔ (الہی ثم آمین)

کیونکہ اگر موت بھی اس کے دامن میں نہیں پڑے گی تو دنیا میں اس کی زندگی ذلیل ہوگی خواہشات چونکہ اس کی پہلے ہی مٹ چکی ہوں گی لیکن باوجود اس کے بھی دنیا اسے ٹھکرانے لگی اور اسے

درد کی ٹھوکریں کھانا پڑیں گی۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ موت کو اپنا ساگھی بنا لے۔
موت کو دے دو صدائے دل
اب نہیں تیرے جینے کے دن
محترم آج ۲۵ دسمبر ہے میری طبیعت اس وقت قدرے سکون میں ہے۔ اس وقت رات کا ایک بجتے والا ہے اور خط لکھا رہی ہوں۔ ۲۰ دسمبر بروز ہفتہ ہی کو ہمیں بھی چھٹیاں ہوں گی تھیں۔ اس دن سے لے کر یہ دن آ گیا۔ میں سخت بیمار ہوں اور بستر مرگ پر ہوں اور بیماری کی حالت ہی میں عریضہ تحریر خدمت کر رہی ہوں۔ ابھی تک سہارا لے کر بیٹھ جاتی ہوں اور کبھی تھک کر لیٹ جاتی ہوں میں نے ہفتہ کو ذکر کیا تھا کہ مجھے آج بخار ہو رہا ہے محترم میں سچ کہتی ہوں کہ میں نے اپنی تکلیف یا بیماری کا ذکر سوائے آپ کے کبھی کسی دوسرے انسان یعنی اللہ خانہ وغیرہ سے نہیں کیا۔ جب تک کسی کو خود بخود نہ پتہ چل جائے چاہے میں مرلی مر جاؤں لیکن اس چیز کا ذکر نہیں کروں گی کہ مجھے فلاں تکلیف ہے۔ جب تک دوسرا کوئی بتائے پر مجبور نہ کرے اور اس چیز کا خدا گواہ ہے کہ کہاں تک سچ ہے۔ یہی وجوہات ہیں کہ میں اپنی صحت کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنا ستیا پاس کر لیا رنگ ہے تو وہ بد سے بدتر ہو گیا ہے اور میں صحت کی پروا کروں تو کس لیے اس مجھے دل کی خاطر جو کہ مجھ چکا ہے جو کہ موت کی آغوش میں سونا چاہتا ہے۔ یہ چراغ روشن ہو سکتا ہے اگر آپ اسے روشن کرنے کی کوشش کریں۔ ورنہ یہ چراغ دل ہمیشہ ہمیش کے لیے اس دنیا سے بجھ جائے گا۔ ابھی تو یہ شاید کسی امید پر ٹٹھا رہا ہو۔ کیونکہ دنیا میں امید کو بڑی فضیلت حاصل ہے۔
ہاں تو میں بیماری کے متعلق بتا رہی تھی کہ اس دن

ہفتہ کو گھر آتے ہی سخت بخار ہو گیا کچھ تو پہلے ہی تھا میں جب گھر پہنچی تو میری پسلیوں میں سخت درد تھا۔ میں بستر پر جا کر لیٹ گئی اور تقریباً ۳۰ گھنٹے تک بخار سے اس قدر بے ہوش پڑی رہی ہوں کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ زمین کہاں ہے اور آسمان کہاں واقع ہے اور میں کہاں ہوں۔ دوسرے دن یعنی بروز پیر بخار کچھ ہلکا ہوا اور مجھے کچھ ہوش آیا۔ ڈاکٹر کو بلوایا گیا تو معلوم ہوا کہ ذیل نمونہ ہو گیا ہے میری بیماری کی ابتداء کیسے ہوئی کہ اس دن میں نے تحریر کیا تھا کہ رات کو زیادہ جاگنے اور رونے کی زیادتی سے بخار ہو گیا ہے۔ ویسے تو جاگنے کو تو میں کئی دفعہ ساری ساری رات جاگتی ہوں بستر پر لیٹ کر جاگنا اور چیز ہے اس دن ہوا ہے کہ میں بالکل بغیر لطاف کے بیٹھ کر کرسی پر عریضہ تحریر کر رہی جس سے سردی لگ گئی اور یہ سردی نمونہ کی صورت اختیار کر گئی۔ بلکہ نہیں صرف یہی وجہ نہیں ہے بلکہ تفکرات کی زیادتی، کچھ شکش میں مبتلا کچھ اپنے آپ کو ٹھکرانے جانے کا فوس اور صدمہ کیا یہ مجھے خود اصد مہ پہنچا ہے کہ میں تو تعلیم اور آپ کی امید پر زندہ ہوں کہ شاید میں ان دونوں چیزوں کو حاصل کر کے زندگی کو بہتر بنا سکوں اور شاید دنیا کی مشکلات پر قابو پاسکوں اور آپ کی ناموس محبت کی پیاسی رہوں اور جناب کو شریک غم پرسان حال اور پر باز زندگی کا سہارا سمجھوں یا بنانے کی کوشش کروں اور حضور ہیں کہ برابر مجھے ٹھکرانے اور دامن چھڑانے کی کوشش کرتے ہو۔ خدا کی قسم میں نے اس چیز کو بہت محسوس کیا ہے اور اس کا صدمہ دل پر لگا ہوا ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں اور کدھر جاؤں۔

محترم خدا کے لیے آپ ایسا نہ کریں میرا دل نہ توڑیں اور اسے نہ مایوس کریں اور اپنا دامن چھڑانے کی

کوشش نہ کریں یہ دامن کبھی نہیں چھوئے گا جبکہ اسے دنیا کی مجبوریاں اور قادر مطلق نہ چھڑا دے اس وقت دو بجتے والے ہیں اب تھک گئی ہوں۔ رخصت چاہتی ہوں۔ آج ۲۵ دسمبر تھا۔ میری بیماری زور پکڑتی جاتی ہے۔ خدا سے دعا فرمائیے گا کہ وہ صدقہ خون حسین جلد از جلد ای بیماری میں موت کی آغوش میں ابدی نیند سلا دے۔

فقط ایک موت کی بخطر آپ کی پرستار!
خط ختم ہوا تو مجھے اپنے رخساروں پر گرم سیال مادے کا احساس ہوا۔ میری عزیز از جان دوست کس روگ کو گلے لگا بیٹھی تھی۔ دن بدن کھلتی ہی جارہی تھی۔ مجھے دکھ بھی ہوا کہ اس نے مجھے اس معاملے میں اپنا راز دار نہ بنایا تھا۔ آخر کیوں؟

شاید وہ دنیا کے سامنے اپنا تاشا نہ بنانا چاہتی تھی یا بھائی جان نے اسے جو نشتر لگائے تھے ان کا دکھ وہ اکیلے ہی سہنا چاہتی تھی۔ پر بھائی جان نے ایسا کیا ہی کیوں۔ میرا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا روٹی کی بیماری کا سن کر میرے دل سے بے اختیار اس کی صحت یابی کے لیے دعا نکلی۔ میں نے ارادہ کیا کہ روٹی کے سارے حالات بھائی جان کے گوش گزار کروں گی اور ان سے انتہا کروں گی کہ وہ روٹی کی پاکیزہ محبت کو قبول کر لیں اسے ٹھکرا میں نہیں۔ وہ سمجھتا ہوا چراغ ہے اس میں اگر اپنے پیار کا مادہ انڈیل دیں گے تو غریب کوئی زندگی مل جائے گی۔ میں نے ہر طرح سے روٹی کا ساتھ دینے کا ارادہ کر لیا اور اگلا خط کھول کر پڑھنے لگی۔ وہ بھی اسی کا حصہ تھا۔

26/12/58

رفیق من۔ دسمبر کی ۲۶ تاریخ ہے۔ طبیعت سخت ناساز ہے۔ مجھے آج چھ روز ہو گئے ہیں۔ سوائے دودھ کے کھانے کی شکل دیکھے ہوئے اور کھانے کی

ہمت ہی کہاں ہے۔ محترم مجھے اپنی تکلیف اور بیماری کا ذرا بھی احساس نہیں ہے خدا کرے کہ جلد ہی بیماری شدت اختیار کرے اور زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ تاکہ میرا سایہ کسی کے لیے باعثِ رحمت نہ ہو۔

محترم آپ تو تحریر فرماتے ہیں کہ جناب ناچیز کی محبت کو دل سے نکال نہیں سکتے ہیں اور ساتھ ہی تحریر کرتے ہیں کہ میری محبت کو دل سے نکال دیں اور بہتر یہی ہے کہ میرے نام تک کو بھول جائیں۔ کیونکہ اس میں تمہیں نقصان ہی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ کیا آپ یہ مصنوعی تحریر فرماتے ہیں کہ آپ میری محبت کو دل سے نکال نہیں سکتے یا یہ حقیقت ہے اور اگر حقیقت یہی ہے تو ذرا خندے دل سے غور فرمائیں کہ میں تو کسی کی ناموس محبت کو دل سے نہیں نکال سکتی تو بھلا میں کیسے آپ کی محبت کو اپنے دل سے نکال سکتی ہوں اور آپ کا دامن چھوڑ سکتی ہوں اور خدا نہ ہی ایسا کر دے۔ یہ دامن ایسے مضبوطی سے پکڑا گیا ہے اور پکڑے جائے گا کہ آپ چاہے کتنی ہی نفرت کیوں نہ دلایں یہ دامن نہیں چھوٹے گا۔ جبکہ دنیا کی گردشیں اور خدا کی ذات نہ چھڑا دے۔ میری تو ہر وقت یہی دعا زبان پر ہوتی ہے کہ الہی یہ دامن نہ چھڑا دینا اور اگر چھڑانا ہو اس سے پہلے موت کا مہمان ٹھہر دینا۔ باقی نام بھولنے کا سوال ہے تو محترم آپ کس سے سوال کر رہے ہیں اور تحریر کرنے سے پہلے ذرا اتنا تو سوچ لیا ہوتا کہ میں کس کو تحریر کر رہا ہوں۔ صد افسوس کہ ابھی تک آپ کو میری محبت کا یقین نہیں آیا اور میری محبت کو حقیقت کے بجائے مصنوعی سمجھتے ہیں۔ میری اتنی ہستی ہے کہ آپ کا نام بھول جاؤں اور آپ جیسی نایاب ہستی کا نام جس کی مثال دنیا میں بہت کم ملے گی۔ محترم کیا تحریر کروں کہ میں کس طرح سے آپ کی دیوانی اور آپ کی محبت کی پیاسی ہوں اور

کس قدر میری بے لوث محبت ہے۔ خدا کی قسم کوئی ایسی گھڑی ہے اور کونسا ایسا دن اور ایسی رات ایسی محفل ایسی مجلس ایسی نماز اور ایسی زیارت ہوگی کہ جس پر میں نے آپ کو خدا سے طلب نہ کیا ہو۔ میری ہر وقت دربار الہی سے یہی التجا ہوتی ہے کہ اے رحم کرنے والے میں اس دنیا میں تیرے سے صرف ایک چیز کی طلب گار ہوں یا تو موت دے دے اور اگر موت نہیں دیتا اور ابھی زندگی باقی ہے تو تیرے سے ایک شیش بہا ہیرا مانگتی ہوں جس کی قیمت میں زندگی کے کسی حصے میں بھی اس ہیرے کو نہیں دے سکتی اور نہ ہی اس قابل ہوں۔ اگر وہ ہیرا خدا مجھے عنایت کر دے تو زندگی کا لطف ہی آ جائے۔ کیونکہ اس کے اندر کوٹ کوٹ کر شراستِ زندہ دلی خلوص ہمدردی اور محبت بھری ہوتی ہے اور وہ قیمتی جو ہر دہیرا آپ ہیں۔ جس کو حاصل کرنے کی حد سے زیادہ کوشش کروں گی البتہ وہ خود حاصل ہونے کی کوشش کرے یا حاصل ہونے کے لیے تیار ہو اور خریدار کو پسند کرتے ہوں۔

محترم! آپ اس طرح سے میرا دل نہ توڑیں اور دامن چھڑانے اور نفرت دلانے کی کوشش نہ کریں میری محبت مصنوعی نہیں ہے۔ انشاء اللہ میرا دل یہ چیز بڑی اچھی طرح سے ثابت کر دے گا۔ مجھے دنیا میں صرف سچی محبت کی تلاش ہے اور شخص اسی کے لیے زندہ ہوں۔ میں محبت کی بھوکى ہوں۔ دنیاوی دولت اور حسن کی بھوکى نہیں ہوں۔ میں محبت ہمدردی اور خلوص کی بڑی طرح سے دیوانی ہوں اور جس نئی نوح انسان میں یہ چیزیں پائی جائیں میں اس کے لیے جان تک نثار کرنے کے لیے تیار ہوں۔ چاہے کوئی دشمن کیوں نہ ہو۔ مجھے سوائے سچی محبت کے دنیا میں کسی دنیاوی چیزوں کی ضرورت نہیں۔ اگر مجھے محبت

کی پتلی قرار دیا جائے تو بجا ہوگا۔

محترم! مجھے دنیا سے واسطہ پڑا ہے میں ہر ایک کی داستان بغور سنتی ہوں اور پھر کافی اندازہ لگاتی ہوں بلکہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ دنیا کیا چیز ہے؟ شادی کیوں بری ہوتی ہے جس کے متعلق میں شاید چند فقرے تحریر خدمت کر سکوں ہاں تو دنیا کی ٹھوکروں کی حد کہاں تک ہے اور انسان کو مشکلات کا سامنا کن طریقوں سے کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے دوسروں کی داستانیں سننے میں بڑی دلچسپی ہے اور غور سے سنتی ہوں۔ انسان دوسروں کی داستانیں سن کر بہت سے سبق حاصل کر سکتا ہے۔ اب جہاں تک محبت کا تقاضا ہے تو میں نے ان گنت رسالے اور کتابیں پڑھی ہیں اور پڑھتی رہتی ہوں۔ ایک رسالہ میں نے لکھا ہوا ہے جو شخص عورتوں کو بے لکھا ہوتا ہے اور عورتوں ہی کے لیے ہوتا ہے۔ جن کے نام ”زیب النساء“ اور ”خوز“ ہیں۔ ان دو رسالوں میں سچے اور دردناک افسانے درج ہوتے ہیں۔ ان کو پڑھنے سے کافی باتیں حاصل ہوتی ہیں اور مظلوم ہوتا ہے کہ محبت کیا چیز ہے اور خلوص اور ہمدردی کو کیا فضیلت حاصل ہے۔ اگر آپ کو پڑھنے کا شوق ہو تو ان میں سے ایک رسالہ لگوائیں اس کا ایڈریس میں تحریر کر دوں گی۔

ہاں تو جان من! محبت ایک جوہر ہے کہ جس کو حاصل کر کے انسان دنیا کی ہر مہم پر قابو پا سکتا ہے۔ محبت ہی ایک چیز ہے جو کہ دوسروں کو یعنی غیروں کو اپنا بنا دیتی ہے۔ محبت ہی پتھر کو پانی بنا دیتی ہے۔ محبت ہی ملکوں اور قوموں کی ترقی کا باعث ہوتی ہے۔ اگر قائد اعظم مرحوم کے دل میں مسلمانوں کی ہمدردی اور محبت کا احساس نہ ہوتا تو آج ہم دوسروں ہی کے غلام ہوتے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ محبت عشق کی صورت ہی میں کی جائے۔ دنیا جو آج کل محبت کرتی ہے وہ محض

کوئی تولد پہلانے کے لیے کرتا ہے تو کوئی عیش پرستی میں اور کوئی لغو فرین میں۔ کوئی جذبات کی رو سے تو کوئی جسمانی اور اکثر لوگ ایسے دیکھنے میں آتے ہیں جو ایک دوسرے کو دیکھ کر محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں یعنی اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ اکثر لوگ دوسروں کو محبت کرتے ہوئے دیکھ کر ایسا کرنا شروع کر دیتے ہیں لیکن انشاء اللہ ہماری محبت ان تمام چیزوں سے علیحدہ ہوگی۔ یہ ایک سچی محبت ہے اور سچی ہی رہے گی۔ میری ایک پاک محبت ہے۔

ہاں تو میں ذکرِ محمد ہی کی محبت دوستی ہی کی بنا پر نہیں کی جاتی بلکہ محبت پہاڑوں سے پتھروں، صحراؤں دریاؤں سے آسمان وزمین سے والدین سے بھائی بہن سے بیوی بچوں سے اپنی ذات سے غرضیکہ دنیا میں کوئی چیز ایسی ہے ہی نہیں جو کہ محبت کے وجود میں نہ آ سکے۔ آپ ذرا غور فرمائیں کہ رسول اکرم ﷺ کو خدا سے کتنی محبت تھی۔ بہن بھائیوں میں کس قدر محبت ہوتی ہے اولاد اور والدین کے درمیان کس قدر محبت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسی طرح خاوند بیوی میں کس قدر محبت ہوتی ہے دوستوں میں سچی محبت پائی جاتی ہے۔ محبت تو ایک خاک سے خاک چیز سے بھی کی جا سکتی ہے۔ محبت کے تو اس قدر فوائد ہیں کہ میں تحریر کر ہی نہیں سکتی۔ میں حیران ہوں کہ جناب محبت جیسے موتی سے گہراتے ہیں۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ محبت سے افضل دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے۔ البتہ یہ بے لوث سچی اور پاک ہو۔ چند مختصر الفاظ میں محبت کو یوں کہنا چاہیے۔

محبت سوز ہوتی ہے محبت ساز ہوتی ہے محبت دو دلوں کا پوشیدہ راز ہوتی ہے آپ کو اس قدر مایوس نہیں ہونا چاہیے اور گھبرانا نہیں چاہیے دنیا امید پر قائم ہے اور امید رکھنا لازمی

چیز ہوتی ہے۔ ذرا ہمت سے کام لیتا پڑے گا۔ محبت کے سلسلے میں میری تو یہی دعا ہے۔

رفیق من! میں آپ کو زندگی کا دوست سمجھتی ہوں اور میری یہ بات یاد رکھیں! میں تو میرا جہاں تک خیال ہے کہ لڑکی لڑکی اور لڑکے لڑکی کی دوستی میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جب لڑکا اور لڑکی کی دوستی میں شادی ہو سکتی ہے تو وہ دونوں یقینی طور پر شادی کی خواہش کریں گے کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ شادی سے ہماری دوستی بچنے ہو جائے گی اور یہ دوستی بھی ٹوٹ نہ سکے گی۔ لیکن لڑکی لڑکی کی دوستی یا لڑکے لڑکے کی دوستی میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ان کی شادی ہونا ناممکن ہوتا ہے اور وہ شادی وغیرہ کی تمنا نہیں کرتے لیکن ان کی دوستی قیامت تک زندہ رہ سکتی ہے اسی طرح میں چاہتی ہوں کہ لڑکے اور لڑکی کے درمیان اس قدر محبت بچتی ہوئی چاہیے کہ اگر ان کی شادی نہ ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو بیوہ کے لیے بھول جائیں اور اپنی دوستی کو الوداع کہہ دیں لیکن اکثر ایسا ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ ایک چیز جبکہ اپنی ہو جاتی ہے تو اس کے چھن جانے کا اتنا افسوس ہوتا ہے کہ انسان برداشت نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے برداشت سے باہر ہوتا ہے اور یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ بعض اوقات اموات واقع ہو جاتی ہیں۔ اب آپ یہ سوال کریں گے کہ جب تم انجام کو اچھی طرح سے جانتی ہو تو جانتے ہوئے آگ میں جھلاٹک لگنا خود موت کو گلے لگانا ہے لیکن میں یہ چیز کہتی ہوں کہ جب خدا تعالیٰ نے بار بار فرمایا ہے کہ امید رکھو اس سے مایوس نہ ہو اور ہمت اور کوشش کرنا مدد تجھے میں دینے والا ہوں اور آگ میں انسان تب جھلاٹک لگتا ہے جب وہ امید سے مایوس ہو جائے۔

محترم! میں سچ کہتی ہوں میں خود محبت کے جال سے بہت گھبراتی تھی اور جب دنیا کو محبت میں گرفتار ہوتا دیکھتی اور اس کا برا انجام میں دیکھتی تو دل میں عہد کرتی بلکہ میرا یہی عہد تھا کہ میں بھی محبت کا شکار نہ ہوں گی لیکن اب جبکہ آپ سے واسطہ پڑا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ محبت کیا چیز ہوتی ہے اور محبت کا کرنا انسان کے اپنے بس میں نہیں ہوتا۔ بلکہ قدرتی طور پر یہ محبت کا دیوانہ ہو جاتی ہے اور محبت سے پرہیز کرنا اس کے اپنے بس میں نہیں ہوتا۔

اور جب آپ سے محبت کی ابتداء کی تھی تو میری زندگی کا پہلا قدم تھا میں تو بلکہ خود اکثر سوچتی رہتی ہوں یعنی آپ سے محبت کرنے کے سلسلہ میں کہ یہ ہوا کیا ہے؟ اور اب بھی تک حیران ہوں اور آپ اپنی جگہ حیران ہوں گے اور اکثر سوچتے ہوں گے۔ بالی رتی شادی کا سلسلہ..... تو جان من! یہ ہماری کتنی خوش قسمتی ہے کہ ہم دونوں ہم مذہب، ہم قوم، ہم راتو رات خیال ہیں اور ہمارے دل میں کس قدر ایک دوسرے کے لیے محبت کا جذبہ ہے۔ اور ہماری محبت کس قدر بچی بے لوث اور پاکیزہ ہے اور ہماری اس خوش قسمتی کو مد نظر رکھتے ہوئے اگر ہماری شادی ہو جائے تو ہم سے بڑھ کر دنیا میں خوش نصیب کون ہو سکتا ہے اور بے شک ہماری شادی کا ہونا از حد شوار ہے اور ہمیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن ہم امید پر بھروسہ کریں گے اور ہمت اور کوشش سے کام لیں گے تو ایسی وجہ نہیں ہے کہ ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے اور خدا نہ ہی ایسا کرے۔

تو محترم! مشکلات کا سامنا زیادہ تر آپ کو دیکھنا پڑے گا میرے لیے تو کوئی مشکلات نہ ہوں گی کیونکہ اکثر شادی کے سلسلہ میں لڑکے والوں کو بڑی چولی کا زور لگانا پڑتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ میرے

سلسلہ میں آپ انہی مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے میرا اندازانہ محبت قبول نہیں فرماتے۔ اور مجھے بار بار ٹھکراتے اور دامن چھڑاتے اور نفرت دلانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن میرا یہ یقین ہے کہ انسان عمل سے ہر بڑی سے بڑی مشکلات پر قابو پا سکتا ہے اور اگر فرض کیا کہ میں خدا خواستہ آپ سے چھن بھی جاؤں اور میری یا آپ کی شادی کسی دوسرے سے ہو بھی جائے میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہمیں بہت زیادہ اس چیز کا صدمہ ہوگا لیکن مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کو بھول جائیں کیا ہماری دوستی ختم ہو جائے گی؟ کیا ہم پھر اسی طرح ایک دوسرے سے محبت نہیں کریں گے؟ بے شک ہمارے تمام منصوبے خاک میں مل چکے ہوں گے۔ ہمارے تمام ارمان اور تمنا میں مٹ چکی ہوں گی لیکن جس طرح سے ایک لڑکی لڑکی سے محبت کرنے پر یا لڑکے سے لڑکے کی محبت نہیں ٹوٹ سکتی اسی طرح لڑکی لڑکے کی محبت خاک میں نہیں مل سکتی اور ان کی دوستی بھی نہیں ٹوٹ سکتی۔

محترم! آج مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۸ء تھا۔ مجھے نمونہ کا تو جلد ہی آرام آ گیا تھا لیکن بخار کی بہت زیادہ دہلی ہے اہل گھر بہت فکر مند ہیں کہ اسے ہوا کیا ہے کیونکہ نہ تو کھانسی ہے اور نہ ہی زکام جیسی کہ آج کل وبا پھیلی ہوئی ہے ڈاکٹر بھی کہتا ہے کہ مجھے سمجھ میں نہیں آتی کہ کس قسم کا بخار ہے نہ تو طبیعاً ہے اور نہ ہی انفلوینزا ہے۔ دو دن رہا ہوں تو اس کا الٹا اثر پڑتا ہے۔ واقعی محترم آپ یقین کریں کہ ڈاکٹر روانی دیتا ہے تو وہ بجائے فائدہ کرنے کے نقصان دیتی ہے۔ اب ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ میں مر لیوں محبت ہوں اپنے محبوب کی ایک الفت بھری نگاہ کی پیاسی ہوں جو کہ مجھ کو بے کف نصیب ہو۔

محترم! میں اب اجازت چاہوں گی جتنی جسم میں ہمت تھی عرضیہ لکھنے میں لگاؤں۔ اب فقط خون کی گردش اور سانسوں کی روانی جسم میں باقی رہ گئی ہے۔ جواب تو دل توڑنے والا ہی ہوگا مگر پھر بھی اس کی منتظر رہوں گی کیونکہ امید پر دنیا قائم ہے۔

فقط ایک ٹھٹھا تاہوا ستارہ

آپ کی پرستار

بھلا تو کیا تھا مگر میں اسے ایک ہی نشست میں ختم کر کے لکھی تھی اب اور کسی خط یا تفصیل کی ضرورت نہیں تھی۔ بھائی جان کا رویہ روٹی کی خاموشی اس کی حالت..... سب باتیں سامنے نہیں۔ مجھے بھائی جان پر غصہ بھی بہت آیا تھا۔ بھلا یوں بھی کوئی کرتا ہے۔ ایک طرف اس سے محبت کے دعوے دار تھے تو دوسری جانب اس کا اقرار کرتے جان جاتی تھی ان کی۔

میں نے خط کو دوبارہ اسی نفاست سے تہہ کیا اور بھائی جان کے کمرے میں رکھا آئی۔

اگلے دن فرصت پا کر میں روٹی کے گھر چلی گئی۔ اس کی حالت دیکھ کر دل میں ہوک سی اٹھی۔ کہاں پھولوں سا شگفتہ چہرہ اور کہاں حویلیوں سی دیرانی عبداللہ بھائی اپنی بیوی کے ساتھ کہیں جا رہے تھے۔ سو مجھے گھر کے اوپر والے حصے کی طرف اشارہ کر کے چلے گئے۔ میرے لیے یہ بات حیرت کا باعث تھی۔ گو کہ میں اتنا بھی روٹی کے گھر نہیں آئی تھی مگر اتنا ضرور جانتی تھی کہ وہ نچلے حصے میں اماں جی کے ساتھ ہوتی ہے۔ میں حیران حیران سی سڑھیاں چڑھ کر اوپر گئی۔ وہ سامنے دیوان پر لیٹی نظر آئی۔

خالی خالی سی نگاہیں جھپٹ کو گھوم رہی تھیں۔ میری آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر مجھ کو دیکھا اور کچھ بیٹھ گئی۔ خزاں رسیدہ جو شویش زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

”آؤ ما بے بی رک کیوں لگیں؟“ مجھے دیکھ کر وہ

جھکی اور آگے بڑھ کر گھٹے لگا لیا۔

”یہ کیا حال بنالیا ہے اپنا“ میں غصے سے پھٹ پڑی۔ وہ ہنسی۔

”کیوں کیا ہوا میرے حال کو۔ ٹھیک تو ہوں“ مست ہوں۔

”آئینہ دیکھا ہے اتنے دنوں سے۔ بھجر زمین کی مانند تمہارے چہرے پر روزاڑیں پڑ گئی ہیں۔“

”چھوڑو یاد دل لگی کا کمال ہے کہ جو اس حال تک پہنچی ہوں۔ تم نے دیکھا نہیں تمہاری آمد سے قبل میں کس قدر پڑ مر رہی تھی اور اب کس قدر خوش ہوں۔

یہ بتاؤ رفیق من کیسے ہیں؟“

”رفیق.....؟ کون رفیق من؟“ میں نے اچھنبھے سے اسے دیکھا۔

”تمہارے بھائی صاحب اور کون.....؟“ وہ ہنسی۔

”نجانے اب کیوں وہ بات بات پر ہنس رہی تھی۔ میں چیخ اٹھی۔“ بھائی جان ان پر نیچے بہت غصہ ہے۔ بہت برا کر رہے ہیں وہ۔ بھلا انہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی کی محبت کو ٹھکرا لیں۔ دیکھو تو کیا

حال بنا دیا انہوں نے تمہارا۔“ میری بات سن کر اسے چپ لگ گئی۔

وہ بولی تو پھر اس کے لہجے میں خشک چٹوں کی سی سرسراہٹ تھی۔

”ہوتا ہے ایسے ہی ہوتا ہے۔ ارے ان کو تو اتنی سارے حق پہنچتے ہیں۔ مجھے ٹھکانے کے در نہ کسی غیر

کی کیا مجال یہ حرکت کر جائے اور میں اپنی اس حالت پر تو ان کی شکوہ ہوں۔ یقین جانو اپنے حال میں میں

اس قدر مست ہوں کہ میری کسی دھڑکی کسی تکلیف کا احساس تک نہیں۔ مجھے علم ہے وہ مجھ سے پیار کرتے

ہیں۔ بس اوپر کی دل سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔

پریس مایوس نہیں ان کے اسی عمل سے تو مجھے مست

مولا بنا دیا ہے۔ اب مجھے اندھیرے سے بھی ڈر نہیں لگتا۔ ساری رات آنکھوں میں کاکٹ کر بھی میں صبح کو تازہ دم ہوتی ہوں۔ خیر چھوڑو یہ قصہ بس یہ بتاؤ کیا

کھاؤ گی۔“

”کچھ نہیں۔“ میں نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”اے تم کب دوزخ میرے گھر آتی ہو اچھا ٹھہرو میں آم لے کر آتی ہوں۔“ وہ اٹھی اور اندر چلی گئی۔

میں اپنی جگہ حیران پریشان ہی رہ گئی۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ روٹی کا دام بچل گیا ہے۔ ورنہ یہی ہنسکی باتیں تو ٹھیک تھیں یہ بے موی بھلوں کا ذکر بھی وہ لے

بیٹھی تھی۔ میں ابھی اسی اوہیز بن میں تھی کہ وہ اندر سے کھڑے ہوئے آموں کی ایک پلیٹ لے کر آئی۔

”لو کھاؤ۔ بہت عمدہ آم ہے۔“

”روٹی تم باگل تو نہیں ہو۔“ میں پلیٹ دیکھ کر چیخی اور بدک کر پیچھے ہٹی۔ جیسے پلیٹ میں آم نہ ہوں

سانب ہوں۔

”کہاں دسمبر اور کہاں آم۔“

”ارے پریشان مت ہو۔ سوچو مت بس کھا لو۔ میں بھی کھا لیتی ہوں۔ دیکھو ایسے۔“ اس نے کہا اور

ایک قاش اٹھا کر کھانے لگی۔

”ہر اس موسم میں یہ گرمیوں کا پھل کدھر سے آیا۔ تم کوئی جن تو نہیں ہو۔“

”کاش.....؟ آہستہ..... بس زیادہ سوال نہیں کھا لو۔“

اس نے میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ برف کے جیسا ٹھنڈا ہاتھ اور ایک قاش اٹھا کر میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اسے چمکھا تو واقعی

آم کھانے کا لطف آ گیا۔ اتنا لذیذ اور میٹھا آم میں نے زندگی میں پہلی بار کھایا تھا۔ میں دوسری قاش اٹھانے لگی تھی کہ روٹی نے میرا ہاتھ روک دیا۔

”بس اب تم جاؤ۔ میں نے آرام کرنا ہے۔ اپنے بھائی صاحب کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ میں اس وقت تک دعا گو رہوں گی جب تک سانسوں کی بالائوٹ

کر نکھر نہیں جاتی۔ یا شاید مرنے کے بعد میری روح آسمانوں پر بھی مضطرب رہے۔ جاؤ اب جاؤ تم۔“

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اندر جا کر دو واہ بند کر لیا۔ میں نے دیوان پر نظر ڈالی تو دل دھک سے رہ گیا۔ آموں کی پلیٹ غائب تھی۔ جبکہ روٹی اپنے

کمرے میں خالی ہاتھ تھی۔

”یا خدا یہ کیا گودھ دھندہ ہے۔ جیسے کوئی آسیب ہو۔“ آسیب کا خیال دل میں آتے ہی میں وہاں سے رو پھڑک ہو گئی اور گھر آ کر سانس لیا۔

پھر بھائی جان سے مجھے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا اور کتنے ہی ماہ بیت گئے۔ یا شاید سال و سال۔ اس

دوران تو اتر سے روٹی کے خطوط آتے رہے۔ ہماری پڑھائی ختم ہو گئی تھی۔ نہیں صرف میری پڑھائی ختم ہوئی تھی۔ روٹی نے آگے کان میں داخلہ لے لیا تھا۔ پہلے

خط میرے توسط سے آتے تھے اب ڈاک کے ذریعے آنے لگے۔ پہلے ایک دن چھوڑ کر پھر ایک ہفتے بعد

پھر ایک مہینے بعد پورے مہینے کے اکٹھے خط آنے لگے۔ بھائی جان کی ڈاک صرف بھائی جان ہی

کھولتے تھے۔ اس لیے گھر والوں کو اس کہانی کا علم نہ ہو سکا۔ ہاں وادی کو کچھ کچھ بھٹک پڑ گئی تھی۔ مگر اس

سے پہلے کہ وہ کچھ کرتے انہیں کعبۃ اللہ کی زیارت کا بلاوا آ گیا۔ جاتے جاتے میں نے انہیں روٹی کے

سکون کے لیے دعا کرنے کو کہا۔ شاید انہوں نے کی بھی ہو لیکن میں پوچھ نہیں سکی۔ کیونکہ وادی جب واپس

آئے تو ان کے لب سینے جا چکے تھے۔ وہ ابدی نیند سو چکے تھے۔ مجھے یاد ہے کتنے مہینے تو میرا دنیا ہی ختم نہ

ہوا تھا۔ میں مٹرا سا راون وادی کے گریزے میں گزرا۔

جیسے صحت سلام چھارہ۔

ویتی۔ قرآن پڑھتی جاتی اور روٹی جاتی۔

ہاں تب تب بھائی جان آتے اور میرے کندھے سے سر ٹکا کر تیسے رہتے اور جب وہ اٹھ کر جاتے تو میرا

پورا کندھا ان کے آنسوؤں سے بھیک چکا ہوتا۔

وادی کی بری گزری تو بھائی جان بھی کالج سے فارغ ہو گئے۔ گولڈ میڈلسٹ کہلائے تھے وہ مگر ان

کے دل میں اس وقت تک اپنی گمشدہ پیشنگ کا خیال زندہ تھا۔ باوجود کوشش کے وہ اسی طرح کی پیشنگ

دوبارہ نہیں بنا سکے تھے۔ نہ انہیں اس کا کوئی سراغ حاصل ہوا تھا۔

انہیں اپنے ہی کالج سے لیکچرار کی آفر ہوئی جو انہوں نے خاموشی سے قبول کر لی۔ ساتھ میں اپنی

آرٹ گیلری کھول لی۔ ہاتھ میں ہنر تھا اور تھے بھی گولڈ میڈلسٹ سوسیال اپنا پرباش کی طرح برستار۔

جلد ہی وہ سیٹل بھی ہو گئے۔ اہی جان نے ان کی شادی پر زور دینا شروع کر دیا مگر انہوں نے میرا شوشا

چھوڑ مارا۔ رنگ بات تھی کہ میں اپنے خالد زاد سے منسوب تھی۔ مگر ابھی میری شادی میں کچھ وقت تھا۔

مگر اہی جان کا تقاضا اور بھائی جان کی بے وقت کی راگی نے میری شادی کراہی دی۔

میں اپنی شادی کا کہنے خود روٹی کے گھر گئی تھی۔ گھر کا بچا اچھا حصہ ہر سائز کے بچوں سے آباد تھا۔ جبکہ

اوپر کا حصہ اجازت دہلی کی مانند سنسان۔

دروازے پر میری مڈ پھیٹر سیٹھا بھائی سے ہوئی۔ وہ کچھ سن سے مسلمان ہوئی تھیں بس نام کی مسلمان نہ

انہوں نے اپنا نام تبدیل کیا تھا اور نہ مذہبی رسومات۔

نجانے کیوں بس وہ منٹ ان کے پاس اگر بندہ بیٹھ جائے تو دنیا جہان کے گلے شکوے سناؤ لیتی تھیں۔

فلاں نے یہ کیا فلاں اتنی خیر ملی ہے وغیرہ وغیرہ میں

”وسلام۔ آؤ۔“ انہوں نے بحالت مجبوری کہا۔
”اماں کدھر ہیں؟“ میں نے اندر کمروں کی طرف نظر دوڑائی۔

سے نکلتی ہے پھر سارا وقت اوپر ہی رہتی ہے۔ کچھ دے دو تو کھالے گی، ورنہ ہفتہ ہفتہ بھوکے رہے گی۔ گھر میں سوائے اماں کے کسی سے بات تک نہیں کرتی۔“

”اندر ہیں۔“ انہوں نے کہاں جاتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں وہ کہیں جائیں چند دن وہ بھی سکون کے گزار لیں اور ہم بھی۔ ہر بات پر اعتراض، اٹکٹش بادل نہ پڑھو اسلامی کتابیں پڑھو اگر بڑی فلمیں دیکھنے مت جاؤ، نماز روزہ کرو۔ اب بندہ پوچھے قبر میں پاؤں لٹکا کر بیٹھی ہیں مگر روک ٹوک ختم نہیں ہوئی۔ وہ بولتی گئیں۔ ان کی عادت تھی اماں بھی واقف تھیں مگر مجھے دلی دکھ ہوتا تھا۔ بھلا ایک بوڑھا وجود انہیں کیا تکلیف دیتا تھا مگر بھائی بے زار تھیں۔ وہ آزاد ماحول کی پروردہ تھیں۔ محبت کی شادی رچانی تھی۔ سولہ برس آراوہی رہنا چاہتی تھیں۔

وہ ایک دفعہ پھر شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے جان چھڑانے کے لیے تیز تیز میزیں چاہنی شروع کر دیں۔ اوپر ہی حصے میں پچھلی تو رولی سامنے نظر نہ آئی۔ کمرے میں دیکھا تو میری پچھلی کچھ لکھ رہی تھی۔
”اندر آنے کی اجازت ہے یا آج بھی باہر سے ہی جاؤں۔“ میں نے شرارت سے کہا۔
وہ چونکی۔ پھر دروازہ کمرے کے گلے لگ گئی۔
”اللہ جھوٹ نہ بلوائے، ابھی میں رفیق من سے تمہارا ہی ذکر کر رہی تھی اور اندر بھی آ جاؤ وہ گھر پر نہیں ہے۔“

وہ روانی میں بچانے کیا کہہ گئی پھر زبان دانتوں تلے دبائی۔

میں ان کی باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اماں کے پاس چلی گئی۔ انہوں نے میرے صدمے اتارنے شروع کر دیے۔ رولٹی کی طرح وہ مجھے بھی اپنی بیٹی کہتی تھیں۔ جب میں نے انہیں شادی کا بتایا تو انہوں نے جھولی پھیلا کر میری سات نسلوں تک کو دعائیں دے ڈالیں۔ مجھے یکدم حاجی یاد آ گئے۔ وہ بھی ایسے ہی تھے۔

”ہاں، میری شادی ہے رولٹی۔“ میرے گلے میں آنسوؤں کا گولہ لٹک گیا۔ رولٹی کو کچھ کراب دیے ہی میرا دل بھرا آتا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو ایک داور بھائی کیا ہزاروں بھائی اس پر قربان کر دیتی مگر میں بے بس تھی۔

”ارے بھئی تو اس میں رونے والی کون سی بات ہے یہ تو خوشی کی خبر ہے۔ مجھے محترمہ ہادی نے بتایا تھا۔ میں خود آتی تمہارے پاس مگر کچھ مجبوریاں آئے آ گئیں۔“

میں باہر نکلی تو سہیتا بھائی اپنے چھوٹے بیٹے کی پٹائی میں مصروف تھیں۔ مجھے دیکھا تو ادھر لپکیں۔

”اب تم رولٹی سے ملنے جاؤ گی۔ جاؤ، مگر اسے اتنا کہہ دینا کہ اب شادی کر لے۔“ فضول میں گھر پر پوچھ بنی بیٹھی ہے۔ لڑکیاں اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ اب اسے دیکھو اور کہے اس حصے میں جہاں دن کو بھی جاتے ڈر لگتا ہے وہ ذمہ ڈالنے بیٹھی ہے مجھے تو لگتا ہے پاگل ہو گئی ہے۔ میں بس کالج کے لیے گھر

میں نے پر شکوہ نگاہ اس پر ڈالی۔
”تمہاری تنہی مجبوریاں ہیں رولٹی آج یہ بھی بتاؤ برسوں گزر گئے مگر میں تمہیں جان ہی نہ پائی۔“
میری بات شاید اس کے دل پر لگی تھی سورخ موڑ کر کتابیں سینے لگی۔ مجھے انہوں ہوا میرے ہونے کو

اور کیا بارنا۔
”اچھا چھوڑو یہ بتاؤ تمہاری پر حائی کیسی جا رہی ہے۔“ میں نے اس کا کندھا تھما۔

”ٹھیک ہے اب تو بس ایک سال رہ گیا ہے۔ پھر پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لوں گی نفسیات کے مضمون میں۔“
”نفسیات پڑھ لو گی۔“ میں نے ماحول کی کرنگھی دور کرنے کو تہہ ہلایا۔

اس نے ایک نظر مجھے دیکھ کر گناہیں جھکا لیں۔
”میں آج تک نفسیات ہی تو پڑھتی آئی ہوں۔ کبھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی، کبھی تمہاری، کبھی اپنی کبھی رفیق من کی، کبھی بھائیوں کی، کبھی اس کی، کبھی اس کی اب تو لگتا ہے کہ پرچہ دینے بیٹھی تو بغیر پڑھے ہی سب لکھاؤں گی۔“

کمرے کا ماحول جس زدہ سا ہو رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر باہر کی کھڑکی کھول دی۔ اس نے شاید مجھے منع کرنا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر چپ کر گئی۔ گلی میں پھیری والوں کی آوازیں اوپر تک آنے لگی تھیں۔ سامنے والے گھر کی کھڑکی اس کھڑکی کو کھلتے دیکھ کر ذرا سی وا ہوئی تھی۔ پردے تلے تھے پھر سکوت مجھے کسی کا گمان ہوا تھا سو کھڑکی بند کر کے دوبارہ مسہری پر آ کر بیٹھ گئی۔

”سامنے والے گھر میں کون رہتا ہے رولٹی؟“ میں نے نہ پوچھی بات آگے بڑھانے کی غرض سے پوچھا۔
”بے اک پاگل مردے میں جان ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ اس نے کہا اور عجیب سے انداز میں ہنس دی۔

”تمہاری باتیں کبھی کبھی میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں۔“ پتا نہیں کیا کبھی رہتی ہو۔
”بہت گہری باتیں ہیں بے بی یہ۔ آج تک تمہارے بھائی کی سمجھ میں نہ آ سکیں تو قہمے کہا شے ہو۔“

میں کہتی ہوں تم خوش قسمت ہو جس کے ساتھ منسوب ہوئی اسی سے پیار ہوا اور جس سے پیار ہوا اسی کے لیے سرخ جوڑا پہننے جا رہی ہو۔ ایک میں ہوں امید پر زندگی کو چلائے جا رہی ہوں۔“ وہ چند لمحے سانس لینے کو رکھی۔ پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر چمکی۔
”یہ بتاؤ تمہارا شادی کا جوڑا کیا سا ہے؟“
میں شرما کر رہ گئی۔ بھلا میں نے کب دیکھا تھا جوڑا جو اسے بتائی۔ بس یونہی کہہ دیا کہ ”سرخ ہوگا۔“

میرے انداز پر وہ کھل کر ہنسی۔ میں نے برسوں بعد اس کی ہنسی سنی تھی۔ سوچیت سے اسے دیکھنے لگی۔
”بہت بھولی ہوتی ہے بی اچھا یہ بتاؤ کیا کھاؤ گی؟“
”ناپا پانا۔“ میں کچھ بھی نہیں کھاؤں گی۔ یاد ہے ایک دفعہ تم نے مجھے بے موی آم کھلائے تھے اور ایک دفعہ دلی کے خستہ درودھ والے پرانے۔ حالانکہ دونوں چیزوں کا ادھرا لاہور میں وجود تک نہ تھا۔ بچانے آج کیا کھلاؤ۔“

وہ پھر قہقہہ ہلکا کر رہی۔
”بس مہربانیاں ہیں اس کی۔“
میں چونکی۔ ”کس کی؟“
”بے کوئی۔“
”کیا جن ہے؟“ مجھے تجسس ہوا۔
”شی آہستہ یاد۔ برامنا جائے گا وہ۔“
”تو پھر؟“

”یہی سمجھو پڑھ لے کا بہت پیارا۔ آگ کا بیٹا ہے مگر مزاج جرف ہے۔ پاس ہے۔“ وہ کھولی کھولی سی بولی۔
”مجھے کسی کو خبر ہے؟“

”ہوئی ہوگی۔ برسوں قبل اس حصے میں کوئی کرائے دار نہ لگتا تھا وہ کسی کی موجودگی اپنی تنہائی میں برداشت کرتا ہی نہ تھا۔ شور اسے پسند نہیں۔ بس بھگدیتا سب کو۔ پھر دنیا ہے کٹ کر میں رفیق من

کے لیے ادھر آ گئی۔ ابتداً مجھے بھی چھیڑا اس نے مگر میں اپنے ہوش میں ہوتی تو تنگ ہوتی۔ ہر وقت روتی تھی میں وہ بچ گیا۔ پھر تنگ کرنا چھوڑ دیا۔ پھر جو میرے منہ سے نکلا سوائے رفیق من کے اس نے مجھے ہر وہ چیز لا کر دی۔ کبھی کبھی خود بھی دنیا کے عجوبے اٹھا کر لے آتا ہے۔

اس کی باتیں سن کر مجھے تو جیسے سکت ہو گیا۔
”میں محبتوں سے ڈرتی تھی مگر محبتوں کے بخنود میں پھنس گئی۔ کسی کی میں طلبگار ہوں تو کوئی میرا طلبگار ہے مگر ہائے افسوس جس کی میں طلبگار ہوں وہی میرا طلبگار نہیں ہے۔“

میرے دل کی دعاؤں کا حوصلہ تو دیکھ احساس اس کا ہے جس کو میرا احساس نہیں لیکن پتا ہے اب اس موسم میں میرا کیا دل کرتا ہے کوئی مجھے چاہے ٹوٹ کر اور میں بے وفایں جاؤں۔ مگر قسمت کہاں، کوئی کہاں مجھ جیسا بھی کو چاہے گا محبت کون کرتا ہے روئی کی محبت تو ہزار ترپانیاں ملتی ہے اور میری طرح قربانیاں کون دیتا ہے۔

محبت تو ہاتھ میں پکینی ہوئی چوڑی کی مانند ہے سنو رتی ہے، شککتی ہے، کھٹکتی کر ٹوٹ جاتی ہے رفیق من آج بھی کہتے ہیں کہ میں ان کو بھول جاؤں، کدھر بھولا جاتا ہے۔ قسم کھاتی ہوں ارادہ کرتی ہوں مگر یہ دل جو ہے بغاوت پر آمز آتا ہے۔ آنکھیں جھیر جھیر بہنے لگتی ہیں تو قسمیں ہوا کے قلمے ثابت ہوتی ہیں۔ اس کی باتیں بس ہیں ہزار دلیلیں دے گا ہزار بہانے بنائے گا نہ اپنانے کے۔ مگر میرا برسوں قبل بھی ایک تقاضا تھا اور آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا کہ میری آرزو تمنا فقط وہی ہے مگر کہاں ادھ مانٹائی کب ہے مگر پتا ہے روئی بچھے کچھ عرصے سے مجھے سکون سا آ گیا ہے۔ محبت میں اب

وہ بے چینی نہیں رہی۔ میں اپنی ذات میں بہت تہذیبی لے آئی ہوں۔ بس ایک عادت باقی رہ گئی ہے تمہارے بھائی جان کو یاد کرنے کی عادت۔ اور انشاء اللہ یہ برقرار رہے گی۔ مرتے دم تک۔ دھڑکن کی ڈگ ڈگی یہ کب سے محو رقص ہے دل تنگ کے ہی گر جائے تماشا تو ختم ہو بس اب جاؤ، میں مجبور ہوں تمہیں بھیجنے پر ابرامت ماننا وہ آگیا ہے میں تمہارے لیے دعا کروں گی۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ۔“

اک معصوم سی دعا ہے ان لبوں پہ کوئی کچھ بھی کرے پر محبت نہ کرے میں نے ایک الوداعی نظر روئی پر ڈالی وہ آنکھیں بند کیے مسہری پریٹ چکی تھی۔ میں نے جھک کر اس کی پیشانی پر پیار کیا اور باہر نکل آئی۔ شام ہونے کو آئی تھی اوپر کا حصہ سوائے روئی کے کمرے کے سارا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ نچلے حصے میں بچوں کا شور وغوغا اور بھابیوں کی آوازیں مسلسل آرہی تھیں۔ میں نے صحن کی طرف مڑنے کے بجائے باہر ہی نکل جانا مناسب سمجھا۔

میرا ارادہ تھا کہ شادی سے قبل بھائی جان سے تفصیلی بات کروں۔ روئی اور ان کے رشتے کے بارے میں اس لیے ایک دن انہیں اکیلے دیکھ کر میں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

”آپ روئی کے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں بھائی جان؟“ میں نے دو دو ک بات کرنے کی غٹائی۔
”کیا کر رہا ہوں میں اس کے ساتھ؟“ حد ہے بیگانہ پن کی۔

”آپ اس کی زندگی برباد کر رہے ہیں یا تو آپ اسے شروع میں ہی منع کر دیتے کہ اتنا آگے مت بڑھو اور رگڑ رگڑا۔“ نے شد دے ہی ڈھلی رہے تو اس کا

ہاتھ بھی تھام لیں۔ بن ماں باپ کی بچی کی آپ ہیں مت لیں۔“
”بے بی تم اس معاملے میں مت بولو۔“ انہوں نے جان چھڑائی چاہی۔
”میں نہ بولوں تو کون بولے گا۔ میں اب بچی تو نہیں رہی۔“

”بے بی بہت سی ایسی باتیں ہیں جن سے تم واقف نہیں۔ اس لیے بہتر ہے تم اس قصے کو چھوڑ دو۔“ میرا دل چاہا کوئی چیز اٹھا کر ان کے سر پر دے ماروں۔

”بھائی برسوں گزر گئے۔ غالباً سات یا آٹھ سال اتنے میں تو کسی شخص کے ضبط کی ساری حدیں ہی ختم ہو جائیں۔ اسے اتنا بہت آزما لیں۔ آپ نے اس سے جو مانگا اس نے دیا۔ مگر آپ کو بھلانے کا تصور بھی اس کے لیے غذاب ہے۔ اس کے لیے یہ عمل ممکن نہیں تو کیوں تقاضا کرتے ہیں اس سے۔ قسم سے بھائی جان اگر میرے بس میں ہوتا تو میں آپ جیسے ہزاروں بھائی اس صبر کی پتلی پر قربان کر دیتی۔“

بھائی جان نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ بس چپ چاپ مجھے دیکھتے رہے اور پھر اسی چپ میں میری شادی ہو گئی۔ روئی میری شادی میں آئی تھی مگر بہت تھوڑے وقت کے لیے۔ میں شادی ہو کر اکاڑہ آئی تو پھر اگلے چار سالوں تک میں ایک دو دن سے زیادہ لاہور نہ جاسی۔ روئی کا اس دوران ایک خط ملا تھا۔ جس میں اس نے اپنی ایجوکیشن مکمل ہو جانے کا ذکر کیا تھا اور شاید اب وہ کسی ادارے میں نوکری کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔ ان دنوں فون کا لڑکا اتنا درواری تھا نہیں کہ منٹ منٹ بعد کے حالات کی خبر ہو پائی۔ گھر سے بھی جو ایک آدھ خط آتے تھے ان میں روئی اور بھائی جان کے

قصے کا تذکرہ نہ ہوتا۔ شادی کے بعد اتنے کھاتے کھاتے جاتے ہیں کہ شوہر اور سسرال کے علاوہ باقی باتیں اور کام جانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ میرے ساتھ کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔ میں روئی کی شدت کو بھلا چکی تھی۔ بس اتنا یاد رہ گیا تھا کہ ان دونوں کا آپس میں تعلق رہا ضرور ہے۔

ایسے ہی ایک شام کا قصہ ہے قیصر گھر لوٹے تو ایک خبر ان کے ہاتھ میں تھی۔
”داور بھائی انگلینڈ جا رہے ہیں۔ دو روز بعد تم صبح تیاری کر لینا۔ تمہیں لاہور چھوڑ آؤں گا۔“

مجھے بہت شاک لگا تھا۔ ”تو پھر روئی کا کیا ہوگا۔“
”خدا یا! میں بھی کتنی پاگل ہوں اتنا عرصہ بیت گیا اور اس بے چاری کا حال احوال ہی نہ پوچھا۔ بھانے اب تک محبت نے اس کو کتنی دیکھ لگائی ہوگی۔ میری سوچیں خود تک ہی محدود رہیں۔ اکاڑہ سے لاہور تک کا سفر میں نے انہی سوچوں کے ساتھ طے کیا تھا۔ گھر دیانتی تھا اور گھر کا ماحول بھی۔ اوپر کا حصہ بھائی جان کے تصرف میں تھا۔ وہ اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ پرانا کا کچھ کھاڑ روئی والے کو دیا جا رہا تھا۔ کام کی چیزیں وہ لکڑی کی الماری میں رکھتے جا رہے تھے۔ مجھے کمرے کے دروازے پر کھڑے دیکھا تو منسکرا کر مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

گھٹنوں مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ بچپن کے قصے کالج کے زمانے کی باتیں دوستوں کی شرارتیں روئی کی باتیں اور حاجی کے تذکرے۔ غرض کہ بہت کچھ۔ اپنا سارا سامان الماریوں میں رکھ کر انہوں نے چابی مجھے بکڑادی۔

”میرے بعد یہ سامان تمہارا ہے بے بی۔“
”پر بھائی! مجھے کیا آرٹ کی سمجھ بوجھ ہے۔“
”رکھ لو۔ سمجھ بھی آتی جانی ہے۔ اچھا ایک کام

کرنا۔ وہ بات کرتے کرتے رکے شاید کچھ یاد آ گیا تھا۔ اٹھے اور ساتھ والے کمرے سے ایک بڑا سا کور کیا ہوا کیٹوس اٹھا لائے۔

”جب میں یہاں سے چلا جاؤں تو روٹی کے پاس جانا ہے یہ دے دیتا۔“

”بھائی جان نے کور پھاڑا تو مجھے برسوں پرانی ان کی پہلی پینٹنگ یاد آگئی۔ سبزہ زار پر ہاڑی چٹخڑی بالوں سے ڈھکا چہرہ اور ان میں انکا پھول۔ میں اسے کمر بھلا چکی تھی مگر اب اسے دیکھتے ہی لگا جیسے درمیان میں گیارہ بارہ سال آئے ہی نہ ہوں۔“

”یہ جس کے لیے بنائی تھی اسی تک پہنچا ہوا تھا۔ کام ہے بے با۔“

اور تب میرا دل چاہا میں پھوٹ پھوٹ کر دوں۔ بھائی جان کی آنکھیں بھی شدت ضبط سے سرخ ہو چکی تھیں۔ میرے سامنے حسن کو مات دیتا ہوا ایک کٹرٹیل جوان ضبط کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ میں نے ان کے شانے پر سر رکھ تو پھر روٹی ہی چلی گئی۔ اگلے دن وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ میں جانتی تھی ہاں صرف میں ہی جانتی تھی کہ وہ روٹی کی محبت سے فرار پا کر گئے ہیں۔ مگر کبوں اس بات کا سرا آج تک مجھے نہ مل سکا تھا۔ جاتے جاتے بھائی جان نے ایک پرچہ نکال کر مجھے دینا چاہا تھا مگر پھر واپس جیب میں ڈال لیا تھا۔

جس روز بھائی جان گئے وہی شام میں پینٹنگ لے کر روٹی کے گھر چلی گئی۔

گھر کا نقشہ تھوڑا سا بدل گیا تھا۔ سڑکیوں کے سامنے والی دیوار تو ڈکراس کا ایک دروازہ کی میں نکال دیا گیا تھا اور دوسرا کھن میں۔ لکڑی کے بڑے دروازے کے بجائے لوہے کا مضبوط گیٹ لگا دیا گیا تھا۔ دستک پر دروازہ عبداللہ بھائی تھے

کھولا۔ مجھے سامنے دیکھ کر وہ تھوڑا حیران ہوئے پھر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اماں کو سلام کی غرض سے قدم ان کے کمرے کی طرف بڑھائے تو عبداللہ بھائی نے ان کی وفات کا بتایا۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ اماں جی سے بہت دلی لگاؤ تھا۔ میں کتنی ہی دیر نیچے بیٹھی ان کے بچوں سے باتیں کرتی رہتی۔ پھر دعائے مغفرت کر کے روٹی کا پوچھا کیونکہ اتنی دیر میں نہ وہ مجھے کہیں نظر آئی تھی نہ کسی نے اس کا ذکر کیا تھا۔ ”وہ اوپر ہی ہے کہاں جانا ہے اس چڑیل نے۔“ سبقاً بھائی ہمیشہ کی طرح شروع ہو گئیں۔ میں پینٹنگ اٹھا کر سڑکیوں کی طرف بڑھی مگر ادھر ایک دروازہ لگ چکا تھا۔ جس پر پڑا تالا میرا منہ پڑا رہا تھا۔ ”بہن روٹی کے پاس جانے کے لیے آپ کو گلی والے دروازے سے جانا پڑے گا۔“ بھائی عبداللہ شرمندہ شرمندہ لہجے میں بولے۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور باہر نکل آئی۔ ”آہ میری روٹی تجھ پہ کتنا کھن وقت گزرا ہے۔ تیری ہی ہمت ہے جواب تک برداشت کر رہی ہو۔“ باہر سے سڑکیوں والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں سڑکیاں چڑھ کر اوپر پہنچی۔ برآمدہ صاف ستھرا تھا۔ دیوان ایک کونے میں پڑا تھا۔ تین کمروں کے دروازے بند تھے۔ صرف روٹی والے کمرے کا کھلا ہوا تھا اور وہاں سے پردہ پھڑپھڑا رہا تھا۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے پینٹنگ سنبھالی اور اس کے کمرے کے باہر کھڑی ہو گئی۔ ابھی دستک دینے ہی والی تھی کہ اندر سے اس کی آواز آئی۔

”آ جاؤ بے بی رک کیوں گئیں۔“

مجھے تعجب ہوا کہ میری آمد کی اطلاع اس کو کیسے ہو گئی۔

میں چوبیس پڑا کر اندر داخل ہوئی کمرہ نفاست

سے سجا ہوا تھا۔ ایک کونے میں بے بی کا تپڑا ہوا تھا۔ روٹی ہمیشہ کی طرح میز پر چٹکی کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔

”مجھے بتا تھا تم آؤ گی۔ لاؤ میرا تحفہ کہاں ہے؟“ اس نے میرے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ مجھے اب بھی تعجب ہوا مگر کہا کچھ نہیں۔

”ارے لاؤ دو گی۔“ روٹی من نے پہلی بار کچھ تحفہ بھیجا ہے۔ ”مجھے حیران حیران کھڑا دیکھ کر وہ خود ہی آگے بڑھی اور میرے ہاتھ سے پینٹنگ لے کر احتیاط سے اس کا کورا تارنے لگی۔

”ایک بات بتاؤ روٹی۔ میں ذرا کم عقل ہوں۔ بس اتنا بتا دو میرے آئے اور تحفہ لانے کی خبر تمہیں کیسے ہوئی؟ کیا بھائی جان نے خط لکھا تھا؟“

کورا تار تے اتار تے وہ مصروف سے لہجے میں بولی۔ ”ارے نہیں اپنا مخبر ہے۔“ وہ سب خبریں دیتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی بتا ہے کہ وہ آج چلے گئے۔ بھاگ گئے وہ بہت کم بہت نکلے یار تمہارے بھائی جان مرو ہو کر اتنی بزدلی۔ ان سے اچھا تو سامنے والا ارشد رہا۔ دو سال لگا تار رشتہ بھیجتا رہا۔ آخر میں نے تنگ آ کر کہہ دیا۔ بھی شادی کر لو۔ اگر مجھ سے اتنا ہی پیار ہے تو میری یہ بات مان کر دکھاؤ۔ غریب مان گیا۔ میں خود اس کی ذمہ داری سنبھال گئی تھی۔ پیارہ روتے روتے بولا روٹی جی محبت کا مان رکھ رہا ہوں مگر خدا قسم اس مان کا پہلا تحفہ آپ کو دوں گا۔ مجھے سمجھ تو نہ آئی بس ڈیڑھ سال بعد اگر ایک بچہ تمہارا گیا اس کی پیروی نہ بھی صبر کر لیا۔ اگلے سال دو بچے ایک ساتھ پیدا کر کے پھینکا کوٹ پورا کر لیا۔ اس نے ایک نظر کاٹ میں لینے بچے کو دیکھا۔ ”تب سے اب تک یہ ادھر ہی ہوتا ہے۔ اماں جی بھی گزر گئیں۔ گھر والوں نے مجھے پاگل سمجھ کر ہانا توڑ لیا۔ ایک عبداللہ بھائی ہیں آجیلے ہیں کبھی

کبھی باپائی میں ہوں اور میرے ساتھی۔“

میرے دل میں آئے سوالوں کے جواب وہ خود ہی درتی جا رہی تھی۔ عجیب تھی روٹی بھی۔ نہ میرا حال احوال پوچھا تھا۔ نہ برسوں بعد ملنے پر گلہ شکوہ کیا تھا بلکہ باتیں یوں کر رہی تھی جیسے دن میں بیسیوں بار تو ہمارا ملنا ہو۔ میں نے سر جھکا اور مسہری پر بیٹھ گئی۔ اس نے کورا تار کر محبت سے تہہ کیا اور سیکے کے نیچے رکھ دیا اور پینٹنگ کو دیکھنے لگی۔

”میں نہ کہتی تھی رفتی من اعلیٰ پائے کے فنکار نہیں گئے۔ دیکھو تو ذرا صرف سیاسی ہی استعمال کی جناب نے مگر غضب کا شکار بنا ڈالا۔ دیکھو تو بے بی جیلے کو کٹنے نے کیا منظر قیہ کر ڈالا۔“

وہ خوشی سے چٹکی جا رہی تھی۔ محبت سے اس پر ہاتھ پھیرتی جا رہی تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا۔

”روٹی! یہ بھائی جان نے اس وقت بنائی تھی جب تم نے ان کو دوسرا خط لکھا تھا۔ انہوں نے تمہیں پکھا ہوا کوئینس تھا مگر ایک خیال دلی میں بس گیا تھا۔ اسی خیال کی بنیاد پر انہوں نے یہ بنائی تھی۔ تمہارے لیے۔“

روٹی خوشی سے بچنے لگی۔ یوں کہ جیسے پینٹنگ نہیں بھائی جان خود ادھر آ گئے ہوں۔

”دیکھو تو بامہ میرے محترم نے مجھے آج کیا تحفہ بھیجا ہے۔ تم بھی تحفہ لائے ہو مگر دیکھو اس جیسا تم کب لائے ہو۔ تم سمندر کی تہہ سے موتی نکال کر لادیتے ہو مگر بتاؤ اتنے سالوں میں تم نے مجھے اپنے ہاتھ کا بنا ہوا کیا تحفہ دیا اب تو میری امید پھر روشن ہو گئی۔ مجھے زندگی مل گئی۔ اب میں برسوں مزید ان کا انتظار کروں گی۔ دیکھنا دلوٹ کر آئیں گے اور جب آئیں گے تو تب صرف میرے ہوں گے۔“

وہ جھپٹی رہی نا جھپٹی رہی پھر روتے روتے زمین پر بیٹھ گئی۔ میں نے ہمدردی سے اس کے کندھے پر

بھائی (بھائی جان کی بیوی) کا فون نہ آتا۔

فون کیا تھا کہ صور اسرافیل تھا۔ جو کہ فونوں میں پھونک دیا گیا تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ بھائی نے آگے کیا کہا بس میری چیخوں سے پورا گھر گونجنے لگا تھا۔ قیصر بھاگے آئے۔

”خیر تو ہے؟“ وہ مجھے سنبھالنے لگے۔

مگر میری چیخیں نہ رکیں۔ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ قیصر نے پیچھے گرا ہوا فون اٹھایا۔ غبرین بھائی نے انہیں بھی وہ خبر سنا دی۔

قیصر کے بھی پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ اپنا غم بھولی کر مجھے سنبھالنے لگے۔

”بے بی صبر کرو۔ خدا کی چیز تھی اس نے واپس لے لی۔ ہر جاندار کو موت کا جام پینا ہے۔ بھائی جان اس سے مراد تو نہیں تھے۔“

مگر صبر کہاں پر داشت کہاں۔ روتے دھوتے ڈیپس پہنچے تو بھائی جان کا کفن میں لیٹا وجود دیکھ کر ہوش و حواس جاتے رہے۔

پینتالیس سال بھی بھلا کوئی مرنے کی عمر ہوتی ہے۔ میرا دیوتاؤں جیسا بھائی جو ساری عمر محبت ہونے نہ ہونے کے وہم میں گرفتار رہا۔ جس کی شہد رنگ آنکھیں گلابی لٹاٹے کو کچھ کر چمک اٹھتی تھیں۔ جس کی لمبی انگلیاں جب رنگوں کو کیڑوں پر بکھیرتی تھیں تو کائنات کا حسن اس میں سمٹ آتا۔ جس کے فن پر روٹی جیسی قانع لڑکی ندا ہوئی تھی۔ کیسے آج بے بس پڑا سو رہا تھا۔

بیاری بھی تو کوئی نہ تھی۔ بس آدھی رات کو سینے میں درد اٹھا اور منٹوں سیکنڈوں میں وہ چل بسے۔

جنازے سے آدھا گھنٹہ قبل جب ان کو غسل دے کر میت کمرے میں رکھی گئی تو وہ آئی تھی۔

سیاہ چادر میں لپیٹ کر امید کے سہارے آج تک

زندہ روٹی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ قدم ہنکے ہنکے جا رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں موتیے کی کلیاں تھیں۔ یہ موتیے کا موسم تو نہ تھا مگر مجھے قطعاً حیرت نہ ہوئی کیونکہ میں جانتی تھی کہ یہ کہاں سے آئی ہوں گی۔ چادر کے ایک کونے سے اس کا آدھا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ آنکھیں جھرجھری رہے جارہی تھیں۔ میں اس کے قریب گئی کہ گلے لگ کر روں مگر وہ سب سے یکسر بے نیاز تھی۔ وہ میت والے کمرے میں گئی میں نے غزالہ (بی بی) کو کہا کہ یہ کمرہ کچھ دیر کے لیے خالی کروں۔ انہوں نے عورتوں کو باہر نکال دیا اور روٹی کی طرف دیکھ کر سوالیہ نگاہ میری جانب اٹھائی۔ میں اب بھلا کیا جواب دیتی۔ وہ بھی خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

روٹی میت کے پاس پہنچی۔ چہرے سے چادر ہٹائی اور کلیاں میت پر ڈال دیں اور سر ہانے بیٹھ کر بڑی محویت سے بھائی جان کا بے جان چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر شاید اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔

”مجھے کچھ دیر تنہا چھوڑ دو۔“

ہوا کا ایک تیز جھونکا یکدم باہر نکلا۔ میں بھی باہر نکل آئی۔ باہر چہ گونیاں تھیں۔ سرگوشیاں تھیں سوالی تھے۔ تجسس تھا کہ اندر کالی چادر والی کون ہے؟ مگر میں کیا کہتی کہ وہ کون ہے؟ اس کمرے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے میں گزرتے میں چالیس سالوں پر غور کرتی رہی۔

”کیا وقت اتنی جلدی گزر جاتا ہے ابھی کل بچپن تھا اور آج موت۔“

تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور روٹی باہر نکل آئی۔ وہ رکی نہیں تھی۔ گھر کا گیٹ عبور کر گئی تھی۔

سب سے پہلے کمرے میں داخل ہونے والی میں تھی اور میں بھلا پھر داخل ہونے کی ایک سبب بھی تھی۔ کسی

اور نے نوٹ کیا ہو یا نہیں لیکن میں نے کیا تھا بھائی جان کی شہد رنگ آنکھیں اودھ کھلی تھیں۔ داغ کیا کرتے تھے کہ ادھ کھلی آنکھوں والی میت کو کسی بہت اپنے کا انتظار ہوتا ہے۔ میں نے خاندان کے ہر بندے کی آمد پر بھائی جان کو دیکھا تھا ان کی آنکھیں ہنوز کھلی تھیں۔ ہاں مگر اب جب میں کمرے میں گئی تھی تو ان کی آنکھیں بند تھیں یوں کہ جیسے اب وہ مطمئن ہوں۔ میرا دل بھرا آیا تھا۔ لبوں سے سسکی نکل گئی پھر اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ کب آخری دیدار ہوا کب جنازہ اٹھا کب مہمان گئے۔

میں ہر چیز سے بے گانی ہو گئی تھی۔ سوئم کے بعد غبرین بھائی نے ایک کمرے کی چابی مجھے دی اور کہا کہ اس میں جو کچھ ہے تم لے جاؤ۔ تمہارے بھائی اکثر مجھے کہا کرتے تھے کہ میرے مرنے کے بعد یہ سامان بے بی کو دے دینا۔

میں نے کمرہ کھلوایا۔ لاتعداد بیٹننگز اور آرٹ کا سامان ترتیب سے بڑا پڑا تھا۔ لکڑی کی ایک بڑی پرانی الماری بھی تھی۔ میں نے پہلی فرصت میں وہ سامان اٹھوا کر اپنے گھر پہنچوا یا۔

چہلم کے بعد جب مجھے فرصت ملی میں نے اس سامان کی تلاشی لی اور مجھے جس چیز کی ضرورت تھی وہ بھی جلد ہی مل گئی۔ 12x9 کا وہ زرد کاغذ کا ٹکڑا جو بھائی جان نے انگینڈ جانے سے قبل مجھے دینا چاہا تھا مگر نہ دیا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ نقاشت سے تہہ کیسے اس بوسیدہ کاغذ کو کھولا۔

4/4/1967

اپنی جان سے بھی عزیز تر روٹی!

میرے پاس تمہیں کہنے کو اتنا کچھ ہے تو نہیں مگر پھر بھی ایک اودھائی خط تمہیں لکھ رہا ہوں۔ تم میرے طرزِ سخنِ طبع سے حیران ہوئی ہوگی مگر لکھتی ہوں تو تم مجھے۔

18/9/1982

وقت بہت کم ہے شرمندہ اس قدر ہوں کہ معذرت جیسے الفاظ لکھ ہی نہیں سکتا۔ مجھے آج بھی اعتراف ہے روٹی کہ میں بہت کم بہت تھا۔ برسوں بتا دیئے مگر تمہیں اپنانے کے لیے میں کوشش نہ کر سکا۔

آگے ناقابل فہم الفاظ تھے جیسے زبردستی لکھا جا رہا ہو۔ مگر کچھ نہ جا رہے ہوں میں نے حیرت سے ایک دفعہ پھر تاریخ اور وقت دیکھا۔ یہ وہی تاریخ تھی جب بھائی جان کا انتقال ہوا تھا۔ یہ تحریر ان کی وفات سے چندہ صنف پہلے کی تھی۔ میرے حواس جیسے معطل ہو گئے تھے۔

2013

ہر چیز سے زیادہ عزیز ہو۔ میں نے لاکھ جا پا کہ جان کی شہد رنگ آنکھیں اودھ کھلی تھیں۔ داغ کیا کرتے تھے کہ ادھ کھلی آنکھوں والی میت کو کسی بہت اپنے کا انتظار ہوتا ہے۔ میں نے خاندان کے ہر بندے کی آمد پر بھائی جان کو دیکھا تھا ان کی آنکھیں ہنوز کھلی تھیں۔ ہاں مگر اب جب میں کمرے میں گئی تھی تو ان کی آنکھیں بند تھیں یوں کہ جیسے اب وہ مطمئن ہوں۔ میرا دل بھرا آیا تھا۔ لبوں سے سسکی نکل گئی پھر اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا کہ کب آخری دیدار ہوا کب جنازہ اٹھا کب مہمان گئے۔

میں ہر چیز سے بے گانی ہو گئی تھی۔ سوئم کے بعد غبرین بھائی نے ایک کمرے کی چابی مجھے دی اور کہا کہ اس میں جو کچھ ہے تم لے جاؤ۔ تمہارے بھائی اکثر مجھے کہا کرتے تھے کہ میرے مرنے کے بعد یہ سامان بے بی کو دے دینا۔

میں نے کمرہ کھلوایا۔ لاتعداد بیٹننگز اور آرٹ کا سامان ترتیب سے بڑا پڑا تھا۔ لکڑی کی ایک بڑی پرانی الماری بھی تھی۔ میں نے پہلی فرصت میں وہ سامان اٹھوا کر اپنے گھر پہنچوا یا۔

چہلم کے بعد جب مجھے فرصت ملی میں نے اس سامان کی تلاشی لی اور مجھے جس چیز کی ضرورت تھی وہ بھی جلد ہی مل گئی۔ 12x9 کا وہ زرد کاغذ کا ٹکڑا جو بھائی جان نے انگینڈ جانے سے قبل مجھے دینا چاہا تھا مگر نہ دیا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ نقاشت سے تہہ کیسے اس بوسیدہ کاغذ کو کھولا۔

4/4/1967

اپنی جان سے بھی عزیز تر روٹی!

میرے پاس تمہیں کہنے کو اتنا کچھ ہے تو نہیں مگر پھر بھی ایک اودھائی خط تمہیں لکھ رہا ہوں۔ تم میرے طرزِ سخنِ طبع سے حیران ہوئی ہوگی مگر لکھتی ہوں تو تم مجھے۔

18/9/1982

وقت بہت کم ہے شرمندہ اس قدر ہوں کہ معذرت جیسے الفاظ لکھ ہی نہیں سکتا۔ مجھے آج بھی اعتراف ہے روٹی کہ میں بہت کم بہت تھا۔ برسوں بتا دیئے مگر تمہیں اپنانے کے لیے میں کوشش نہ کر سکا۔

آگے ناقابل فہم الفاظ تھے جیسے زبردستی لکھا جا رہا ہو۔ مگر کچھ نہ جا رہے ہوں میں نے حیرت سے ایک دفعہ پھر تاریخ اور وقت دیکھا۔ یہ وہی تاریخ تھی جب بھائی جان کا انتقال ہوا تھا۔ یہ تحریر ان کی وفات سے چندہ صنف پہلے کی تھی۔ میرے حواس جیسے معطل ہو گئے تھے۔

2013

www.pdfbooksfree.pk

ہو گئے تھے۔ مجھے سمجھ نہ آئی کہ کیا کروں۔ بس خط کو متاع جان سمجھ کر دل سے لگا لیا۔ کئی دن اسی طرح گزار دیئے۔ ایک دن دل بڑا بے تاب سا تھا۔ نہ کام کو ہاتھ لگایا نہ کھانے کو پی چاہا نہ کمرے میں بیٹھی رہی۔ اتنے میں میرا چھوٹا بیٹا اندر آیا۔

”ماما ہر کوئی اٹکل آئے ہیں آپ کو یار ہے ہیں۔“

یا خدا خیر کیا اب بھی کوئی خبر سننے کو بانی ہے۔ میں نے سیل پیر پاؤں میں اڑانے اور باہر دروازے تک آئی۔ ایک لڑکا چادر سے اپنا وجود چھپائے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھا تو سیدھا ہو گیا۔

”روبی جی نے بلاوا بھیجا ہے۔“ اس نے مختصر سا پیغام دیا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا یہ جاوہ جا۔

میں اندر گئی چادر اوڑھ لی اور قیصر سے کہا کہ مجھے چورجی میں روبی کے گھر چھوڑ آئیں۔

ایک گھنٹے بعد جب میں اس کے گھر کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی دل تھا کہ دھک دھک کیے جا رہا تھا۔ پہنائی جان کا 15 سال قبل لکھا آخری خط میری بیٹی کی منگنی میں اب تک دبا ہوا تھا۔ آخری سیڑھی پر وہی لڑکا چادر اوڑھے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اندر چلا گیا۔

میں مرے مرے قدموں سے پردہ ہٹا کر اندر پہنچی روبی جیسے میری بیٹی نظر تھی۔

”آؤ بیٹی خدا قسم میں نے تمہاری آمد کی بہت دعائیں مانگی ہیں۔“

میں جا کر اس کے سر ہانے بیٹھ گئی۔ اور اس کے خزاں رسیدہ ہاتھ میں زرد بوسیدہ کاغذ تھما دیا۔ میری اس حرکت پر اس کے پاؤں کی طرف پٹی پر پڑے ایک وجود نے گروٹ لی اور ایک سسکاری کی کمرے میں گونج گئی۔ میں اس کو پہچان گئی تھی۔

روبی نے خط کھولا اور اس پر لکھی دونوں تحریریں پڑھنے کے بعد مسکرائی۔

بس ایک معافی ہماری توبہ بھی جو ہم اب سائیں تم کو لو ہاتھ جوڑے لوکان بکڑے اب اور کیسے مناکیں تم کو تمہارے آتی ہیں اس گھر سے ہمیں رقابت ہی ہو گئی ہے میں یہ شرکت بھی کیسے سہ لوں کہ چھوٹی ہیں ہوائیں تم کو تم آئینہ ہو او سنگ باری یہاں کے لوگوں کا مشغلہ ہے ہر ایک ہنسرے وصال بن کر بھلا کہاں تک چائیں تم کو کیا تم اب تک ہماری نظروں کے سبب قاضوں سے بے خبر ہو ہمیں محبت ہے تم سے محسن اب اور کیسے بتائیں تم کو بتائیں تم کو چھڑتے لمے لیوں کی لڑش کا کیا سبب تھا سنا تھا وقت قبولیت ہے سو رہے رہے تھے وہاں تک تم کو وہ ہچکچاہٹ کے درمیان غزل پڑھتی جا رہی تھی کمرے کا ہر نفس زار زار رہ رہا تھا۔

”روبی! باتیں کرو میری جان۔ شاعری چھوڑو۔“

وہ روئے روئے ہنس پڑی۔

”بس یہی ہمت تھی تمہاری ارے اس پاگل کو دیکھا ہے جو پاؤں کی طرف بڑا رہا ہے پچھلے میں برسوں سے اپنے رقیب کے نصے سن رہا ہے مجھ سے۔ اک اک لفظ ازبر ہو گا اس کو میرا اور ایک تم ہو تمہارے بھائی کے لیے غزل پڑھی اور تم اکٹا گئیں۔“

میں اپنی جگہ پر جو رہ گئی۔

”روبی! میں بہت عجیب حالات سے گزر رہی ہوں۔ یہاں جان کی موت کا صدمہ ابھی تک مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ یقین ہی نہیں آتا کہ وہ یوں بھی چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔“

”مجھ سے زیادہ تو دکھی نہیں ہو گی تم میں تو اس آس دامید پر زندہ تھی کہ اپنے مرنے سے قبل ان کی محبت کا آخر ان لوگوں کی مگر میری امید تپ رہی ہے اور وہ چل بسے اور جو اقرار پڑھنے کو لیا بھی تو ان کی موت کے بعد۔ یا خدا میرا دل غم سے پھٹ کیوں نہیں جاتا کہ یہ عذاب کم ہو۔“

پاکتی کی طرف پڑے وجوہ نے ایک لمبی سسکاری بھری اور زار زار رونے لگا۔

میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ ”کیا غیر انسانی مخلوق بھی احساسات کا شعور رکھتی ہے؟“

روبی نے خط کو آنکھوں سے لگایا اور دھیرے دھیرے بولنے لگی۔

”بے بی! میں نے اب تک شادی نہیں کی نہ سامنے والے ارشد سے نہ اس پاکتی کی طرف بیٹھے پاگل سے۔ کئی رشتے آئے مگر مجھے محترم داور کی ہاں کا ہی انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا وہ کبھی لوٹ کر میرے پاس ہی آئیں گے۔ نہیں پتا ہے انگلیٹھ سے واپسی پر وہ میرے پاس آئے تھے۔ مگر بنا کچھ کہے لوٹ گئے تھے۔ اس کے بعد میں نے ان کو خط لکھنا چھوڑ دیا۔“

تھا کیونکہ مجھے علم ہو گیا تھا کہ اب وہ شادی شدہ ہیں۔ یہ سب نصیب کے کھیل ہوتے ہیں بے بی! آپ جس چیز کی طرف جتنا ہٹاؤ گے وہ آپ سے اتنا ہی دور جائے گی۔ اور جس چیز سے جان چھڑاؤ گے وہ آپ کے پیچھے لپکے گی۔ کاش کہ برسوں قبل میں نے محترم داور سے جان چھڑالی ہوتی تو شاید وہ میرے پیچھے دوڑے چلے آتے۔

مجھے علم تھا کہ وہ مجھی سے پیار کرتے ہیں۔ یہ خط اس کا گواہ ہے۔ اور ان کی محبت سب سے بڑی گواہ ہے۔ تمہیں پتا ہے بے بی! انہیں مرکز بھی میرا انتظار تھا۔ ان کی آنکھوں میں روشنی کی رقی باقی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے آنکھیں سوند لیں۔ نہ جانے یہ سچ ہے یا وہم! مجھے ان کی آنکھوں میں کئی کا احساس ہوا تھا۔

وہ محبت کی زنجیر سے ڈرتے تھے مگر محبت کے بری طرح اسیر تھے۔ خطوط میں اس کے انکاری تھے مگر ہاتھوں سے اپنی ہر پینٹنگ میں محبت ہی کے رنگ

جھرتے تھے۔

بتا ہے!

مجھے اکثر وہ کہتا تھا

محبت کچھ نہیں ہوتی

ہجر کا خواب مطلب

وصل کے خواب بے معنی

نگاہوں میں کوئی صورت

کہاں دن رات رہتی ہے

اسے کیوں خامشی کیسے

کہ جس میں بات رہتی ہے

وہ آنکھیں کیسی ہوتی ہیں

جہاں ہر سات رہتی ہے

یہ آنسو بے زباں آنسو

بھلا کیا بول سکتے ہیں

اور ان کی نرم پلکوں پہ

نئی دن رات رہتی ہے۔

مجھے اکثر وہ کہتا تھا

محبت کچھ نہیں ہوتی

مگر جب آج برسوں بعد

میں نے اس کو دیکھا ہے

کہ اس کی جھیل آنکھوں میں

ہجر کا خوف رہتا ہے

وصل کے خواب رہتے ہیں

وہاں ہر سات رہتی ہے

یوں لگتا ہے کہ برسوں سے

وہ سو یا بھی نہیں شاید

اور اس کی نرم پلکوں کے

حسیں گونشے بھی گیلے ہیں

اور اس کی خامشی ایسی

کہ جس میں بات رہتی ہے

مجھے وہ اب نہیں کہتا
”محبت کچھ نہیں ہوتی“

تو مجھے چھوڑ کر جا بھی چکے ہیں۔

میں نے محبت کا عذاب بھگتا ہے۔ تنہائی کے
بستر پر راتیں بتائی ہیں بہت نیندیں برباد کر لیں
میں نے اب میں سوؤں گی تم سب جاؤ۔ میں اب
آرام کروں گی۔“

”آہ ابے بی! صدافسوس اب وہ یہ سب کہنے کے
قابل رہے بھی نہیں۔ میں ضبط کی آخری حدود تک
ان کا انتظار کیا تھا مگر اب اور نہیں.....“

اس نے بے درستی کہنا اور کھڑکی کی طرف کر دٹ
لے کر لیٹ گئی۔ کونے میں کھڑا کاروتا رہتا ہر بھاگ
گیا۔ پانچویں پر بیٹھے وجود نے اٹھ کر اس پر لمبل ڈالا اور
دیں ایک کونے میں منہ گھٹنے میں دے کر بیٹھ گیا۔

پتا ہے بی بی میری خواہش تھی کہ ہزاری شادی
ہوئی اور شادی کے بعد میں سب سے پہلے ان شہد
رنگ آنکھوں کو چوم کر دیکھتی کہ ان میں کتنی مٹھاس
ہے۔ میں ان کرچی آنکھوں کی لذت کو محسوس کرنا
چاہتی تھی۔ ان کی اجازت سے ان کی رضامندی سے
مٹرو کھو تو آرزو پوری ہوئی بھی تو کب جب وہ اندر
نہیں سو گئے۔ تب کہ نہ میرے لیوں کی حدت کو محسوس
کر سکے نہ میری خوشبو سے اپنے سرو جذبات کو
گرماسکے۔

میں نے کمرے سے نکلتے نکلتے ایک آخری نظر
مسمیٰ پر لیشی شکستہ حال روٹی پر ڈالی۔ اس کا وجود جھٹکے
کھار ہاتھا۔ کمرہ شام کے اداس ملگئے اندھیرے سے
دھندلا سا گیا تھا۔ مسمیٰ کے سر ہانے بھائی جان کی
پینٹنگ کی ساری ٹوڑا اندھیرے میں مدغم ہوئی جارہی
تھیں۔ میں نے آنکھوں سے آنسو پونچھے اور واپس
چل دی۔ سیڑھیاں اترتے وقت یہ کس کو معلوم تھا کہ
کل کا سورج اک دیوانی کو محبت کی قید سے آزاد
کر دے گا۔“

وہ رکی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ آنسوؤں کا
گرم سیال بہہ بہہ کر اس کے کانوں میں جا رہا تھا۔
چادر میں لپٹا لٹکا کونے میں کھڑا بھل بھل روئے
جا رہا تھا۔ پانچویں پر بیٹھا وجود سسکیاں بھر رہا تھا۔ خود
میری اپنی حالت غیر تھی۔ یوں لگتا تھا کہ دنیا میں فقط
ہم چاروں کے علاوہ اور کوئی نہ ہو۔ یہ کمرہ ہی کل
کائنات ہو میرے ذہن سے ہر بات نکل گئی تھی
صرف یاد تھا تو یہ کہ روٹی کی داستان کن رہی ہوں۔ اس
کا لہجہ ایسا تھا کہ لفظ دل کو چیرتے ہوئے جاتے تھے۔
”بہت آزمایا ہے مجھے محترم دار نے۔ میں روز
محشر ان کا گریبان تو نہیں پکڑ سکتی کہ اس پاگل دل
میں ان کا احترام بھی بہت ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ سے ان
کی شکایت ضرور کروں گی۔ دیکھ لیانا بی بی میں بہت
ماراخص ہوں ان سے۔ بہت خفا ہو کر جارہی ہوں
میں۔ ساری عمر میں اس ڈر سے خفا نہیں ہوئی کہ وہ
مجھے چھوڑ نہ دیں مگر اب خفا ہو کر جارہی ہوں کیونکہ وہ

شہر آزار کو کھلتی ہوئی کھڑکی کی تھکن
میری آنکھوں کو ہنگولی ہوئی آوارہ ہوا
دوش دیوار پہ بے زار گھڑی کی ٹپ ٹپ
میرے انجام پر دو تاروا سانسوں کا ستار
ٹوٹی اندازی میں بکھرے ہوئے آوارہ نقوش
رخص کرتی ہوئی تنہائی کے پیاسے سائے
میں اکیلے ہوں.....!
مگر پھر بھی!!!!
میں اکیلے تو نہیں.....!!